فرار

پرویز بلگرامی

مجھے کچھ کہنا ہے

یہ طویل کہانی جو "فرار" کے عنوان سے آپ کے ہاتھوں میں ہے اسے علی میاں پبلیکیشنز سے شائع شدہ میرے ناول "غازی" کا تسلسل کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ غازی میں بھی میں نے حب الوطنی کو مرکزی خیال بنایا تھا اور اس کہانی کا بھی مرکزی خیال وہی ہے۔ اس لیے کہ حب الوطنی گویا ہم سے روٹھتی جا رہی ہے۔ ہم اپنے اجداد کی قربانیوں کو بھولتے جا رہے ہیں۔ بے وطنی کا درد کیا ہوتا ہے اسے ہی محسوس کرانے کی میں نے کوشش کی ہے۔

جب یہ قسط وار چھپی تو قارئین نے خطوط کا انبار لگا دیا تھا۔ اسی کی وجہ سے میں نے غفار صاحب (علی میاں پبلیکیشنز) کو مہمیز کیا کہ وہ اسے بھی قارئین کی عدالت میں پیش کریں کہ یہ آج کی آواز ہے۔ اسی محرک کی ہمیں ضرورت ہے۔ یوں بھی میرا قلم احساس سے متاثر رہا ہے۔ کیوں کہ میں نے اس بات کو گرہ میں باندھ رکھا ہے کہ کوئی تخلیق قارئین کو تبھی متوجہ کرتی ہے جب اس میں شدت احساس ہو۔ دل کو چھو لینے والا جذبہ ہو۔ قاری تخلیق کو اپنی آواز سمجھے۔ جو وہ چاہتا ہے وہی اسے صفحات پر نظر آئیں۔ مرکزی کردار کی جگہ وہ خود کو محسوس کرے۔ تحریر میں اسے بیان کی خوبصورتی بھی نظر آئے۔ اعلیٰ مقصد بھی ہو۔ معاشرے کی عکاسی بھی ہو۔

خواجہ احمد عباس کی "اجنتا"۔ کرشن چندر کی "پشاور ایکسپریس" اور "طوائف کا خط" میرے لیے رہنما رہی ہیں۔ اسی خیال کے تحت میں لکھتا رہا ہوں۔ سچی کہانیاں۔ دوشیزہ۔ آئیڈیل۔ نئے افق۔ نیا رخ۔ مسرت۔ سیکرٹ کرائم۔ جاسوسی۔ سسپنس یعنی کے جتنے بھی ڈائجسٹوں میں لکھتا رہا ہوں سب میں یہی کوشش رہی ہے کہ میں با مقصد تحریر پیش کروں۔ عوامی جذبات سامنے لاؤں۔ فرار میں بھی یہی کوشش کی ہے۔ 1971ء میں ہمارے وطن کا ایک حصہ بھارتی سازش کا شکار ہو گیا تھا۔ ہم سے الگ کر دیا گیا تھا۔ یہ سانحہ ایسا نہیں کہ ہم اسے بھول جائیں۔ اسی لیے میں نے اس سانحہ کو پسِ منظر بنا کر اس درد کو قرطاس پر بکھیرا ہے۔ یہ ناول ان حضرات کو ضرور پڑھنا چاہیے جو اپنی خامیوں کو نظر انداز کر کے وطن عزیز کو کوستے دیتے نظر آتے ہیں۔ خود وطن کے لیے کچھ کرنے پر تیار نہیں مگر حاصل کرنے کے لیے پوری طرح تیار نظر آتے ہیں اور دیمک کی طرح بنیاد کو بھی چاٹنے کے درپے رہتے ہیں۔

آخر میں ایک التماس ہے کہ اپنی رائے ضرور دیں۔

پرویز بلگرامی

زندگی کی امید نے دم توڑ دیا تھا اور میں نے دراجل پر دستک دے دی تھی۔ مگر جب تک زندگی ہے اسے کون چھین سکتا ہے، اسی لیے تو مجھے احساس ہوا تھا کہ میں نے موت کو پھر ایک بار شکست دے دی ہے۔ کہتے ہیں موت سے کس کو رستگاری ہے۔ مگر میں تو اسے بار بار دھتکار رہا تھا، اس بار بھی یہی ہوا تھا۔ ابھی زندہ ہوں واس کا ادراک ہوتے ہی میں نے آنکھیں پٹپٹائیں، پھر پوری طرح کھول دیں۔ آنکھیں کھولتے ہی میری نظر چھت پر پڑی۔ سیمنٹ و کنکریٹ کی چھت، چھت سے لٹکا ہوا گھر گھر کرتا گھومتا ہوا پنکھا جس کی تیز گردش مجھے پھر سے سو جانے کی ترغیب دے رہی تھی مگر مجھے اپنی حیرت رفع کرنا تھی کیوں کہ یہ جگہ میرے لیے بالکل نئی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے جہاں پناہ لی تھی یہ وہ جگہ نہیں تھی۔ اُس گھر کی تو چھت بھی پکی نہ تھی، ٹین کی چھت تھی۔ وہ بالکل ویسی عمارت تھی جیسی اس علاقہ میں عام تھی۔ دیودار کی لکڑیوں کا ڈھانچا جس کے گرد ٹین کی چادر منڈھ کر گھر کی شکل دی جاتی ہے۔ جبکہ یہ عمارت پختہ تھی اور پختہ عمارت، امارت کی نشانی ہے، یقیناً یہ لوگ پیسے والے ہیں۔ مگر کون ہیں؟ یہ اندازہ لگانے کے لیے میں نے نظروں کا زاویہ بدلا، سامنے دیوار تھی، داہنی جانب والی دیوار، اس دیوار پر نظر پڑتے ہی میں بُری طرح چونک گیا۔ دیوار پر کسی دیوی کی تصویر آویزاں تھی، بہت سے ہاتھوں والی دیوی کی۔ شاید دُرگا کی تصویر تھی۔ ''تو یہ گھر کسی ہندو کا ہے۔'' میرے ذہن میں الفاظ گونجے۔ ''یہ تو اور خطرناک بات ہے۔'' خود کلامی کے انداز میں میرے لبوں سے سرگوشی آزاد ہوئی۔

''ماں...... ماں! آؤ...... جلدی آؤ۔'' میرے بائیں جانب سے نسوانی آواز آئی۔

آواز میں جوش تھا، ولولہ تھا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ میں حالات کا تجزیہ کرنا چاہتا تھا۔ آنکھیں بند کر کے سماعت کی سیڑھیوں سے دماغ کی رہبری میں نئی منزل کا تعین کرنا چاہتا تھا۔ آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنا چاہتا تھا۔ نسوانی آواز نے یہی سمجھایا تھا کہ یہ ایک بھراپُرا گھر ہے۔ ایسے گھر میں مجھے کیوں لایا گیا، انہوں نے مجھے کیوں پناہ دی؟ آیا یہ میرے دوست ہیں یا دشمن؟ میں یہی سمجھنا چاہتا تھا۔ اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ اسی لیے آنکھیں بند کر کے اندازے کی بساط بچھا رہا تھا۔

تبھی ایک نسبتاً بھاری نسوانی آواز آئی۔ ''کیا بات ہے بیٹی! کیوں پکار رہی تھیں؟''

''انہوں نے......انہوں نے ابھی آنکھیں کھولی تھیں۔ کچھ کہا بھی تھا۔'' وہی پہلی آواز تھی مگر آواز میں چہکار تھی، خوشی کی مہکار تھی، لہجہ سرشار تھا جیسے اسے زندگی کی نوید مل گئی ہو۔ کوئی بہت بڑی خوشی مل گئی ہو۔ ایسا تبھی ہوتا ہے جب کوئی بہت اپنا کسی خطرے سے ابھر آئے۔ مگر میں تو اس کا اپنا نہیں تھا اور نہ اس کو جانتا تھا۔ پھر وہ اس طرح چہک کیوں رہی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ میں مزید الجھ گیا تھا۔

''ٹھہر میں تیرے باپو کو بلاتی ہوں۔'' کہہ کر بولنے والی آتے آتے شاید مڑ گئی تھی۔ اب اس کے قدموں کی آہٹ دور جا رہی تھی۔ تبھی مجھے اپنی پیشانی پر نرم ہتھیلی کے مس ہونے کا احساس ہوا اور میرے ہر مسامِ جاں میں گدگداہٹ سی محسوس ہوئی۔ بجلی سی سرسرائی۔ تیز لہر سی دوڑ گئی۔ زندگی کی ساری رعنائیاں ایک نکتے پر سمٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

ایک سال پہلے تک میں جوانی کی گلیوں میں بے خبر بھٹک رہا تھا۔ زندگی کے نقطۂ عروج سے بھی لاعلم تھا مگر اس سرزمین پر قدم رکھنے کے صرف ڈیڑھ ماہ قبل میری شادی ہوئی تھی اور میں نے جان لیا تھا کہ مجسمہ شباب ہی دنیا کا سب سے بڑا طلسم ہے اور اس طلسم کی سحر خیزی بھی دیکھ چکا تھا۔ جسم سے پھوٹتی مہکار میری مسامِ جاں کو معطر کر چکی تھی، لبوں کی حلاوت کا مزہ چکھ چکا تھا۔ جان لیا تھا کہ اس چار دن کی زندگی کا حاصل یہی لطف ہے۔ اسی لیے میرا جسم لحہ بھر میں دہکتی ہوئی بھٹی بن گیا تھا۔

میں مرد تھا اور ہر مرد کا جسم متقاضی بھی ہوتا ہے۔ سوالی اور سودائی بھی ہوتا ہے۔ صنفِ مخالف کی قربت اسے پاگل کر دیتی ہے۔ میں بھی خود کو روکنے کی بھرپور کوشش کرنے لگا۔ جذبات کے بہتے دریا پر بند باندھنے لگا۔ میرا جسم اندر ہی اندر گیلی لکڑی کی طرح سلگنے لگا۔ اس

آگ کو بجھانے کی بس ایک ہی ترکیب تھی۔

حسن!

شباب!

ابھی یہ کشمکش جاری تھی کہ کئی قدموں کی آہٹ ابھری اور میں فوراً سنبھل گیا۔ مجھے ہر فکر سے اوپر ایک ہی فکر لگی۔ اپنی جان کی فکر، اسی لیے میں نے ذہن کو ہر جانب سے ہٹا کر ایک نکتے پر مرکوز کر دیا۔ تمام قوتِ سماعت کو ایک نکتے پر جمع کر دیا۔ قدموں کی چاپ نزدیک آتی جا رہی تھی پھر شاید وہ لوگ آ کر میرے بستر کے نزدیک کھڑے ہو گئے تھے۔ میں احساس کی بینائی سے دیکھ رہا تھا کہ وہ سب میرے بستر کے گرد کھڑے تھے۔ سب کی نظریں مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ پھر مجھے اپنے گریبان میں کوئی ٹھنڈی سی چیز رینگتی ہوئی محسوس ہوئی جو سینے پر پہنچ کر رک گئی اور میں نے محسوس کر لیا کہ وہ اسٹیتھ اسکوپ ہے۔ وہ کئی جگہ مس ہوئی پھر باہر آ گئی اور ایک نئی آواز سنائی دی۔ ''سب کچھ درست ہے، چنتا کی کوئی بات نہیں ہے، جلد ہی ہوش آ جائے گا۔''

''کب......کتنی دیر میں؟ کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟'' پہلے والی آواز سنائی دی جس میں تفکر کا عنصر کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس آواز میں کشش تھی۔ غضب کا لوچ تھا۔ روح کو مخمور کر دینے والا زیر و بم تھا۔ خوب خوب شیرینی تھی۔ اگر وہ گیت گاتی ہو گی تو سننے والے مدہوش ہو جاتے ہوں گے۔

''ریکھا جی چنتا نہ کریں، بھگوان پر آستھا رکھیں۔ سب کشل ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ بس کچھ دیر کی بات ہے۔ ایک دو گھنٹے میں ہوش آ جائے گا۔'' وہی کھردری مردانہ آواز سنائی دی جو شاید ڈاکٹر کی تھی۔

اب مجھے اس شیریں زباں کا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔ ریکھا، اس نام میں بھی نغمگی تھی۔ اب میں اس کی شکل دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے خدا نے کیسی صورت دی ہے، آواز ہی کی طرح یقیناً شکل بھی حسین ہو گی۔ مگر وہ میرے بارے میں اتنی فکرمند کیوں ہے؟ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ڈاکٹر کی آواز ابھری:

''ساون جی! ان کے کھان پان کا دھیان رکھیے۔ دودھ پھل دیجیے۔ مانس مچھلی دے سکتے ہیں تو وہ بھی دیجیے گا۔ ہوش میں آنے کے بعد انہیں بھرپور پوسٹک آہار (غذائیت سے بھر

پورغذا) کی ضرورت ہوگی۔"

"رام رام ہم ویشنو (سبزیاں کھانے والے) ہیں۔ ماس مچھلی کا تو نام نہ لیں۔" بھاری زنانہ آواز میں جھڑک تھی۔ آواز سے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ بڑی عمر کی ہے۔ یوں بھی ریکھا نے اسے ماں کہہ کر پکارا تھا تو وہ اس کی ماں ہی ہوگی۔ اگر اس لڑکی کی ماں ہے تو عمر بھی اسی حساب سے پینتالیس، پچاس ہی ہوگی۔

"ماں! آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آنند جی تو بڑے شوق سے مانس مچھلی کھاتے ہیں۔" ریکھا کی شیریں آواز سنائی دی۔

"کھاتا ہے تو کھائے ہم نے کب منع کیا ہے۔" ایک دوسری مردانہ آواز سنائی دی۔

"ریکھا کے باپو! کچھ تو دھرم کا پالن کرو۔ اس گھر میں آج تک مانس مچھلی پکی ہے؟ اسے کھانا ہے تو اپنے گھر جا کر کھائے۔" غصے میں بھری ہوئی وہی بھاری زنانہ آواز سنائی دی۔

"ارے بھاگیہ وان! یہ بیٹی کے سہاگ کا سوال ہے۔ دھرم کو بیچ میں نہ گھسیٹو۔" جھڑکتی ہوئی مردانہ آواز سماعت سے ٹکرائی۔

"اچھا جی ہم تو چلے!" ڈاکٹر کی ہنستی ہوئی آواز سنائی دی۔ مرد بھی شاید اس کے ساتھ جا رہا تھا، دو قدموں کی آہٹ دور ہوتی جا رہی تھی۔

"ماں! آپ بھی جاؤ۔ آنند جی کے ساتھ میں ہوں نا، ضرورت ہوگی تو بلا لوں گی۔"

ریکھا کی آواز کے ساتھ پھر دور ہوتی قدموں کی چاپ سنائی دی۔ گویا اب اس کمرے میں صرف ریکھا رہ گئی تھی۔ میرے عزم وحوصلے کا امتحان ہونے والا تھا۔ پھر بھی میں نے آنکھیں نہ کھولیں مگر ذہن کو پوری طرح جگائے رکھا۔ ساتھ ہی ساتھ میں غور بھی کر رہا تھا کہ آخر میں یہاں تک پہنچا کیسے۔ اگر یہ لوگ لے کر آئے ہیں تو ان کا مقصد کیا ہے؟ کیوں لے کر آئے ہیں؟ اگر میں اتفاقیہ ان کے ہاتھ لگ گیا ہوں تو کیسے؟ میں تو ایسے علاقہ میں تھا جہاں اردو بولی نہیں جاتی جب کہ یہ اردو بول رہے تھے، گو کہ ان کا لہجہ فصیح نہیں تھا اور نہ الفاظ کی ادائیگی صحیح تھی۔

میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر کوئی جواب نہ سوجھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں موت کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔ موت اپنا خوفناک جبڑا کھولے میری طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ مفر کی کوئی راہ نہ تھی۔ اس مکان کو جہاں میں چھپا ہوا تھا اسلحہ برداروں نے گھیر لیا تھا۔ گولیاں

مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ یہ بات نہیں تھی کہ انہوں نے مجھے پہچان لیا تھا بلکہ جو موت کا سیلاب ہر طرف ٹھاٹھیں مار رہا تھا یہ اسی کا بپھرا تھا۔ اسی سیلاب میں مَیں پھنس گیا تھا۔

نہیں، میں خود نہیں پھنسا تھا بلکہ جلیل الرحمٰن کی غلطی سے پھنسا تھا۔ اس نے بپھرے ہجوم کو اس گھر سے دور رکھنے کے لیے صرف ایک گولی چلائی تھی، جواب میں مینہ برسنا شروع ہوگیا تھا۔

موت کو اتنے قریب دیکھ کر میری نظروں میں اپنی بوڑھی ماں کا چہرہ تیرنے لگا تھا۔ بیچاری کتنی آس سے برف میں ڈھکے اس میدان کو دیکھتی ہوگی جدھر سے مجھے آنا تھا اور میں اپنی سرزمین سے سینکڑوں میل دور یہاں موت سے لڑ رہا تھا۔

میرا جنم برف پوش پہاڑوں کے دامن میں بسے ایک چھوٹے سے شہر "نگر" میں ہوا تھا جو گلگت کا پڑوسی شہر ہے۔ اسی نگر کی گلیوں میں کھیلتے کودتے میں نے جوانی کی سرحد پر قدم رکھا تھا۔ سرزمینِ بے آئین کا باسی ہوتے ہوئے بھی میرے دل میں جذبہ حب الوطنی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اسی لیے تو میں نے اس پیشے میں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میرے فیصلے کو تقویت دی تھی میرے ابو نے جو کبھی گلگت اسکاؤٹس میں رہ چکے تھے۔

گلگت اسکاؤٹس وہی نامور تنظیم ہے جس نے بغیر کسی باہری مدد کے گلگت و بلتستان کو آزاد کرا کر پاکستان کے ساتھ الحاق کرایا تھا۔ ابو بتاتے تھے کہ گلگت قدیم تہذیب کی نشانی ہے۔ اسے زمانہ قدیم میں دردستان اور اس سے قبل درد (Darad) کہا جاتا تھا۔ یونانیوں اور رومن مؤرخین نے اسی نام سے اسے یاد کیا ہے جب کہ سنسکرت کی قدیم کتاب "راج ترنگینی" میں اس علاقہ کو دردویسا اور یہاں کے لوگوں کو درد لکھا ہے۔ گویا یہ علاقہ قبل مسیح سے بھی کئی سو سال پہلے آباد ہو چکا تھا۔ لوگ وہاں رہتے تھے۔ پانچویں صدی عیسوی میں ایک انقلاب آیا اور دردو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ شمالی علاقے اور بلتستان کو شامل کر کے "بلور" حکومت کی تشکیل ہوئی۔ بلور حکومت چلتی رہی۔ پرانے بادشاہ کے بعد نئے بادشاہ آتے رہے۔ وقت گزرتا رہا اور 1847ء کا سال آ گیا۔ پڑوس میں سکھوں کی سلطنت تھی۔ انہوں نے حملہ کر کے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ پھر تو جنگ و جدل کی ایک فضا سی بن گئی۔ کبھی ڈوگرہ تو کبھی سکھ 1948ء تک یہ قصہ چلتا رہا۔

1947ء میں پاکستان کی تشکیل کے بعد بھی یہاں کے لوگ غلام تھے۔ ڈوگرہ راجا نے

یہاں والوں کو ہندوستان کے ہاتھ بیچنے کی سازش کی تھی اسی وجہ سے گلگت اسکاؤٹس کے نوجوانوں نے بغاوت کردی تھی اور بغیر باہری مدد کے اپنا علاقہ آزاد کرا کر پاکستان میں شامل کرلیا تھا۔

والد گلگت اسکاؤٹس میں تھے اس لیے میں نے بھی فوج میں شمولیت کے لیے کوشش کی اور کامیاب رہا۔ میں نے آرٹلری میں جانے کا خواب دیکھا تھا مگر اسی دوران مجھے اسپیشل ٹریننگ کے لیے دوبارہ بھیجا گیا۔ یہ ایک خاص ٹریننگ تھی اور اس بارے میں خاص ہدایت تھی کہ کسی کو اپنی اس ٹریننگ کے بارے میں بتایا نہ جائے۔ ابھی ٹریننگ مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ مشرقی پاکستان میں پھیل رہی شورش کی وجہ سے مجھے ڈھاکہ بھیج دیا گیا۔ ڈھاکہ کے تیج گاؤں ایئرپورٹ پر اتر کر میں سیدھا کرمی ٹولہ پہنچا تھا اور وہاں رپورٹ کی تھی۔ وہاں میرے افسر آصف نیازی تھے انہوں نے میرے کاغذات دیکھے پھر مجھے مشورہ دیا تھا کہ تم گونگے اور پاگل بن جاؤ۔ پھر مجھے جیسور نامی شہر میں بھیج دیا گیا تھا۔

یہ شہر ہندوستان کی سرحد سے بہت قریب ہے اس لیے مجھے ہر وقت آنکھیں کھلی رکھنی پڑتی تھیں۔ گو کہ یہ سردی کا موسم تھا مگر میرے لیے یہاں کی سردی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے کہ میں تو گلگت جیسے علاقے کا تھا جہاں برف سے ٹکراتی ہوا ہڈیوں میں اترتی محسوس ہوتی تھی۔ اس لیے میں ایک پھٹی ہوئی، میل سے اَٹی قمیص اور چارخانے والی دھوتی میں سڑکوں پر گھومتا رہتا۔ جس کسی کو رحم آ جاتا تو مجھے بھات (ابلے چاول) دے دیتا۔ کبھی کبھی تو مجھے پورا پورا دن بھوکے رہنا پڑ جاتا۔ خفیہ جیب میں روپے ہوتے ہوئے بھی میں کچھ خرید کر کھا نہیں سکتا تھا۔ اس طرح کی ڈیوٹی میں مجھے بہت مزہ آ رہا تھا۔ اس دوران میں نے تقریباً بیس پچیس دہشت گردوں کو گرفتار بھی کرایا تھا۔ مقامی پولیس والے بھی مجھ سے واقف نہیں تھے۔ یوں بھی مجھے ان سے دور رہنے کی ہدایت تھی۔ مجھے انفارمیشن ڈائریکٹ ڈھاکہ بھیجنا ہوتی پھر وہ لوگ مقامی پولیس کو ہدایت بھیج دیتے۔ انتہائی ضرورت پر میں ملٹری کمانڈر سے مل سکتا تھا۔ اس کے لیے بھی کوڈ بتائے گئے تھے مگر مجھے ابھی تک ایسی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

میں خوش خوش اپنی ڈیوٹی نبھا رہا تھا۔ ڈیوٹی بھی کیا دن بھر سڑکوں پر گھومتے رہنا اور رات ہوتے ہی کسی دکان یا مکان کے برآمدے میں سو جانا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میں بے خبر سو رہا ہوں اور پیٹھ پر لات پڑتی۔ میں چونک کر اٹھ جاتا تب پتا چلتا کہ مکان مالک مجھے اپنے برآمدے

میں سونے نہیں دینا چاہتا اور بھگا رہا ہے۔ میں منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتا ہوا نئے ٹھکانے کی تلاش میں چل پڑتا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی اللہ کا بندہ مجھے سوتا دیکھ کر گھر سے پھٹی پرانی چادر لا کر اڑھا دیتا۔ دنیا میں ہر قسم کے لوگ ہیں تبھی تو یہ دنیا چل رہی ہے۔ ورنہ یہ دنیا ظلم کی انتہا پر پہنچ کر کب کی ختم ہو چکی ہوتی کیوں کہ انسان کی فطرت میں گند ہے۔ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ مٹی میں پانی ملا کر گوندھا گیا ہوگا۔ مٹی میں زیادہ پانی مل جائے تو کیچڑ بنتا ہے۔ کیچڑ سڑتا بھی ہے۔ بعض لوگوں کے اندر بھی سڑاند ہوتی ہے جسے چھپانے کے لیے وہ سو جتن کرتے ہیں مگر وہ سڑاند باہر آ ہی جاتی ہے۔ ایسے ویسے چہروں کے درمیان زندگی گزر رہی تھی کہ پڑوسی ملک نے پاک وطن کے اس حصہ پر حملہ کر دیا۔ بنیا کتنا بھی ترقی کر لے مگر بنیا آخر بنیا ہوتا ہے۔ عیاری اور مکاری اس کی فطرت میں ہوتی ہے۔ تانتیا ٹوپے ہو یا شیواجی، پرتھوی راج چوہان ہو یا پرتاپ سنگھ سب نے ایک ہی راہ اپنائی، عیاری اور مکاری۔ یہی ان کی فطرت میں شامل ہے اسی کا انہوں نے مظاہرہ کیا۔ چوروں کی طرح دبے پاؤں آئے اور ان نوجوانوں کو جو عیش و عشرت کے دلدادہ تھے انہیں بہکانے لگے۔ ان کا ایک ایجنٹ تو پہلے ہی اپنی بساط بچھائے ہوئے تھا۔ جسے اگرتلہ سازش کیس میں فیلڈ مارشل ایوب خان نے جیل بھیج دیا تھا مگر حیرت انگیز طور پر اس کے لیے مغربی پاکستان کے کچھ سیاست دانوں نے تحریک چلا دی جس میں نواب زادہ نصراللہ خاں کا نام سرفہرست ہے۔ کیوں کہ وہی تو عوامی لیگ کے صدر تھے اور وہ غدار اسی عوامی لیگ کا لیڈر تھا۔ کہنے کو اس نے شیر بنگال اے کے فضل الحق کی شاگردی کی تھی اور مجیب الرحمن سے بنگلو بندھو شیخ مجیب کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اسی مجیب نے پورے مشرقی پاکستان کو گندا کر دیا تھا۔ بھولے بھالے نوجوان اس کے اشارے پر اپنی ہی املاک کو نقصان پہنچانے لگے۔ ان کی اس غلطی کا پڑوسی ملک نے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا اور ان کے کندھوں پر بندوق رکھ کر ہمیں نشانہ بنانے لگا تھا۔ اس کی سازش کامیاب سے کامیاب تر ہوتی جا رہی تھی کہ یہ سانحہ رُونما ہو گیا۔ بھارتی فوج اندر تک گھس آئی اور ہمارے لیے فرار کے علاوہ کوئی راستہ نہ بچا۔

جنگ میں اس اصول کو اہمیت دی جاتی ہے کہ اگر پوزیشن کمزور پڑ رہی ہے تو پیچھے ہٹ جاؤ، ہم نے یہی کیا تھا۔ دنیا اسے ہماری شکست کہتی ہے تو کہتی رہے مگر اس کے علاوہ اور کوئی

راستہ بھی تو نہیں تھا۔ خیر ہم لڑتے ہوئے پیچھے ہٹے تھے۔ اگر یہ غلط ہے تو دنیا دکھا دے کہ پورے مشرقی پاکستان میں کہیں سے بھی کسی بھی بارڈر سے بھارتی فوج اندر آئی ہو۔ وہ تو چوروں کی طرح مکتی باہنی کی آڑ میں اندر گھسی تھی یا ہوائی راستے سے کودی تھی۔ خیر، وہ اندر آ کر اپنا جھنڈا لہرا رہی تھی۔ فوجی تو اپنی جان قربان کر رہے تھے یا ہتھیار ڈال کر ایک جگہ جمع ہو گئے تھے مگر میرا انداز تو عام نہ تھا اس لیے میں نے فرار کی راہ اپنائی تھی۔ مگر کہاں جاتا، ہر طرف چور اُچکے خود کو افواجِ آزادی کا نام دے کر بھارتی فوج کے ساتھ لوٹ مار میں مصروف تھے۔ اردو بولنے والوں کے گھر لوٹے جا رہے تھے۔ کوئی تخصیص نہیں تھی کہ آیا سامنے والا فوجی ہے یا سویلین بس لوٹنے کے لیے شکار چاہیے۔ میں گونگا بنا ہوا تھا، مگر مجھے یقین تھا کہ ان کے لیے یہ کافی نہیں تھا وہ خوامخواہ مجھ پر تشدد کرتے صرف دل کی تسکین کے لیے۔ اسی لیے میں بھاگ رہا تھا۔

ایک سنسان سڑک سے گزر رہا تھا کہ میری نظر دور سے آتی ایک جیپ پر پڑی اس جیپ میں اسلحہ بردار سوار تھے۔ مکتی باہنی کے غنڈے لوٹ مار کے لیے فوج کی کھلی جیپ استعمال کر رہے تھے اس لیے میں نے خود کو ایک گڑھے میں گرا دیا اور سانس روک کر لیٹ گیا۔ جیپ آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن جیپ کی آواز کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر فوراً ہی میں نے اطمینان کی سانس بھی لے لی کیوں کہ وہ میری طرف نظر ڈالے بغیر گزر گئے۔ میں اٹھنے پر غور کر ہی رہا تھا کہ سنسان سڑک ایک دوسری جیپ کی آواز سے گونجنے لگی۔ میں پھر سے لیٹ گیا مگر آواز نزدیک آ کر رک گئی تھی۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھنے کی کوشش کی تھی اور بری طرح سے چونک گیا تھا۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ چاروں کے ہاتھ میں رائفلز تھیں۔ وہ مجھے نشانہ پر لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ عام لٹیرے نہیں ہیں، ٹریننگ یافتہ ہیں۔ بے شمار لفنگوں کو بھارت نے عسکری ٹریننگ دے رکھی تھی۔ شاید یہ بھی انہی میں سے تھے میں نے منہ سے عجیب عجیب آواز نکالتے ہوئے خوف زدہ ہونے کی ایکٹنگ کی۔ مگر انہیں رحم نہ آیا اور مجھے گھسیٹتے ہوئے جیپ میں ٹھونس دیا۔ پھر مجھے لے کر ایک عالی شان گھر میں پہنچے۔ شاید یہ گھر کسی اردو داں کا تھا کیوں کہ ایسے گھر بہت کم بنگالی بنا سکتے تھے۔ یہ نیا تھا نا۔

1947ء سے قبل بنگالی مسلمانوں کے پاس زمین نام کو تھی۔ تمام کے تمام بڑے زمیندار

ہندو تھے۔ مسلمان ان کی زمین پر کاشتکاری کر کے گزارا کرتے تھے۔ یہ زمیندار رعایا کو کیڑے مکوڑے سمجھتے تھے۔ انہیں زمیندار کے گھر کے سامنے سے جوتا پہن کر، چھتری جو وہاں کی معاشرت کا جزو ہے، اسے بھی سر پر تان کر بارش سے بچتے ہوئے گزرنے کا حکم نہیں تھا۔ اسی ظلم پر تو ہندو زمینداروں کے خلاف پہلا احتجاج ابھرا تھا جس نے خونی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ جسے برصغیر کا پہلا ہندو مسلم فساد قرار دیا گیا تھا۔

نواکھالی فساد کا سہارا لے کر گاندھی نے سیاست چمکالی اور مسلمانوں کو فسادی قرار دلا دیا۔ گویا ہندو زمینداروں کے پاس ہی بڑے بڑے مکانات تھے۔ مسلمانوں کو جھونپڑیاں ہی نصیب تھیں۔ جب بہار اور مشرقی یوپی کے مسلمان ہجرت کر کے آئے تو اپنے ساتھ پیسے بھی لائے جس سے اس علاقے میں ترقی کی رفتار بڑھ گئی۔ اسی وجہ سے نئے مکانات انہی کے مرہونِ منت ٹھہرے۔ یہ مکان بھی کسی اردو داں کا ہی ہوگا جو اپنی جان بچانے کے لیے بھارت کے راستے نیپال فرار ہو گیا ہوگا یا جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوگا۔ اب اس مکان کو یہ لوگ استعمال کر رہے تھے۔ اس مکان میں کئی اور بھی اردو داں قید تھے۔ یہ سب بزنس مین تھے اور تاوان کے لیے لائے گئے تھے۔ مجھے بھی انہی میں شامل کر دیا گیا۔ شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ میں بھی بڑی رقم دلا دوں گا، یا پھر یہ سوچ کر لائے تھے کہ مجھے ایذا دے کر انہیں دھمکائیں گے۔ ابھی میں اسی سوچ میں تھا کہ ایک نوجوان جس کے بال کندھوں سے بھی نیچے جھول رہے تھے اندر آیا اور بولا۔ ”تمراشوب باہرایشو۔“ (تم سب باہر آؤ)

ہم سب سر جھکائے باہر آ گئے۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔ سامنے ایک لاری کھڑی تھی۔ اس میں ہم سب کو سوار کرایا گیا پھر وہ اسٹارٹ ہو گئی۔ بارش تھی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ لاری کی چھت نہیں تھی اس لیے ہم بھیگتے ہوئے جا رہے تھے۔ لاری کی پچھلی طرف کوئی نہیں تھا مگر آگے دو اسلحہ سے لیس غنڈے بیٹھے تھے۔ میں بھاگ نکلنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ میں نے جائزہ لیا، بھاگ نکلنے کے لیے موسم سازگار تھا۔ معاون تھا۔ میں نے قسمت آزمانے کی ٹھان لی۔ لاری کے اگلے حصے میں اسلحہ بردار بارش سے بچنے کے لیے پٹ سن کا بوریا اوڑھے ہوئے بیٹھا تھا۔ میرے ذہن نے سرگوشی کی، اب یا کبھی نہیں۔

میں نے اپنے ہاتھوں پر جسم کا سارا زور ڈالا اور پلک جھپکتے ہی کود گیا۔ مجھے کودتے کئی قیدیوں نے دیکھا مگر کسی نے شور نہ کیا۔ شاید وہ بھی ایسا ہی کرنا چاہتے ہوں مگر حوصلے کی کمی نے

انہیں ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ نیچے گرتے ہی میں نے ٹریننگ کے مطابق جسم کو گردش دی اور لڑھکتا ہوا سڑک کے کنارے بنے ایک گڑھے میں گرا لیا۔ گڑھے میں کیچڑ پانی بھرا ہوا تھا۔ میں اس میں دم سادھے پڑا رہا۔ جب کافی وقت گزر گیا تو سر اُٹھا کر سڑک کی طرف دیکھا جو کسی بیوہ کی مانگ کی طرح سونی پڑی تھی۔ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ میں گڑھے سے نکلا اور نزدیکی جنگل کی طرف دوڑنے لگا۔ وہ کوئی بڑا جنگل نہیں تھا معمولی سا جھنڈ تھا۔ جسم پر کیچڑ لتھڑا ہوا تھا۔ میں اسی حالت میں وہاں چھپا رہا۔ جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلا میں اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلا اور ایک نئے سفر پر روانہ ہو گیا۔ جسم پر لگا ہر زخم ٹیس دے رہا تھا۔ اندھیری رات میں جا بجا بنے قدرتی گڑھوں میں گرتا، پتھروں سے ٹکراتا اپنے اندازے کے مطابق محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں آگے بڑھتا رہا۔ کافی آگے جانے کے بعد مجھے شہر کے آثار دکھائی دیئے۔ یہ میرے لیے بہتر بھی تھا کیوں کہ شہر میں ہی غیر بنگالی بستے تھے اور مجھے پناہ مل سکتی تھی تو انہی کے یہاں۔ میں نے رفتار تیز کر دی تھی۔

آبادی میں داخل ہوتے ہی پہلے گھر کے قریب میرے قدم آپ ہی آپ رک گئے۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے تھپتھپایا۔ قسمت مہربان تھی۔ اس مکان میں ایک بوڑھا شخص اور اس کی بیوی تھی۔ وہ بنگالی تھے اور اتفاق کی بات ہے کہ وہ محب وطن تھے۔ ان کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا اس لیے وہ پاکستان کے حامی تھے۔ انہوں نے مجھے ڈھارس دی۔ نہانے کے لیے گھر کا تالاب پیش کر دیا۔ جب کہ بنگالی گھر کے تالاب میں کسی غیر کو نہانے کی اجازت نہیں دیتے کیوں کہ وہ عورتوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ نہا دھو کر میں نے انہی کا دیا ہوا کپڑا پہنا۔ ایک پرانی سی لنگی اور بنیان جو وہاں کا عام لباس ہے۔ میں اسے ملبوسِ بدن کر کے کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔

کھانے کے بعد مجھے سونے کے لیے دو چھتی پر لے گئے۔ عام طور سے وہاں دو چھتی پر صرف سامان رکھا جاتا ہے مگر میری حفاظت کے خیال سے انہوں نے وہ جگہ دی تھی۔ جسم کو آرام ملا تو میں بے خبر ہو گیا، صبح سو کر اٹھا تو بوڑھے نے کہا۔ ”بیٹا! یہاں قدم قدم پر بھارتی فوج اور مکتی باہنی کے غنڈے دندناتے پھر رہے ہیں۔ میرا گھر بھی نشانے پر ہے چلو میں تمہیں بس اڈے تک چھوڑ دوں۔“

میں اس کے ساتھ نکلا تھا کہ میری ملاقات جلیل الرحمٰن سے ہو گئی۔ اس سے پہلے بھی ایک

دو بار ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ رضا کار تھا۔

جب شیخ مجیب کے غنڈوں نے عوام کا جینا حرام کر دیا تو محب وطن بنگالی آگے آئے اور رضا کار کے نام سے ایک نیم فوجی دستہ کی تشکیل دے کر حکومت کو خدمت پیش کر دی جبکہ اردو بولنے والوں نے مجاہد فورس کے نام سے اپنی خدمت پیش کی تھی۔ یہ دونوں فورس کے جوان، افواج پاکستان کے شانہ بہ شانہ لڑ رہے تھے۔ ان کی یہی حب الوطنی آج ان کے لیے دشواری کی وجہ بن گئی تھی۔ مکتی باہنی اور بھارتی فوج دونوں ہی ان کی تلاش میں تھی۔ مکتی باہنی انہیں پکڑتی تو فوراً گولی مار دیتی اور بھارتی فوج گرفتار کر لیتی۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی سرنڈر کی خبر پھیلی یہ دونوں ہی اپنی اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر سے اُدھر بھاگنے لگے، جلیل الرحمٰن بھی بھٹک رہا تھا۔ پناہ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ اس کے ساتھ میں بھی ہو لیا۔

وہ مجھے لے کر اپنے ایک جاننے والے کے گھر ”سات کھیرا“ آ گیا۔ یہ بھارتی سرحد سے قریب کا قصبہ تھا۔ ہم دونوں یہیں کے ایک گھر میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ اس کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ اس نے اسلحہ کے زعم میں خود کو محفوظ سمجھ لیا تھا جبکہ ہر طرف مکتی باہنی کے غنڈے پاگل کتوں کی طرح رضا کاروں کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے۔ کسی طرح یہ بات پھیل گئی کہ اس گھر میں رضا کار چھپے ہوئے ہیں اور وہ ہمارا شکار کرنے کے لیے دوڑ پڑے۔ جلیل نے خوب مقابلہ کیا لیکن جب ایک نہیں کئی گولیاں اس کے جسم میں دھنس گئیں تو اس نے مجھ سے کہا۔ ”گونگے بھائی، زندگی بچانا فرض ہے، تم بھاگ لو۔ مکان کے پیچھے جمنا ندی کا دھارا بہہ رہا ہے تم ندی میں کود جاؤ، آگے جو مرضی اللہ کی۔“

اس کا مشورہ بروقت تھا۔ میں نے عمل کرنے کا سوچ لیا کیوں کہ وقت بالکل نہیں تھا۔ دشمن مسلسل فائرنگ کر رہے تھے۔ میں دوڑتا ہوا اوپر پہنچا تھا اور چھت سے چھلانگ لگا دی تھی۔ درمیانی فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ سیدھا ندی میں جا کر گرا تھا۔ تیرنا میری ٹریننگ کا حصہ تھا اس لیے پانی کے اندر ہی اندر تیرتا چلا گیا تھا۔

جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اس لیے اوپر ابھرنے سے گریزاں تھا۔ نیچے ہی نیچے تیرتا چلا جا رہا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر تک نیچے رہا کہ سانس پھولنے لگی۔ ایسا لگنے لگا جیسے سانس کی ڈور ٹوٹ جائے گی مگر اوپر آتے ہوئے اس لیے ڈر رہا تھا کہ کہیں دشمن تاک میں نہ بیٹھا ہو۔ لیکن جب بہت مجبور ہو گیا تو اوپر آنا پڑا۔

اوپر آیا ہی تھا کہ نزدیک سے گزرنے والی کشتی پر بیٹھے شخص نے نعرہ لگایا۔ ''ائی رولو راجا کار'' (یہ رہا رضا کار) ساتھ ہی ساتھ اس نے پوری قوت سے چپو میرے سر پر مارا تھا۔ چوٹ پڑتے ہی میں دور جا گرا تھا، وہاں پانی پُرشور آواز سے نیچے گہرائی میں گر رہا تھا۔ میں بھی پانی کے ساتھ نیچے بڑی ندی میں جا گرا، پھر مجھے ہوش نہ رہا۔

ہوش آیا تو میں اس گھر میں موجود تھا اور میرے گرد یہ لوگ کھڑے تھے۔ ساون جی کے جاتے ہی ریکھا نے ماں کو بھی چلتا کر دیا تھا۔ اب وہی میرے بستر کے ساتھ کرسی ڈالے بیٹھی تھی۔ میں نے آنکھوں کو تھوڑا سا کھولا اور ریکھا کا جائزہ لیا۔ واقعی وہ بہت خوبصورت تھی۔ ایسی ہی لڑکیوں کو توبہ شکن کہا جاتا ہے۔ زاہد کی توبہ توڑ دینے والے حسن کی مالکہ تھی وہ۔

ابھی میں اس کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ شاید اس کی چھٹی حس نے کام کر دکھایا تھا۔ عورتوں کی حس تو ویسے بھی تیز ہوتی ہے۔ آپ نے بھی اندازہ لگایا ہوگا کہ کسی عورت کی آپ پیٹھ پر بھی نظریں گڑائیں تو وہ پلٹ کر ضرور دیکھے گی۔ دراصل اس کی چھٹی حس کا یہ کمال ہے۔ ریکھا کی بھی حس نے کمال کر دکھایا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''آنند جی آپ جاگ رہے ہیں؟''

''آں...... کو...... کون؟'' میں نے اداکاری کا مظاہرہ کیا۔

''میں ہوں ریکھا!'' پھر اس نے آواز دی۔ ''ماں! او ماں...... جلدی آؤ...... آنند جی کو ہوش آ گیا ہے۔''

''آتی ہوں آتی ہوں۔'' وہی آواز آئی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تھی کہ ریکھا نے کہا۔ ''نہیں نہیں ڈاکٹر بابو نے منع کیا ہے۔ آپ لیٹے رہیں۔ میں بابوجی کو بلاتی ہوں۔ وہ جا کر ڈاکٹر کو بلا لائیں گے۔''

وہ تیزی سے باہر کی سمت بڑھتی چلی گئی۔ میں ابھی لیٹا ہوا دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ایک بڑی عمر کی عورت اندر داخل ہوئی۔ شاید وہ ریکھا کی ماں تھی۔ اس نے مجھ پر نظر ڈال کر کہا۔ ''آنند بابو! اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''

''بہتر محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے نقاہت والی آواز بناتے ہوئے کہا۔

وہ میری طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ ریکھا اندر آئی۔ ''آنند جی! ڈاکٹر بابو بھی باہر ہی کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ میں نے انہیں بلا لیا۔ وہ آ رہے ہیں۔''

''ریکھا! میں ان کے لیے دودھ لاتی ہوں تب تک تم باتیں کرو۔'' کہہ کر وہ عورت باہر چلی گئی۔ ریکھا کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ سرشار لہجے میں بولتے ہوئے آگے آئی۔ ''پورے آٹھ دن بعد آپ کو ہوش آیا ہے۔ ہم سب کتنے پریشان تھے میں بتا نہیں سکتی۔ دیدی الگ چنت، بار بار ان کا فون آ رہا ہے۔ میرا تو خیال ہے وہ جلپائی گوڑی سے چل پڑی ہوگی۔ اب تب میں پہنچنے ہی والی ہوگی۔ اسے ساتھ آنے والا کوئی مل نہیں رہا تھا ورنہ وہ کب کی آ چکی ہوتی۔'' اس کی باتیں جاری تھیں کہ ڈاکٹر اور ساون جی داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نے آتے ہی میری پیشانی کو چھوا پھر بولا۔ ''کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''

''جی بہتر......''

''آپ کو یہ چوٹ کیسے لگی؟ ندی میں کیسے گرے تھے؟'' اس نے سوال کیا۔

''چوٹ؟'' کہہ کر میں نے سر پر ہاتھ پھیرا تبھی میرے دماغ نے ایک نئی راہ سجھائی اور میں نے رک رک کر کہا۔ ''چوٹ...... چوٹ ہاں چوٹ تو لگی ہے...... کیسے لگی؟'' گویا میں اس چوٹ کا ذمے دار انہی لوگوں کو ٹھہرا رہا تھا۔

ڈاکٹر نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر سرگوشی میں ساون جی سے بولا۔ ''لگتا ہے ان کے دماغ پر اثر پڑا ہے۔ چوٹ لگنے سے ایسا ہو جاتا ہے۔ فکر نہ کریں ہفتہ دو ہفتہ میں ٹھیک ہو جائے گا۔''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ان کی یادداشت پر اثر پڑا ہے۔ دیدی کی حالت ایسے ہی ٹھیک نہیں ہے۔ یہ خبر تو ان پر بجلی بن کر گرے گی۔'' ریکھا نے فکر بھرے انداز میں کہا۔

اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ میں اس کی دیدی کی وجہ سے اس کے لیے اہم ہوں۔ اب میں نے غور سے اس کے سر پر نظر ڈالی۔ مانگ سونی تھی، سیندور نہیں تھا یعنی وہ کنواری تھی۔ اگر وہ کنواری ہے تو کیا وہ مجھے اپنا منگیتر یا عاشق سمجھ رہی ہے؟ میں اسی الجھن میں تھا کہ وہ بولی۔ ''تم کچھ کھاؤ گے؟''

''نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیوں، دیدی کے آنے کا سن کر بھوک اڑ گئی۔ بس کچھ ہی دیر کی بات ہے۔ شام کے پانچ بجنے ہی والے ہیں۔ پونے پانچ بجے ایکسپریس بس پہنچتی ہے، سلی گوڑی جلپائی گوڑی ایکسپریس بس، جواب پہنچنے ہی والی ہوگی۔ بلکہ پہنچ چکی ہوگی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کے بولنے کا انداز بڑا پیارا تھا، میرے دل کی پکار تھی کہ وہ بولتی رہے اور میں سنتا رہوں اسی لیے میں ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا کہ اس نے کہا۔ ''کیا بات ہے آنند بابو! آپ تو مجھے ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں نگل جائیں گے۔ یہ حرکت دیدی نے پکڑ لی نا تو آپ کی خیر نہیں۔'' اس نے نہایت ہیجان انگیز انداز میں آگے کی طرف جھک کر سرگوشی میں کہا۔

کچھ بھی ہو میں ایک مرد تھا، ہر مرد کے اندر ایک مانگ ہوتی ہے اور وہ، اس مانگ کو پورا کرنے کے لیے کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ کہیں میرے اندر کی مانگ تیز نہ ہو جائے اور میں اپنا آپ کھو نہ بیٹھوں اس لیے جلدی جلدی سر کو جھٹکنے لگا۔ خیالات کے گورکھ دھندے سے نکلنے کے لیے خود کو سنبھالنے کے لیے جھٹکا ضروری ہے۔ اس طرح میں خود کو فریب دینے کے لیے، اس نامعلوم کشش کو جھٹک رہا تھا۔ اس سے دامن بچا رہا تھا۔

''ارے یہ آپ کو کیا ہو گیا؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا اور کرسی سے کھڑی ہو گئی، جیسے مجھ کو مجھی سے چھیننا چاہتی ہو۔

''کچھ نہیں۔'' کہہ کر میں نے سر تکیہ پر ڈال دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

''سر دبا دوں؟'' اس نے پوچھا اور میں اندر تک لرز گیا۔ وہ میرے حوصلے کو ڈگمگا دینے پر پوری طرح اتر آئی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا:

''نہیں، تم جاؤ۔''

''میں سمجھ گئی آپ دیدی کا انتظار کر رہے ہیں۔ ارے بھولے ناتھ سالی آدھی گھر والی ہوتی ہے۔ یہ آپ ہی کا کہنا ہے نا؟'' اس نے آنکھیں تریر کر کہا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ آج پوری طرح میرے جذبات میں آگ لگا کر ہی رہے گی۔ صدیوں پہلے ایک رشی کی عبادت کو خاک میں ملانے کے لیے سورگ سے مینکا آئی تھی۔ وہ رشی کی تپسیا، عبادات کو اپنی اداؤں سے خاک میں ملا گئی۔ یہ بھی اپنی اداؤں کا وار کر رہی تھی۔

میں پریشان ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ بھی گویا پریشان کرنے پر تل گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''آپ لگتا ہے دیدی سے کچھ زیادہ ہی ڈرنے لگے ہیں، کوئی بات نہیں ان کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ آپ کچھ سوست (صحت یاب) ہو جائیں پھر دیکھئے گا میں پہلے سے بھی بڑھیاں (اچھے) انداز میں آپ کی خاطرداری کروں گی۔'' اس کا انداز حد درجہ شوخ تھا۔ میں مزید پریشان ہو اٹھا۔ یہ

زیادہ خطرناک بات تھی۔ چور زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ اپنے مفاد کے لیے کسی کو بھی سولی چڑھا سکتے ہیں۔ آنند، جس کے دھوکے میں یہ لوگ مجھے پکڑ لائے تھے یقیناً وہ رنگین مزاج تھا۔ ان کے مذہب میں یہ بات گناہ میں شامل نہیں، کرشن جی کی پانچ سو پٹرانیاں تھیں۔ جس کو اپنی ایک رات دیتا تھا اس کی باری کئی سال بعد آتی تھی پھر بھی وہ اِدھر اُدھر تاک جھانک کرتا تھا۔ ان کے لیے یہ ایک عام سی بات تھی مگر اسلام میں تو گناہ ہے اس لیے میں زیادہ ڈرا ہوا تھا۔ انسان سے کوئی بات چھپا لینا بڑی بات نہیں ہے مگر خدا سے کوئی بات کیسے چھپائی جائے؟ اس ڈر سے میں سہما ہوا تھا کہ باہر سے ماں کی آواز آئی۔

''ریکھا او ریکھا! جلدی آ...... دیکھ بہن آ گئی ہے۔''

''میں ابھی آئی......'' کہہ کر وہ باہر کی جانب چل دی۔ ابھی میں آنے والی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ قیامت آ گئی۔ واقعی وہ قیامت ہی تھی۔ ریکھا اس کے سامنے کچھ بھی نہ تھی۔ اس کا انگ انگ سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ رنگت بھی اس سے زیادہ صاف تھی۔ ایسی ہی حسیناؤں کو خوبصورتی کا مرقع کہا جاتا ہے۔ حسن مکمل کہا جا سکتا ہے مگر اس کے حسن میں ایک خال بھی تھا، ہلکی سی کالک، کہ وہ پورے دنوں سے تھی۔ اس لیے کہ چہرے پر پھیکا پن تھا اور پیٹ بھی کافی بڑھا ہوا تھا۔ وہ بڑی بے تابی سے میری طرف بڑھی تھی۔ اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس کے پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے جلدی سے کہا۔ ''ماں آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھیں نا۔''

اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ یہ موقع مناسب نہیں، پیچھے ماں کھڑی ہے۔ وہ اسی جگہ رک گئی۔

''تم لوگ باتیں کرو میں کھانے کا انتظام کرنے چلی۔'' ماں نے کہا اور باہر نکل گئی۔ ریکھا بھی غائب تھی۔ اب میں کیا کروں، یہی سوچ رہا تھا کہ باہر سے ریکھا کی آواز آئی۔

''دیدی! شانتا کا دودھ کس بیگ میں ہے۔''

شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ ہم دونوں اتنے دنوں کی دوری کا قرض اتارنے میں لگے ہوں گے۔ فراق کے گلے شکوے ہو رہے ہوں گے۔

''میں شانتا کا فیڈر اور دودھ نکال کر دے آتی ہوں۔'' کہتی ہوئی وہ باہر چلی گئی۔

پتا نہیں شانتا کتنی بڑی ہے۔ گویا اب مجھے باپ کی ڈیوٹی بھی نبھانی پڑے گی۔ میں ابھی

یہی سوچ رہا تھا کہ وہ واپس آ گئی۔ اس نے گود میں دو ڈھائی سال کی بچی کو اٹھا رکھا تھا۔ بچی کو میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ دیکھو تمہارے بابو جی کو کیا ہو گیا۔ جاؤ پیار کرو۔''

کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا اس لیے میں نے خود پر جبر کر کے بچی کو گود میں لے لیا۔ بچی میری گود میں آتے ہی رونے لگی۔ شانتا کو روتا دیکھ کر اس نے واپس لے لیا۔ ''دیکھیے، اتنے دنوں کے بعد دیکھ رہی ہے نا اسی لیے ڈر رہی ہے۔''

''شولیکھا، او شولیکھا۔'' باہر سے ماں کی آواز آئی۔

''جی ماں جی!'' کہتے ہوئے وہ باہر کی جانب بڑھی۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے بچا لیا۔ مگر اس سے نجات آسان نہیں ہے، اس کا بھی اندازہ تھا۔

میں کس طرح کی مصیبت میں پھنس گیا ہوں اس کا صحیح اندازہ رات میں ہوا۔ وہ سونے کے لیے میرے ہی کمرے میں آ گئی تھی۔ اب ذرا آپ سوچیں، میں نئی دلہن کو بلکتا چھوڑ آیا تھا۔ اتنے دنوں سے بیوی سے دور تھا کہ قیامت کا لمحہ سر پر سوار ہو گیا۔ وہ میرے ہی بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ نہ صرف لیٹی بلکہ آگے بڑھنے کی بھی کوشش کرنے لگی۔

اس کی حرکتیں مجھے پاگل کیے دے رہی تھیں، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ جسم میں خون کی روانی بڑھنے لگی تھی۔ جسم طلب پر آمادہ تھا اور وہ مطلوب بننے کی کوشش میں سرگرداں۔ جسم ہانپنے لگا تھا، کانپنے لگا تھا۔ اس کی پکار زوروں پر تھی۔ وہ کہہ رہا تھا آگے بڑھ۔ شرافت کا تقاضہ تھا خود میں سمٹ۔ اس کوشش کو ناکام بنا کیوں کہ تو مسلمان ہے۔ تیرے اندر ایمان ہے۔ ایمان کے بھی تقاضے ہیں۔ ایمان تلوار کی دھار ہے۔ ذرا سا بہکے، ایمان غارت۔ اس لیے ایمان بچانا ہے۔ خود کو سچا مسلمان ثابت کرنا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ کو پکارا۔ میں یہی کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ مگر اس وقت وہ مکمل طور پر شیطان کی پجارن بننے پر اتر آئی تھی۔ وہ آگے بڑھ رہی تھی، میں پیچھے ہٹ رہا تھا مگر جسم بغاوت کر رہا تھا۔ آگے بڑھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ میں عجیب مخمصے میں تھا۔ اب تب میں مَیں اخلاقیات کا قلعہ زمیں بوس کر دیتا کہ خدا کو رحم آ گیا۔ بچی نے زور کی چیخ ماری جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔ میں جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی بتی اونچی کی۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ اب جو میں نے بستر پر نظر ڈالی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ڈیڑھ انچ کا کالا بچھو دوڑ رہا تھا۔ بچھو کو دیکھ کر اس نے بھی چیخ ماری۔ باہر سے آواز آئی۔ ''کیا ہوا؟''

میں نے کہا۔ ''کچھ نہیں۔ بچھو ہے۔'' پھر اسے جوتا ہاتھ میں لے کر مارنے لگا۔ اتنی دیر میں اس نے جا کر دروازہ کھول دیا تھا۔ ریکھا، اس کی ماں اور باپ اندر آ گئے تھے۔ میں بچھو کو جوتے کی نوک سے اچھال رہا تھا کہ ریکھا نے نزدیک آ کر سرگوشی میں کہا۔ ''بچھوا ڈنک مار گیو رے...... ساری رات زہر اترے گا مگر دیدی کی حالت نظر میں رکھنا۔''

میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ تبھی اس کی ماں بولی۔ ''منہ کیا دیکھ رہی ہے، جیجا کا ہاتھ بٹا۔''

''نہیں ہو گیا۔'' میں نے کہا۔

''کیسے ہو گیا، بستر پر جوتا لگا ہے، اسی پر سوئیں گے۔ جلدی سے چادر تو بدل دے۔'' ماں نے ریکھا کو پھر جھڑکا تو وہ دوسری چادر لے آئی۔ چادر صحیح کرتے کرتے بولی۔ ''سب بچھو کی سوچ رہے ہیں، بچی کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں ہے۔ دیکھئے تو وہ کیسے روئے جا رہی ہے۔''

اس کے کہنے سے سب کا دھیان بچی کی طرف گیا۔ وہ بری طرح مچل رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ میں نے بچی کے پیر پر نظر ڈالی۔ اس کا پیر ورم آلود تھا۔ میں نے ریکھا کی ماں سے کہا۔ ''اس پر زہر چڑھ رہا ہے۔''

ماں نے باپ کی طرف رخ کر کے کہا۔ ''ریکھا کے باپو دیکھ کیا رہے ہو۔ جلدی جا کر رتن جی کو بلا لاؤ وہ زہر اتارنا جانتے ہیں۔''

ریکھا کا باپ باہر چلا گیا۔ شولیکھا بچی کو بہلانے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔

وہ تو ننھی سی بچی تھی۔ بڑوں کو بچھو ڈنک مار دے تو ان کی حالت بگڑ جاتی ہے۔ اس کی حالت بھی بگڑ رہی تھی کہ ریکھا کا باپ ایک آدمی کو لے کر آ گیا۔ شاید وہی رتن تھا۔ اس نے آتے ہی بچی کے پیر کو دیکھا پھر اپنی تھیلی سے ایک بیج نکال کر پتھر پر گھسنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ پانی کے چھینٹے بھی مارتا جا رہا تھا۔ پھر اس لعاب کو اس نے بچی کے پیر پر اس جگہ لگا دیا جہاں زیادہ ورم تھا۔ بچی کو آرام ملا تو وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے بھی راحت کی سانس لی۔ شولیکھا بچی کو گود میں لے کر بیٹھ گئی۔

میری آنکھوں میں نیند تھی۔ بچی نے میرے ایمان کو بچالیا تھا۔ میں نے شکر خدا کرتے کرتے خود کو نیند کی گود میں ڈال دیا۔ مجھے یقین تھا کہ بچی کے آرام میں خلل نہ پڑے اس خیال سے وہ میرے آرام میں مخل نہیں ہوگی۔ اسی لیے ہر فکر سے آزاد ہو کر سویا تھا۔ اب جو میری آنکھ لگی تو صبح ہی کھلی وہ بھی شولیکھا کے بیدار کرانے پر۔ اس نے حرکت ہی ایسی کی تھی کہ میں کراہیت سے اچھل کر بستر سے اترا تھا۔ رات میں بھی اس نے مجھے اردو پڑھانے کی کوشش کی تھی، الف کھڑا، ب لیٹا، ت کے اُوپر دو نقطے، ج کے پیٹ میں ایک نقطہ جس میں نکتہ ہی نکتہ۔ مگر مجھے انہی نکات سے بچنا تھا اس لیے بستر سے اتر کر سیدھا باتھ روم میں گھس گیا تھا اور ہونٹوں کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگا تھا۔

زندگی نے مجھے ایسے سوالیہ نشان پر لا کھڑا کیا تھا کہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کا اختتام کیا ہوگا۔ اس کے دل میں کوئی گناہ نہیں تھا۔ وہ تو معصوم تھی اور اپنی ذمے داری نبھا رہی تھی۔ شوہر سمجھ کر واری صدقے جا رہی تھی۔ اپنے فرائض ادا کر رہی تھی، مگر میں تو انجان نہیں تھا کہ اس کے ساتھ پاگل ہوا تھا۔ کیونکہ میں ایک غیر شخص تھا۔ اس کا شوہر نہیں تھا۔

باتھ روم سے نکلا ہی تھا کہ ریکھا بالٹی میں پانی لینے میرے قریب سے گزری۔ جاتے جاتے سرگوشی میں بول گئی۔ ”بڑا افسوس ہوا اتنے دن بعد ملے اور بچی نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا، چچ چچ۔“

میں نے اسے گھور کر دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ زندگی کا یہ رنگ بھی عجیب تھا میں سمجھ کر بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس رنگ کو میں کس روپ میں دیکھوں۔

”جمائی جی کھڑے کھڑے کیا سوچ رہے ہیں!“ ریکھا کی ماں کی آواز پر میں خیالوں کی دنیا سے باہر آگیا اور دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں مجھے سونے کے لیے بستر اور اس بستر کی زینت کے لیے شولیکھا کو دیا گیا تھا۔ میں اس کمرے میں داخل ہوا تو سامانِ اجل شولیکھا استری شدہ کپڑے لیے منتظر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ”دروازہ تو بند کرتے آیئے۔“

”کیوں؟ کیوں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کپڑے بدلنا نہیں ہے کیا؟“ اس نے کہا۔

”کپڑے بدلنے کے لیے دروازہ بند کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ لاؤ کرتہ ادھر

بڑھاؤ۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”ارے آج آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ ہمیشہ آپ کو کپڑے میں پہناتی ہوں۔ بنیان سے لے کر انڈر ویئر تک۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا اور میں کانپ کر رہ گیا کہ اب یہ مجھے زیر جامہ تک پہنائے گی، بھلے ہی یہاں کی بیویاں ایسا کرنا اپنا دھرم سمجھتی ہوں مگر میرے لیے یہ ایک کڑا امتحان تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے تقریباً جھپٹتے ہوئے کرتہ لیا اور اسے پھرتی سے گلے میں ڈال کر آستین میں دونوں ہاتھ داخل کیے اور پھر پاجامہ اٹھایا تھا کہ وہ بولی۔ ”لایئے میں پہنا دیتی ہوں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

میں نے عزت بچانے کے لیے چیخ کر کہا۔ ”نہیں، میں خود پہن لوں گا۔“

”لگتا ہے حادثہ کا اثر ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے۔ ساری عادت بدل گئی ہے۔“

میں نے اس کی چڑ چڑ کی پرواہ نہیں کی اور پاجامہ پہن کر آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر کنگھی کرنے لگا۔ میں آئینہ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بند ہونٹوں سے کہہ رہی ہو ”بچو! کب تک بچو گے؟

میں کنگھی کر کے باہر آگیا۔

”آیئے جمائی جی رسوئی گھر میں آجایئے۔“ ریکھا کی ماں نے آواز دی تو میں ادھر ہی بڑھ گیا۔

رسوئی گھر (باورچی خانہ) میں زمین پر برابر برابر میں دو پٹرے بچھے تھے۔ ایک پٹرے پر میں بیٹھ گیا آلتی پالتی مار کر۔ یہ انداز میں نے جیسور میں ایک ہندو کے گھر میں کھانے کا دیکھا تھا، اسی لیے ایسے بیٹھا تھا۔ ریکھا کی ماں نے پیتل کا ایک گول لوٹا میرے سامنے رکھا۔ مجھے یاد تھا کہ ہندو کھانا شروع کرنے سے پہلے پانی کا چھینٹا مار کر حصار بناتے ہیں اس لیے میں نے بھی چلّو میں پانی لے کر نصف دائرہ میں چھڑکا۔ ماں نے پیتل کی تھالی سامنے رکھی پھر اس میں روٹی اور سالن ڈالا۔ میں کئی دن کا بھوکا تھا۔ خوب سیر ہو کر کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے باہر جانے پر غور کیا کیوں کہ میں علاقے کو پہچاننا چاہتا تھا کہ اس وقت میں کس علاقہ میں ہوں اور یہاں سے نکلنے کا راستہ کیا ہو سکتا ہے۔

میں ابھی آنگن میں نکلا تھا کہ ریکھا نے کہا۔ ”جیجا جی! یہ دروازے کی طرف کیوں بڑھ رہے ہیں؟“

"گھر میں جی ہول رہا ہے، میں ذرا باہر کی تازہ ہوا بھی لے لوں۔" میں نے کہا۔

"مگر آپ کی طبیعت صحیح نہیں ہے، باہر نہ جائیں۔"

"اسی لیے تو جانا چاہتا ہوں کہ باہر کی ہوا میں کیسا لگتا ہے۔ اگر کمزوری محسوس ہوئی تو لوٹ آؤں گا۔ ویسے بھی میں اتنا تو کمزور نہیں ہوں۔"

"آپ بجرنگ بلی ہیں مگر یہ بھی تو سوچئے کئی دن کی بے ہوشی کے بعد کل ہوش آیا اور آج مٹرگشتی کے لیے نکل پڑے۔ آرام کریئے آرام۔"

"تجربے کے طور پر جا رہا ہوں۔ بے فکر رہو مجھے کچھ نہیں ہونے کا۔" کہہ کر میں دروازے سے باہر نکل آیا۔

باہر آ کر میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ سڑکیں چھوٹی اور کم کشادہ تھیں۔ اطراف میں دکانیں بھی تھیں مگر ان میں تصنع نہیں تھا۔ سجاوٹ نہیں تھی بس یوں ہی سی دکانیں تھیں۔ ان دکانوں پر بورڈ بھی لگے تھے مگر میں پڑھنے سے قاصر تھا کیوں کہ وہ بنگلہ میں تھے۔ مجھے بنگلہ پڑھایا نہیں گیا تھا مگر میں سمجھ سکتا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک دکان پر انگلش میں لکھا نظر آ گیا اور تب میں نے جانا کہ اس شہر کا نام بن گاؤں ہے اور یہ صوبہ مغربی بنگال کا شہر ہے۔ مجھے حیرت کا زبردست جھٹکا لگا کہ میں جس گھر میں ہوں وہ لوگ تو اردو بول رہے ہیں جبکہ مغربی بنگال کی زبان بھی بنگلہ ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ کہیں یہاں کی سی آئی ڈی کو مجھ پر شک تو نہیں ہو گیا ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ میرے پاس کوئی اہم راز ہے۔ اسی راز کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے یہ چال چلی ہے۔ ہر ملک کا محکمہ خفیہ اس طرح کی چال چلتا ہے کہ عام آدمی چکرا کر رہ جائے۔ دشمن کو بے خبری میں رکھنے کے لیے جال در جال بُنتے ہیں اور پھر دشمن اس جال میں اُلجھ کر پکڑ میں آ جاتا ہے۔ میرے گرد بھی ایسا ہی جال بُنا گیا ہے۔ اس جال کا توڑ کیا ہو؟ میں اس پر غور کرتا ہوا چلتا چلا جا رہا تھا کہ ایک آدمی نے میرا راستہ روک لیا۔ "آنند جی آپ اب اور آگے مت جائیں چلیے میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔"

اس کا اس طرح روکنا میرے شک کو تقویت دے گیا کہ میرا تعاقب ہو رہا ہے۔ مجھ پر نظر رکھی جا رہی ہے تبھی تو اس شخص نے مجھے آگے جانے سے روک لیا ہے۔ میں شش و پنج میں گرفتار کھڑا تھا کہ اس شخص نے کہا۔ "کیا سوچ رہے ہیں، جلدی چلیے۔"

"مگر یہ تو بتایئے آپ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہیں؟ یہ کوئی شرافت تو نہیں ہوئی۔"

میرے لہجے میں برہمی تھی۔

"آنند بابو آپ بیمار ہیں آپ کو آزاد چھوڑنا خطرناک ہے نا۔" اس نے کہا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ ابھی ہم نے آدھا راستہ طے کیا تھا کہ سامنے سے آتے ہوئے ایک شخص نے میرا راستہ روک لیا۔ "کی کھوبور، کیمن آچھین؟" (کیا خبر، کیسے ہیں)

میں اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے ساتھ کھڑے شخص نے کہا۔ "آنند بابو! اسی نے آپ کو پانی سے نکالا تھا۔ آپ بہتے چلے جا رہے تھے کہ اس کی نظر پڑ گئی اور اس نے ندی میں چھلانگ لگا کر آپ کو باہر نکال لیا۔ یہ تو آپ کو پہچانتا نہیں تھا۔ اتفاق سے میں ایک کام سے ندی کی طرف چلا گیا تھا۔ اس نے پانی سے باہر نکال کر آپ کو زمین پر لٹا رکھا تھا۔ لوگ پہچاننے کے لیے دائرہ بنائے کھڑے تھے کہ میں نے پہچان لیا اور ریکھا کو آ کر خبر کر دی۔ ساون جی فوراً بھاگتے ہوئے گئے اور تم کو اُٹھا لائے۔"

"اچھا اچھا وہ آپ تھے۔" میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "آمار نام بانچھا رام باجارے آمار ماچھیر دکان، کونو دن آشبین۔" (میرا نام بانچھا رام ہے۔ بازار میں میری مچھلی کی دکان ہے، کسی دن آیئے گا)

"نشچوئے نشچوئے۔" (ضرور ضرور) میں نے کہا۔ میں دو چار لفظ جانتا تھا وہی بول دیا۔ مجھے قسمت کی دیوی پر ہنسی آتی تھی کہ وہ کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ میں بنگلہ سے نابلد، اسی لیے مجھے پناہ ملی تو ایسے گھر میں جو ہندی بولتا تھا۔ اگر یہی کہانی کسی بنگلہ بولنے والے کے گھر میں ہوتی تو زیادہ پریشانی کی بات ہو جاتی۔ کچھ بھی ہو بات ویسے بھی الجھی ہوئی تھی۔ پناہ حاصل تو کر لی تھی مگر یہی پناہ میرے لیے زنجیر بنتی جا رہی تھی۔ اسی لیے اس کے آگے بڑھتے ہی میں بھی آگے بڑھ گیا۔ میں ابھی گھر جانا نہیں چاہتا تھا مگر وہ ہمزاد کی طرح میرے سر پر موجود تھا۔ میں نے اس کو جانچنے کے لیے کہا۔ "آپ کرتے کیا ہیں؟"

"بہار پولیس میں ہوں۔ ان دنوں چھٹی پر آیا ہوا ہوں۔" اس نے کہا تو میں اندر سے سہم گیا کہ ضرور کوئی بات ہے۔ یہاں کی سی آئی ڈی میرے پیچھے لگ چکی ہے۔

اگر یہاں کا محکمہ خفیہ پیچھے لگ چکا ہے تو ان سے پیچھا چھڑانا آسان نہیں ہے۔ اگر کوشش کروں گا تو مزید غلطیاں گلے پڑ سکتی ہیں۔ اس لیے خاموش رہ کر تماشہ دیکھنا ہی عقل مندی ہے۔ اس لیے میں نے اسے ٹوکنے سے بہتر یہی سمجھا کہ گھر واپس جانا ہی بہتر ہے، اور میں نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ تو جیسے انتظار ہی میں تھا۔ ہم واپس چل پڑے۔ گھر پہنچ کر میں اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرا خالی تھا۔ نہ تو ریکھا تھی اور نہ شولیکھا اس لیے اندر جا کر لیٹ گیا۔ آرام کی طلب کسے نہیں ہوتی۔ کچھ ہی دیر میں آنکھیں بند ہونے لگیں اور میں بے خبر ہو گیا۔

☆======☆======☆

تقریباً شام کے سات بجے ریکھا نے مجھے بیدار کیا۔ ''کیا ہاتھی گھوڑا بیچ کر سوئے ہیں۔ اب اٹھ بھی جائیں۔''

''ارے! شام ہو گئی۔'' کہتا ہوا میں اٹھ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ میں نے باہر نل پر جا کر کلی کی اور چائے پینے لگا۔ رات کی آمد کے ساتھ میری فکر بڑھنے لگی کہ شولیکھا کا ڈرامہ پھر شروع ہو جائے گا۔ ابھی میں اسی سوچ میں تھا کہ شولیکھا نے آواز دی۔ ''ریکھا! ان کو باہر لے آؤ سنیل دا آئے ہیں۔''

پتا نہیں یہ سنیل کون ہے۔ میں یہ سوچتا ہوا باہر آ گیا۔ باہر آ کر دیکھا تو ایک خوش پوش شخص کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''میں تو تمہارے آنے کا سن کر ہی دوڑا چلا آیا۔ شادی کے وقت میں ڈیوٹی پر تھا پھر جتنی بار چھٹی پر آیا تم نہیں ملے۔ اس بار حسن اتفاق کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔'' وہ کسی ریڈیو کی طرح بولے چلا گیا۔ ''ارے میں نے تم سے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔ میں ریکھا کا موسیرا بھائی ہوں۔ صبح تمہارے ساتھ انیل تھا نا وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔''

میں نے پرنام کرنے کے لیے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اچھا تو وہ ریکھا کا رشتے دار تھا، جسے میری نگرانی کے لئے لگایا گیا تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں انگلش اخبار تھا۔ میں نے بے تکلفی سے وہ اخبار لیتے ہوئے کہا۔ ''کئی دن سے میں نے اخبار نہیں پڑھا ہے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں، لے لو۔ ویسے بھی میں پڑھ چکا ہوں۔'' اس نے اخبار دیتے ہوئے کہا۔

اخبار لے کر میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ پہلی ہی خبر چونکا دینے والی تھی۔ خبر کے مطابق ''پاکستانی پریزنرز آف وار جنہیں ایک کیمپ میں رکھا گیا تھا ان میں سے دو فرار ہو گئے ہیں۔''

یہ خبر میرے دل کو لگی۔ میں نے سوچ لیا کہ میں انہیں تلاش کروں گا، ان تک پہنچوں گا۔ ان کی مدد کرنا ایک طرح سے میری ڈیوٹی تھی۔ پھر وہ ساتھ ہوں گے تو اس سرزمینِ کفار سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے میں آسانی رہے گی۔ مگر یہ آسان بھی نہیں تھا۔ ان دونوں کو اتنے بڑے ملک کے اتنے سارے شہروں میں کھوجنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاشنے کے برابر تھا۔ پھر میں انہیں شکلاً پہچانتا بھی نہیں تھا۔ انہیں کبھی دیکھا بھی نہیں تھا کہ نظر پڑتے ہی انہیں پہچان لیتا۔

پھر بھی میں نے سوچ لیا تھا کہ ان کو ڈھونڈ کر دم لوں گا اور اس کے لیے مجھے یہاں سے نکلنا ضروری تھا اور ریکھا کے گھر والے اکٹوپس کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ جبکہ ان کے درمیان نہ تو میرا ایمان سلامت تھا اور نہ عزت۔ کب کیا حرام کھلا دیں کچھ پتا نہ تھا۔ یہ تو میری عقل مندی تھی کہ اب تک خود کو بچائے ہوئے تھا۔ مرغی خود ذبح کرتا۔ بکرے کا گوشت شہر کے اکلوتے قسائی سے لے کر آتا۔ جس پر ریکھا کی ماں خوب ناک بھوں چڑھاتی۔ میں نے سنا تھا کہ بھارت بھر میں ہندو قسائی نام کو ہیں۔ پھر بھی میں زیادہ تر سبزی کھاتا۔ رہا سوال عزت کا تو وہ بھی اب تک محفوظ تھی۔

شولیکھا جب بھی آگے بڑھتی میں کبھی سینہ پکڑ کر کھانسنے لگتا اور کبھی بچی کو چٹکی کاٹ لیتا وہ اٹھ کر آسمان سر پر اٹھا لیتی ایک ماں کے لیے بچی کو خاموش کرانا زیادہ ضروری ہے اس لیے میں اس کے ذہن سے دور ہو جاتا اور مزے سے کروٹ بدل کر سو جاتا۔ حالانکہ کافی دیر تک مجھ پر وہ وقت بہت بھاری گزرتا مگر ایمان تو بچ جاتا۔ بیماری کا بہانہ بھی کام کر رہا تھا۔ اس مقام پر شولیکھا ہی نہیں ریکھا بھی پیچھے نہیں تھی۔ وہ بھی اپنا داؤ آزما رہی تھی۔

ابتدا میں مَیں نے یہی سمجھا تھا کہ سالی بہنوئی کا رشتہ مذاق کا ہے اس لیے وہ مذاق میں آگے بڑھ جاتی ہے۔ ایسا برتاؤ کرتی ہے۔ مگر جب حقیقت سامنے آئی تو میں سکتے میں رہ گیا۔ یہ راز بھی اسی نے کھولا تھا۔ وہ بھی اتفاقیہ۔ ہوا یہ تھا کہ ہر بار کی طرح میں اس کی شرارت سے تنگ آ کر گھر سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ ابھی میں دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اس نے راستہ

روک لیا۔ وہ جگہ ہی ایسی تھی کہ وہاں رکنا وہ بھی اس کے ساتھ مجھے عجیب سا لگا تھا۔ عام بنگالی گھروں کی طرح اس گھر کا بھی دروازہ سامنے سے آڑ میں تھا۔ یعنی دروازے کے سامنے ایک قد آدم دیوار تھی جس کی وجہ سے دروازہ کھلتے ہی آنگن دکھائی نہیں دیتا تھا گویا دروازے اور دیوار کے درمیان ایک گلی سی بن جاتی تھی۔ اس گلی میں ہی اس نے مجھے روکا تھا۔ میں اسے سامنے دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ اس نے میرا راستہ روک کر کہا۔ ”ایسا لگتا ہے مجھے پہچانتے ہی نہیں۔“ پھر نہایت بے حجابی سے میرے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھا اور نہایت تیزی سے میرے چہرے پر جھک گئی۔ اس حرکت نے مجھے مزید بوکھلا دیا تھا۔ میں جھٹکے سے پیچھے ہٹا تھا۔ میری پیٹھ دیوار سے جا لگی تھی۔ یہی ایک ایسا موقع ہوتا ہے جب بہادر سے بہادر آدمی بھی چوہا بن جاتا ہے۔ میں بھی برف کا گولا بن گیا تھا۔ دماغ ماؤف، قوت سلب ہو گئی تھی۔ زبان نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ ”یہ...... یہ...... کیا...... کیا......“

”جمائی دا (دولہا بھائی) اتنے شرمیلے تو بیماری سے پہلے نہیں تھے۔ کہیں دیدی کو بھی تو اوپواس (روزہ) نہیں کرا رہے ہو۔“ اس نے بے شرمی کی حد کر دی تھی۔ میں شرم سے گڑا جا رہا تھا۔ جواب نہ بن پڑا تو گھبرا کر بولا:

”کوئی دیکھ لے تو کیا کہے گا۔“

”اے ہے...... اتنے شریف تو کبھی نہ تھے۔ بھول گئے...... جب شانتا کی پیدائش پر ماں کے ہاتھ پیر جوڑ کر مجھے لے گئے تھے کہ مجھے چھٹی نہیں مل رہی ہے جب شولیکھا اسپتال چلی جائے گی تو گھر کا کیا ہو گا۔ کوئی تو ہو جو گھر کو دیکھے۔ ماں آپ نہیں جاسکتیں تو ریکھا کو بھیج دیجیے اور جب میں وہاں جا کر رہی تو تم نے کیا کیا۔ کیسے کیسے لالچ اور دھمکی سے مجھے زیر کیا...... بھول گئے کتنا ستایا کرتے تھے۔ واپس چھوڑ کر گئے پھر بھی چین نہیں تھا۔ مہینے میں ایک چکر ضرور لگاتے۔“ اس نے میرے داہنے کان کو کھینچ کر کہا۔ ”اب یہ معصومیت کا نقاب اتار دو۔ دیدی ہر وقت نظر نہیں رکھتی جب بھی موقع ملے۔ دیدی سو جائے میرے کمرے میں آجانا، سمجھے مادھو رام!“

جب کوئی جواب بن نہ پڑا تو میں جلدی سے باہر نکل گیا۔ باہر آکر بھی میرے تنفس کی رفتار بے لگام رہی۔ کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آتی رہیں۔ کچھ بھی ہو میں مرد تھا۔ نئی دلہن سے دور تھا۔ ایک ڈیڑھ ہفتہ تک دلہن کے ساتھ رہا تھا اس لیے عورت کی اہمیت معلوم تھی۔

اسی وجہ سے زیادہ ڈر رہا تھا۔ شیطان کسی بھی وقت شکست دے سکتا تھا۔ کسی بھی وقت میرے اندر کا آدمی خدا کا ڈر بھلا سکتا تھا۔

جسم کی پکار کو ختم کرنے کے لیے میں تیز تیز بھاگنے کی رفتار سے چلنے لگا، یہ کوئی بڑا شہر تو تھا نہیں چھوٹا سا شہر تھا، چھوٹا سا بازار تھا۔ بازار میں چھوٹی بڑی دو ڈھائی سو دکانیں تھیں۔ مختلف قسم کی گھریلو اشیا کی دکانیں۔ بارڈر نزدیک تھا۔ بارڈر کے اس پار سے چھوٹے موٹے اسمگلر آتے جاتے کچھ نہ کچھ خرید لیتے تھے، گویا یہ بازار مقامیوں کا نہ تھا۔ اسمگلروں کا تھا۔ بازار کے دکان دار بھی مجھے پہچاننے لگے تھے۔ کئی ایک نے ہاتھ جوڑ کر پرنام بھی کیا تھا۔ میں نے بھی انہی کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر پرنام کہا تھا۔

آگے بڑھتے بڑھتے میں کافی دور چلا آیا تھا۔ تبھی میری نظر ایک چائے کی دکان پر پڑی تھی۔ میں اس دکان کے باہر بچھے بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔ مجھے بیٹھا دیکھ کر چائے والے نے ایک چھوٹے سے گلاس میں چائے انڈیلی اور میری طرف بڑھا دی۔ میں نے داہنے ہاتھ سے چائے کا گلاس پکڑا۔ ہاتھ بڑھانے میں مَیں احتیاط کرتا تھا کیوں کہ بنگالی ہندو ہر کام میں داہنا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ کھانے کی چیز کو تو کبھی بھی بائیں ہاتھ سے نہیں پکڑتے۔

چائے لے کر بیٹھا ہی تھا کہ میری نظر اخبار پر پڑی۔ یہ ایک عام سی بات تھی۔ چائے کی دکانوں میں اخبار ضرور رہتا ہے کیوں کہ اخبار پڑھنے کے لیے بھی لوگ چائے کی دکانوں کا رخ کرتے ہیں۔ مگر میرے ساتھ یہ مجبوری تھی کہ میں بنگلہ پڑھ نہیں سکتا تھا۔ سمجھ ضرور لیتا تھا۔ اخبار کا لطف کیسے لوں، میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ ایک نوجوان نے اخبار اٹھا لیا۔ میں اس کے اور نزدیک کھسک گیا اور بولا۔ ”بھائی کوئی خاص خبر؟“

”خبر کیا ہو گی۔ بس وہی ایک جیسی خبر، نیتاؤں کا بیان، قیمتوں کا بکھان، ریپ، مرڈر اور ڈاکے کی خبر۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”اور کوئی خبر؟“ میں نے پوچھا۔

”دو پاکستانی فوجی کیمپ سے فرار ہو گئے ہیں۔“ اس نے کہا۔

یہ خبر ایسی تھی جس نے مجھے احساس کرایا جیسے میں اسی خبر کی تلاش میں نکلا تھا۔ اسی لیے مزید آگے کھسک گیا اور بولا۔

”اچھا! تو کیا وہ بھاگ کر پاکستان پہنچ گئے؟“

"خبر کے مطابق وہ بنارس کے نواح میں دیکھے گئے ہیں۔" نوجوان نے متن پر نظریں جمائے جمائے کہا۔

"بنارس تو یہاں سے بہت دور ہے۔" میں نے یوں کہا جیسے وہ شہر میرا دیکھا بھالا ہو جب کہ میری ستر پشت میں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

"ہاں دور تو ہے مگر حیرت ہے کہ وہ اتنے کڑے پہرے میں سے فرار کیسے ہوئے۔" نوجوان نے سر اٹھا کر کہا۔

"خیر! یہ بتاؤ وہ بنارس سے نکل کر کہاں جا سکتے ہیں؟"

"یوں تو آس پاس بہت سے شہر ہیں مگر وہ شاید ہی کہیں رکیں۔ وہ سیدھا پاکستانی بارڈر کا رخ کریں گے یا پھر نیپال جائیں گے۔ نیپال میں پاکستانی سفارت خانہ ہے انہی کی مدد سے وہ باہر نکل سکتے ہیں۔" نوجوان خاصہ تیز لگا۔

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک فوجی ٹرک گزرا۔ یہ ایک معمول کی بات تھی۔ بارڈر نزدیک ہونے کی وجہ سے فوجی ٹرک گزرتے ہی رہتے تھے پھر بھی میں سنبھل گیا۔ وہ پھر اخبار پر جھک گیا۔ تبھی میری نظر ایک نوجوان پر پڑی۔ وہ مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔ چائے ختم ہو چکی تھی۔ اب وہاں بیٹھنا بے کار تھا۔ اس لیے میں بھی اٹھ گیا اور ٹہلنے کے انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ میری چھٹی حس بیدار ہوئی، مجھے اشارہ دیا کہ کوئی مجھے گھور رہا ہے۔ یہ خوبی ہر انسان میں ہوتی ہے کہ وہ نظروں کی چبھن فوراً محسوس کرتا ہے۔ میں نے بھی محسوس کر لیا تھا اور جھٹکے سے مڑ گیا تھا۔ وہی لڑکا میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ بارڈر ایریا میں مخبروں کی بہتات ہوتی ہے۔ پولیس کے مخبر، بارڈر سیکورٹی فورس کے مخبر اور فوجیوں کے مخبر۔ شاید یہ بھی کوئی مخبر تھا اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ بنگالیوں کے درمیان ایک غیر بنگالی کیسے آ گیا ہے۔ یہی اس کے شک کا محرک ہوگا۔

میں نے اس پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور گورانگو نامی دکاندار کی دکان میں داخل ہو گیا۔ یہ دکاندار ریکھا کا پڑوسی تھا اور مجھ سے کئی بار مل چکا تھا اس نے مجھے دیکھا تو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے لگا۔ میں نے جواب میں پرنام کیا اور ایک طرف رکھی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے فوراً ہی لڑکے کو چائے لانے دوڑا دیا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا وہ نوجوان لڑکے کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا میں سمجھ گیا کہ وہ اس سے میرے متعلق پوچھے گا۔ میری پوزیشن مستحکم تھی اس لیے مجھے

خوف نہ تھا۔ وہ سر پٹخ کر مر بھی جاتا تو اسے حقیقت کا ادراک نہ ہوتا۔ میں نے مسکراتے ہوئے نظریں موڑ لیں اور گورانگو کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بے چارا سرتاپا بچھا جا رہا تھا۔ پہلی بار اس کی دکان میں آیا تھا لیکن اس اشتیاق کی وجہ کچھ اور تھی جس کا مجھے اندازہ تھا۔ وہ ریکھا کی طرف ملتفت تھا۔ شاید ریکھا بھی ہو کیونکہ وہ جس قماش کی لڑکی تھی اس سے یہ بعید نہیں تھا۔ ایسی لڑکیاں ہمارے پاکستان میں بھی مل جاتی ہیں کیونکہ شیطان وہاں بھی تو گل کھلاتا ہے مگر میں ایسی لڑکیوں پر ہمیشہ لعنت بھیجتا رہا ہوں۔ خیر یہ ان دونوں کا فعل تھا مجھے اس سے کیا کہ میں تو یہاں مسافر کی حیثیت سے ٹھہرا تھا۔ آج تیسرا دن تھا۔ قسمت نے موقع دیا تھا۔ آج یا کل مجھے ان سے پیچھا چھڑانا ہی تھا۔ آگے جانا ہی تھا۔

ابھی میں سوچ میں گم تھا کہ لڑکا چائے لے آیا۔ ہمارے خیال میں بنگال خواہ وہ مغربی بنگال (بھارت) ہو یا مشرقی بنگال (مشرقی پاکستان) چائے بکثرت پی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنگال میں ملیریا عام ہے اور ملیریا کا توڑ چائے ہے۔ میرے پوچھنے سے پہلے ہی لڑکے نے بتا دیا کہ وہ نوجوان اس سے میرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ یہ سن کر گورانگو نے ایک موٹی سی گالی دی کہ یہ سالا پولیس کا مخبر ہر نئے چہرے کو تاڑتا ہے۔ بزنس چوپٹ کرنے پر تلا ہے۔

میں نے وہاں زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا اور دکان سے باہر نکل آیا۔

باہر آ کر میں ندی کی طرف جا رہا تھا کہ پھر ایک بار چونک گیا۔ ایک قد آور شخص بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اسے یوں اپنی جانب دیکھتے پا کر میرے دل میں خوف سا محسوس ہوا۔ کچھ بھی ہو میں دشمن کی سرزمین پر تھا۔ ایک عجیب انداز میں تھا۔ اس لیے میں نے قدم تیز کر دیئے۔ کچھ آگے بڑھا تھا کہ احساس ہوا جیسے وہ اکیلا نہیں ہے اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی ہے۔ یہ میرے لیے اور بھی پریشانی کا باعث تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ کنکھیوں سے دیکھا تو ان کے قدم بھی تیز ہو گئے تھے۔ میرے اور ان کے درمیان فاصلہ گھٹ رہا تھا۔ میری سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ جسم میں ایک سرد سی لہر کے دوڑنے کا احساس ہوا۔ میں نے چشم تصور میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کو دیکھا، جائزہ لیا تو حالتِ زار اور بھی دگرگوں ہونے لگی۔ یقیناً یہ دونوں رہزن ہیں۔ اگر ان دونوں نے بیچ سڑک پر، بھرے بازار میں مجھے بچھا دیا تو؟ لوگ تماشہ بنا لیں گے، ہو سکتا ہے کوئی پولیس والا پکڑ کر تھانے لے جائے اور پھر......

آگے کا تصور بھی لرزہ خیز تھا۔ پیٹھ پر الٹی سیدھی لکیریں ڈلوانا میری قوتِ برداشت سے باہر تھا۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ میں پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ مجھے پتا تھا یہیں کہیں انیل بھی ہوگا۔ وہ دور سے مجھ پر نظر رکھے ہوگا۔ ریکھا نے خصوصی طور پر اسے ہدایت دے رکھی ہے کہ وہ مجھے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دے، مگر میری ڈانٹ کی وجہ سے وہ دور دور رہتا تھا۔ پھر بھی میں پریشان ہو گیا تھا کہ وہ آدمی جس طرح پیچھا کر رہا ہے یہ خطرے کی نشانی ہے۔ میں اسی جگہ کھڑا ہو گیا۔ تاکہ جو ہونا ہے ہو جائے۔ وہ شخص قریب آ گیا۔ اس کے ساتھ جو دوسرا شخص تھا وہ آگے بڑھ گیا۔ میں اپنی بے وقوفی پر ہنسنے لگا کہ خواہ مخواہ میں نے اس آدمی کو اس کا ساتھی سمجھ لیا تھا۔ وہ شخص میرے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی تیز نظریں میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔ وہ حیرت بھری نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ پھر اس نے استعجابی لہجے میں کہا۔ ''آپ یہاں؟''

اس جملہ پر میرا دل دھڑک اٹھا۔ بنگالیوں کے درمیان اردو بولنے والا؟ میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی ایسا بندہ ہے جو میرے ماضی سے واقف ہے۔ بحیثیت پاکستانی پہچانتا ہے۔ یہ ایک خطرناک بات تھی۔ مجھ سے میری پناہ چھن سکتی تھی۔ ابھی میں کچھ کہتا کہ وہ بولا۔ ''آنند بابو آپ نے تو سنسار تیاگنے کی بات کی تھی۔ برھم چاریہ کے پالن کی بات کی تھی۔'' اس کے سوالیہ جملے نے میرے اندر اٹھتی خوف کی لہر کو تھپکی دی۔ میں مطمئن ہو گیا کہ یہ میرے ماضی نہیں حال کا واقف کار ہے۔ مگر سوچ کے دَر بھی کھول گیا۔

مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر وہ بولا۔ ''آپ نے سوامی جی سے وعدہ کیا تھا آپ گھر، سنسار، موہ ممتا سب سے منہ موڑ لیں گے، برھم چاریہ کا پالن کریں گے۔''

میں نے پہلی بار زبان کو حرکت دی۔ ''شاید تمہیں علم نہیں، میں مرتے مرتے بچا ہوں۔''

تبھی کسی جن کی طرح انیل نمودار ہوا، شاید وہ شروع سے تعاقب میں تھا مگر سامنے نہیں آیا تھا۔ اب اس نے مداخلت کرنا ضروری سمجھا تو وہ تیز تیز قدموں سے آگے آیا اور اس شخص سے بولا۔ ''کی بپار؟ (کیا بات ہے)

اس نے اردو میں کہا۔ ''میں بنگلہ نہیں جانتا۔ ہندی میں بولیں۔''

انیل نے کہا۔ ''ان سے کیا پوچھ رہے ہو؟''

''میں آنند بابو کا پرانا متر ہوں۔''

''اچھا اچھا، آیئے چائے پیتے ہیں۔'' اس نے بنگالی معاشرے کے مطابق دعوت دی۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ آپ کی چائے بھی پیوں گا۔ آنند بابو سے بہت سی باتیں کرنا ہے۔'' پھر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔'' آنند بابو بتا رہے تھے ان کے ساتھ کوئی حادثہ ہوا ہے۔''

''ہاں ان کے ساتھ بہت بڑا حادثہ ہوا ہے۔ یہ اسٹیمر سے پانی میں گر گئے تھے۔ گرتے وقت وہیل، پنکھے یا پتوار سے ٹکرا گئے تھے۔ سر ٹکرایا تھا۔ یہ بے ہوش ہو کر پانی پہ بہتے رہے۔ مچھیروں کی نظر پڑ گئی اور ان لوگوں نے نکال لیا۔ مچھیرے انہیں لے جا رہے تھے کہ میں نے دیکھ لیا اور گھر لے آیا۔ سر کی چوٹ کی وجہ سے یہ اپنی یادداشت کھو بیٹھے۔ ماضی کی کوئی بات انہیں یاد نہیں۔''

''اوہ تب تو یہ بہت برا ہوا۔ ایک ماہ پہلے کی بات ہے ہمارے جلپائی گوڑی میں ایک یگ (اجتماع) ہوا تھا۔ یگ میں پروچن (تقریر) دینے کے لیے پٹنہ سے سوامی ستانند جی مہاراج آئے تھے۔ ان کے پروچن سن کر یہ اتنے پربھاویت (متاثر) ہوئے کہ برھم چاریہ پالن (راہبانہ زندگی) کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ تمام دوستوں نے بہت سمجھایا۔ اونچ نیچ سمجھائی مگر یہ کسی کی سن کر نہ دیئے۔ سوامی جی کے آشرم میں جانے کی تیاری کر لی اور ایک دن بغیر کسی کو کچھ بتائے جلپائی گوڑی سے نکل لیے۔''

اس کی بات سن کر کچھ اطمینان ہوا، بات سمجھ میں آ گئی کہ یہ بھی خدا کی قدرت ہے کہ اس نے ایک شکل کے دو انسانوں کو بنا دیا۔ ایک کو پاکستان میں اور دوسرے کو ہندوستان میں۔ ان دونوں کو اس طرح ہمشکل بنایا کہ بیوی بھی دھوکا کھا گئی۔ دو راتیں گزر چکی ہیں اور پہچان نہیں پائی۔ اب میں اس بات پر شکر ادا کر رہا تھا کہ شولیکھا کے بہت قریب نہیں گیا۔ حدود و قیود کو نہیں توڑا ورنہ پھنس گیا ہوتا۔ شکل مل رہی تھی جسم نہیں۔ کوئی نہ کوئی ایسی نشانی ضرور ہوتی جو بھانڈا پھوڑ دیتی۔

واقعی مذہب کی پابندیاں بڑے کام کی ہیں، اگر میں مذہب کا پابند نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ بیوی پھر بیوی ہوتی ہے۔ ہر مُوئے تن سے آشنا ہوتی ہے۔ اگر میں بھی جذبات کا غلام ہوتا۔ شیطان کا پیرو ہوتا، حرام حلال کی تمیز نہ رکھتا تو ایسی محفوظ پناہ گاہ کوئی دیتا؟ یا پھر رات میں ایک قدم بھی آگے بڑھ جاتا تو وقتِ خاص میں ضرور وہ پہچان لیتی، پھر میں ہوتا، اس کی جوتی ہوتی۔ میرا حشر نشر ہو چکا ہوتا۔

مجھے سوچ میں گم دیکھ کر اس نے کہا۔ ''آنند بابو یاد کیجئے، میں ہمانشو ہوں۔ آپ کا سب سے قریبی دوست۔''

''آں ہاں!'' میں نے اداکاری کا جوہر دکھایا، ایسے جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

''ذہن پر زور دیجئے۔ میں چائے کا بیوپاری ہوں۔ پورے مغربی بنگال میں چائے سپلائی کرتا ہوں'' وہ پُرامید نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ایسے جیسے مجھے یاد دلا کر رہے گا پھر وہ انیل کی طرف مڑ کر بولا۔ ''اتفاق کی بات ہے میری کچھ پرانی تصویریں خراب ہو رہی تھیں۔ میں انہیں کلکتہ لے جا رہا ہوں تاکہ ٹچنگ کرا کے دوبارہ انہیں بنوا لوں۔ یادگار ہیں ناں! اگر وقت ہے تو میرے ہوٹل چلے چلئے۔ ایک دو تصویر میں آنند بابو بھی ہیں۔ اسے دیکھ کر شاید انہیں کچھ یاد آ جائے۔''

''چلئے!'' کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ''کس ہوٹل میں ٹھہرے ہیں؟''

''ہوٹل سواستیکا میں ٹھہرا ہوں، بل لینے آیا ہوں۔'' اس نے چائے کے پیسے دکاندار کو دیتے ہوئے کہا۔

''مگر مجھے ایک ضروری کام ہے۔'' انیل نے کہا۔

''ایسا کریں آپ انہیں کچھ دیر کے لیے میرے پاس چھوڑ دیں پھر آ کر لے جایئے گا۔''

''ہاں یہ صحیح ہے۔'' انیل نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ ملا کر واپس ہو گیا۔

میں اس شخص کے ساتھ قدم ملا کر چل پڑا۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا۔ کہیں یہ بھی یہاں کی سی آئی ڈی کی چال نہ ہو۔ یہ شخص محکمہ خفیہ کا اہلکار نہ ہو۔ مجھے پھنسا کر لے جا رہا ہو۔ یہ خیال دہلا دینے والا تھا مگر اب تو اوکھل میں سر دے ہی دیا تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہوٹل سواستیکا کا بورڈ نظر آ گیا۔ درمیانے درجے کا ہوٹل تھا مگر اس چھوٹے علاقے کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔

وہ مجھے ساتھ لیے ہوئے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ سیڑھیاں طے کر کے کمرا نمبر دو سو دس کے سامنے پہنچا۔ جیب سے چابی نکالی اور کمرا کھولا۔ صاف ستھرا کمرا تھا۔ ایک بیڈ اور ٹیبل تھا۔ ٹیبل پر سوٹ کیس رکھا تھا۔ اس نے انٹرکام پر چائے لانے کو کہا پھر مجھ سے بولا۔ ''بیٹھیے۔''

میں بیڈ پر بیٹھا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور دو آدمی داخل ہوئے۔ اندر آتے ہی انہوں نے

پھرتی سے دروازہ بند کیا اور پستول نکال لیا۔

پستول کی نال اٹھی ہوئی تھی۔ ایک نے مجھے اور دوسرے نے ہمانشو کو کور کر رکھا تھا۔

''آپ......آپ کون......کون ہیں؟ کیا چاہیے؟'' میں نے خوف زدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے پوچھا۔

ان میں ایک پستہ قد تھا اور دوسرا قدرے موٹا، اسی موٹے والے نے جھڑکنے کے انداز میں کہا۔ ''تم خاموشی سے بیٹھے رہو، تم سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ ہاں، اگر ہیرو بننے کی کوشش کی تو بات دیگر ہے۔ گولی اندر، دم باہر ہوگا۔''

''پھر......پھر آپ نے مجھ پر پستول کیوں تان رکھا ہے؟ مجھے تو جانے دیں، میں وعدہ کرتا ہوں، اب کبھی ان کے روم میں نہیں آؤں گا۔'' میں نے اس انداز میں کہا جیسے اب رو دوں گا۔ دراصل میں یہ پوز کرانا چاہتا تھا کہ میں ایک بے ضرر شخص ہوں۔

''کہانا، خاموشی سے بیٹھے رہو ورنہ نتیجے کے ذمے دار تم خود ہو گے۔'' پھر اس نے ہمانشو کی طرف مڑ کر کہا۔ ''کیوں بے، ابھی تک خاموش بیٹھا ہے؟ فٹافٹ روپے نکال۔''

''کون سے روپے؟'' ہمانشو نے پوچھا۔

''ہمیں ماموں سمجھ رکھا ہے۔ ہم ہر طرف نظر رکھتے ہیں۔ ہم سنڈیکیٹ کے لوگ ہیں۔ اس شہر میں کیا ہو رہا ہے، سب کی خبر رکھتے ہیں۔ آج تم نے گولڈن جنرل اسٹور اور سادھنا ٹی اسٹور سے جو پے منٹ لی ہے، وہ ہمیں چاہیے۔ گزشتہ بار ہی کہا تھا کہ یہاں کی آمدنی سے ہمارا حصہ دے کر جاؤ مگر تم نے فرار کا راستہ اپنایا اسی لیے اس بار بطور جرمانہ پوری پے منٹ دے کر جانا ہوگا۔''

سنڈیکیٹ کا نام سنتے ہی ہمانشو کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ یقیناً یہ کوئی مجرموں کا بڑا گروہ ہوگا۔ میرے لیے تو اس وقت مجرم اور شریف سب برابر تھے مگر ہمانشو بہت زیادہ ڈر گیا تھا۔ اس نے بلا حیل و حجت بیڈ پر بچھے گدے کو اٹھا کر نیچے سے ایک خوب پھولا ہوا لفافہ نکالا اور موٹے کی طرف بڑھا کر بولا۔ ''اکاؤنٹ پے چیک تو بینک میں جمع کرا چکا ہوں، نقد جو ملا ہے، وہ اس لفافے میں ہے۔''

موٹے نے لفافہ پکڑ لیا اور اس کے اندر دیکھنے لگا۔ دونوں کی نظریں لفافے پر مرکوز تھیں۔ میرے لیے یہ موقع کافی تھا، میں اگر اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا تو بے وقوفوں کا سردار

کہلاتا۔ اگر یہ دو تھے تو بھی میرے لیے تر نوالہ تھے۔ میری ٹریننگ پر حکومت نے پیسے خرچ کیے تھے۔ انسٹرکٹر نے اپنا تجربہ میرے اندر منتقل کیا تھا، اسی تجربے کو کام میں لانا تھا اور میں نے تجربہ آزمالیا۔ اپنے جسم کو سخت کیا اور جست لگادی۔ میں سیدھا ان دونوں پر گراتھا۔ میں نے ہاتھ پیر دونوں کو استعمال کیا تھا۔ میری لات موٹے کے ہاتھ پر پڑی تھی اور اس کے ہاتھ سے پستول جھٹک کے دور جا گرا تھا جبکہ داہنا ہاتھ پستہ قد کے ہاتھ سے ٹکرایا تھا اور اس کا پستول میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

میں نے گرتے ہی خود کو سنبھال لیا تھا اور پھرتی سے اٹھ بھی گیا تھا۔ موٹا گالیاں بکتا ہوا میری طرف بڑھا مگر میں تیزی سے دور ہٹ گیا تھا۔ وہ خود کو روک نہ سکا اور دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔

میں چاہتا تو پستول دکھا کر اسے روک سکتا تھا مگر یہ جنگل بیابان تو تھا نہیں، گولی چلتے ہی لوگ دوڑ پڑتے اس لیے میں نے اس پستول کو باتھ روم کے کھلے دروازے میں اچھال دیا اور خالی ہاتھوں سے انہیں سبق دینے پر تیار ہو گیا۔ جیسے ہی وہ مڑا، میں نے فوراً ہی پوری قوت سے گھونسا جڑ دیا۔ گھونسا سر پر پڑا تھا، میرا ہاتھ جھنجھنا اٹھا تھا۔ وہ گھونسا اس کے لیے کافی ثابت ہوا۔ وہ نیچے گرا تھا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔

اب مجھے دوسرے سے نمٹنا تھا۔ اس کو ڈھونڈنے کے لیے میں پیچھے کی طرف مڑا۔ اس نے ہمانشو کا گلا پکڑ رکھا تھا۔ یہ ایک نازک موقع تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی ہمانشو کو بہت مہنگی پڑتی۔ اس سے کیسے نمٹوں، یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرے دماغ میں انسٹرکٹر کا سکھایا ہوا ایک داؤ آ گیا۔ وہ وار کبھی کبھی بہت مہنگا بھی پڑتا ہے۔ انسان کی جان بھی چلی جاتی ہے، پھر بھی نے اسے آزمانے کی ٹھان لی۔ وہ وار جبڑے کے نیچے گردن پر کیا جاتا ہے۔ میں نے زور سے کہا۔

"بچنا......"

میری چال کامیاب ٹھہری اور اس نے میری طرف مڑ کر دیکھا۔ اس طرح اس کی گردن کا وہ مخصوص حصہ سامنے آ گیا۔ میں نے پوری قوت سے اس جگہ گھونسہ مارا۔ بس ایک گھونسہ کافی تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ کہاں پر کتنی قوت سے گھونسا مارنا چاہیے، یہ میرے سبق میں شامل تھا۔ انسٹرکٹر نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا، اسی سبق کے مطابق کام کر دکھایا تھا۔

اسے گرتا دیکھ جیسے ہمانشو کو ہوش آ گیا۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔ "تم نے بہت برا کیا۔ اب سنڈیکٹ والے ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس کا ایک ہی حل ہے کہ ہم یہ شہر جلد چھوڑ دیں۔ میں تو اپنا سامان تک چھوڑ جاؤں گا۔"

"اور......اور......میرا کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"تم بھی نکل لو۔ جہاں سینگ سمائے، بھاگ لو۔"

اتنی دیر میں میرے دماغ نے ایک نادر مشورہ دیا اور میں نے خوف زدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "یقین کریں، میں نے جان بوجھ کر ان سے پنگا نہیں لیا تھا، بس اپنی جان بچانے کے لیے حملہ کر دیا تھا۔ اب کیا ہوگا؟"

"جو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ سنڈیکٹ والے ہماری بوٹیاں بنا کر فریز کر لیں گے۔"

"یہاں سے نکل کر تم کہاں جاؤ گے؟"

"میں تو کلکتہ جاؤں گا، وہاں بھی ایک گھر لے رکھا ہے۔"

"اگر وہاں میرے لیے جگہ نکل سکتی ہے تو مجھے بھی ساتھ لے لو۔"

"کہا تو، وہاں بھی ایک گھر لے رکھا ہے۔ جب تک دل کرے، وہاں رہ لینا۔"

"تو پھر چلو، میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔"

"بھابی پریشان نہیں ہوں گی، ان کو تو بتا آؤ۔"

"وہ کسی طور مجھے جانے نہیں دے گی۔ میں کلکتہ پہنچ کر فون کر دوں گا۔"

"تو ٹھیک ہے، ہم ابھی والی ٹرین سے چل دیتے ہیں۔" کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

ہم ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اسٹیشن تک آئے۔ لوکل ٹرین چلنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ ہم ٹکٹ لے کر اندر جا بیٹھے۔

☆======☆======☆

ٹرین دوڑتی رہی۔ اسٹیشن پر اسٹیشن آتے رہے اور ہم اپنے اپنے خیالوں کھوئے رہے۔ میں خوش بھی تھا کہ اس جنجال سے نکل آیا۔ کُل دس دن وہاں گزارے تھے، تین دن ہوش میں، سات دن بے ہوشی میں مگر ایسا لگتا تھا جیسے دس صدیاں گزار آیا ہوں۔ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ ان کے گورکھ دھندے سے نکل آنے کی خوشی تھی۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ بے چاری شولیکھا کتنے ارمان سے دو دن پہلے شوہر سے ملنے آئی تھی۔ جلپائی گوڑی جو پتا

نہیں کہاں ہے، وہاں سے آئی تھی۔ اس نے کتنا چاہا کہ بیوی کا حق ادا کرے مگر اس کی تمام کوشش رائیگاں گئی۔ اسی طرح ریکھا، اس نے بھی کیا کیا جتن نہ کیے کہ مجھے رام کر لے، میرے ایمان کو ڈگمگا دے مگر خدا کا شکر ہے کہ میرا ایمان سلامت رہا۔ گناہ کے دلدل مجھے کھینچ نہ سکے۔

میرے گھر نہ پہنچنے پر دونوں ہی پریشان ہو گئی ہوں گی۔ ابھی میں سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ ہمانشو نے کہا۔ ”لو بھائی، کلکتہ تو آ گیا۔“ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

بالآخر سیالدہ کا اسٹیشن آ گیا۔ یہی اسٹیشن کلکتے کا تھا۔ ہمانشو نے بتایا کہ اس شہر کے دو مرکزی اسٹیشن ہیں، ایک سیالدہ اور دوسرا ہوڑہ۔

پلیٹ فارم سے باہر آ کر اس نے رکشا لیا۔ میں حیران نگاہوں سے رکشے کو دیکھنے لگا اس لیے کہ اسے ایک آدمی گھوڑے کی طرح کھینچ رہا تھا۔ میرا دل کھٹا ہو گیا۔ میں اس پر سوار ہونے پر تیار نہیں تھا مگر مجبوری میں سوار ہونا پڑا۔

کلکتہ میرے لیے نیا تھا۔ اب تک میں نے تین بڑے شہر دیکھے تھے، کراچی، لاہور اور ڈھاکہ مگر یہ شہر ان تینوں سے بڑا تھا مگر انتہائی گندا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کچرے کا ڈھیر۔ اس شہر میں آ کر اس بات کی خوشی تھی کہ یہاں اردو بولنے والے بہت زیادہ تھے جسے یہ لوگ ہندی کہتے تھے۔ لہجہ کیسا بھی مگر بات سمجھ میں آ جاتی تھی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر جس علاقے میں آیا تھا، اس کا نام شیام بازار تھا۔ وہاں بنگلہ بولنے والے زیادہ تھے مگر سب اردو سمجھ لیتے تھے۔

شیام بازار تنگ پتلی گلیوں کا مجموعہ تھا، انتہائی پتلی گلیاں جن میں نالے ابلے پڑ رہے تھے۔ وہاں ایک بھی مکان نو تعمیر نہ تھا۔ سب کے سب آزادی سے پہلے کے تھے، انتہائی خستہ۔ سب کے سب دو اور تین منزلہ تھے اور ایک ایک مکان میں کئی فیملی رہ رہی تھیں جس کا علم مجھے بعد میں ہوا۔

وہ مجھے لے کر جس بلڈنگ میں داخل ہوا، وہ بھی تین منزلہ تھی۔ نیچے کے حصے میں بہت ساری دکانیں تھیں۔ وہ تمام کی تمام دکانیں بند تھیں، شاید انہیں بطور گودام استعمال کیا جاتا تھا جب کہ اوپر لوگ رہ رہے تھے۔ دیودار کی لکڑی کا زینہ تھا۔ اس زینے سے ہم اوپر پہنچے۔ ایک بند دروازے پر ہمانشو نے دستک دی۔ بند دروازہ کھلا اور ایک ستائیس اٹھائیس سالہ عورت کا چہرہ نمودار ہوا۔ اسے حسین تو نہیں، ہاں قبول صورت کہا جا سکتا تھا۔ اس نے ہمانشو کو دیکھتے ہی خوشی کا اظہار برملا کیا۔ بولی۔ ”پورے ایک ماہ بعد آئے ہو۔“

ہمانشو نے اسے راستے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”اندر بھی آنے دو گی کہ باہر سے چلا جاؤں؟“

وہ مسکراتی ہوئی سامنے سے ہٹ گئی۔ وہ اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ میں بھی اندر داخل ہو گیا۔ اندر صرف دو کمرے تھے، اس نے ایک کمرے کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس کمرے میں تم آرام کرو، میں پارول کے گلے شکوے دور کر دوں۔“ پھر وہ مسکراتا ہوا دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔

کمرے کے اندر جاتے ہی میں نے خود کو بستر پر گرا دیا اور چھت سے لٹکے ہوئے پنکھے کو دیکھنے لگا۔ نظریں پنکھے پر تھیں مگر ذہن کہیں اور تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کچھ بھی ہو، ریکھا کا گھر غیر محفوظ تھا۔ کسی بھی وقت پول کھل سکتا تھا۔ چہرے میں مماثلت تھی، عادت اطوار پر یادداشت کھو جانے کا پردہ تھا مگر ایسی بہت سی باتیں تھیں جو میرا پول کھول سکتی تھیں۔ سب سے اہم بات کہ آنند کسی بھی وقت لوٹ سکتا تھا۔ اس خطرے سے نکل تو آیا تھا مگر پھر بھی غیر محفوظ تھا کیونکہ یہ دشمن کی سرزمین تھی، کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس ملک پر لعنت کہہ دینا چاہیے۔

ابھی میں سوچ میں گم تھا کہ ہمانشو ہنستا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے کھلے کھلے چہرے کو دیکھ کر میں نے پوچھا۔ ”ہمانشو دا، ہم اتنے بڑے خطرے سے بچ کر آ گئے ہیں مگر آپ کو دیکھ کر نہیں لگتا کہ آپ نے اس خطرے کو محسوس کیا ہے؟“

”میرے بھولے راجا! خطرہ پیچھے چھوٹ گیا۔ جو پیچھے رہ گیا، اسے قابل توجہ نہیں سمجھتا ہوں۔ یہ زندگی ہے اور زندگی نام ہے ہنستے رہنے کا۔“

”میں داد دیتا ہوں آپ کے حوصلے کی۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں تو ہر حال میں خوش رہنے والا ہوں۔“

”اسی لیے ابھی ہنس رہے تھے۔“

”ہنسی تو مجھے یوں آئی کہ پارول نے شکوہ کیا تھا۔ میرے دوست، اس دنیا میں جتنی بھی عورتیں ہیں، سب کا نیچر ایک ہے۔ میری بیوی نمبر چار یعنی پارول تنگی کی شکایت کر رہی تھی۔ میں پابندی سے ہر بیوی کو ایک ہزار روپے پہلی تاریخ کو بھیج دیتا ہوں مگر ابھی تک کسی کے منہ سے یہ نہیں سنا کہ پیسے بچ جاتے ہیں۔“

”مہنگائی دیکھ رہے ہیں، خرچ کے لیے اسے ضرورت تو پڑے گی۔ آخر بیوی ہے

تمہاری۔ اگر زیادہ دے دو گے تو کون سی قیامت آ جائے گی؟"

"ایک دو نہیں، میری چار بیویاں ہیں۔ سب کو برابر سے دینا پڑتا ہے صرف پہلی والی کو ڈیڑھ دیتا ہوں کیوں کہ اس کے دو بچے بھی ہیں۔"

"اتنی زیادہ بیویاں پالنے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"صاف سیدھی بات ہے، شہر شہر گھومتے ہیں، تھکن مٹانے کے لیے عیاشی ضروری ہے لیکن ہمارے جیسے لوگ عیاشی کے متحمل نہیں، اس لیے کہ پیسے خرچ کرنے کے بعد بھی ڈر رہتا ہے کہ پکڑے نہ جائیں جب کہ مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔ یہ میرا طریقہ واردات ہے۔ عیاشی کرو، دل بھر کر کرو اور کوئی روکنے والا نہ ہو۔ میں سب دوستوں سے زیادہ عیاشی کرتا ہوں، ہر ایک ڈیڑھ سال بعد پرانی کو چھٹی دے کر نئی لے آتا ہوں مگر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔"

اس کی نرالی منطق سن کر میں اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔ علاقہ نیا تھا۔ کون سا راستہ کہاں جاتا ہے، یہ بھی جاننا ضروری تھا اس لیے میں نے باہر جانے کا پروگرام بنایا اور ہمانشو سے بولا۔ "یار میں کافی عرصے بعد کلکتہ آیا ہوں، کتنا کچھ بدل گیا ہے۔ یہ دیکھنا ضروری ہے۔"

"تو جاؤ روکا کس نے ہے۔" ہمانشو نے ہنس کر کہا۔ "اس طرح مجھے بھی کچھ ٹائم اپنی بیوی کی ناز برداری کے لیے مل جائے گا۔"

"تمہیں اطلاع دینا بھی تو ضروری ہے اس لیے بتا رہا ہوں۔"

"میری طرف سے پوری اجازت ہے۔"

"اچھا تو میں چلا۔" کہہ کر میں باہر نکل آیا۔

سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ ہر طرف بھیڑ سی تھی۔ ہر ایک کو جلدی تھی۔ سب بھاگ رہے تھے۔ میں بھی اس بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ کافی دیر تک چلتا رہا پھر میں چائے پینے کے لیے ایک دکان میں داخل ہو گیا۔ کئی میزیں خالی تھیں۔ ایک میز پر میں بیٹھ گیا۔ ابھی چائے کے لیے کہا ہی تھا کہ ایک آدمی اور آ کر وہاں بیٹھا، اس نے بھی چائے کے لیے کہا۔ یہ کوئی انہونی بات تو تھی نہیں، اس لیے میں نے توجہ نہیں دی۔ اس نے جاتے ہوئے بیرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہاں کے بیرے بہت کام چور ہوتے ہیں، اگر میرا بس چلے تو میں سب کو پھانسی پر لٹکا دوں۔"

وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا اس لیے میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے مسکراتے دیکھ کر وہ بولا۔ "آپ ہنس رہے ہیں۔ سوچیں، اگر کسی کو ضروری کام سے جانا ہے تو وہ کیا کرے؟"

"یہ لوگ بھی کیا کریں، دوپہر کا وقت ہوتا ہی رش کا ہے۔" میں نے جواباً کہا۔

"شریمان جی، اگر یہ صحیح کام کریں تو رش کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ میں تو دس سال سے انہی کے ہاتھ کا کھا رہا ہوں۔ دراصل میرا کام ہی ایسا ہے۔ شہر شہر گھومنا اور مال سپلائی کرنا، ویسے آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

میں فوراً ہوشیار ہو گیا۔ وہ زبردستی اجنبیت دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسے لوگ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "میں علی گڑھ کے تالے کا آرڈر لیتا ہوں۔"

"ویسے آپ رہنے والے کہاں کے ہیں؟"

"لکھنو کا رہنے والا ہوں۔"

وہ میرے قریب کھسک آیا اور گردن جھکا کر سرگوشی میں بولا۔ "میرے جسم کے اوپر ایک سر ہے، اس سر کے اندر تھوڑا سا مغز بھی ہے، اور وہ مغز یہ کہتا ہے کہ نہ تو آپ لکھنو کے ہیں اور نہ آپ سیلز مین ہیں۔"

میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سفری سیلز مین باتونی ہوتے ہیں جو آپ نہیں ہیں۔ اس تمام عرصے میں آپ نے اتنا کم بولا جو سمجھا رہا ہے کہ آپ کو زیادہ باتیں کرنا پسند نہیں۔ اگر آپ لکھنو کے ہوتے تو آپ کا لہجہ یہ نہیں ہوتا جس لہجے میں آپ گفتگو کر رہے ہیں۔ ہر پرانت (صوبہ) کا لہجہ الگ ہوتا ہے۔ بنگال والے منہ گول کر کے، بہار والے منہ ہلکا سا گول کر کے، پوربی یوپی والے منہ کھول کر، لکھنو والے مٹک مٹک کر اور علی گڑھ والے ڈنڈا مار اسٹائل میں بولتے ہیں۔"

"مگر میری پیدائش لکھنو کی ہے۔" میں اپنے جھوٹ پر اڑ گیا۔

بیرا چائے لے آیا تھا۔ اس نے کپ اٹھا لیا۔

"خیر جانے دیں، آپ جہاں کے بھی ہیں، اس سے ہمیں کیا لینا۔" وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے بولا۔

مجھے اس کی باتوں سے خوف آنے لگا تھا۔ اس کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ چور کی ڈاڑھی میں

تنکا، وہی مثال صادق تھی۔ میں دشمن کی سرزمین پر تھا۔ ''کہیں یہ سی آئی ڈی والا نہ ہو؟'' میں نے دل میں کہا۔

''مہاشے جی، اگر اس شہر میں آپ نئے ہیں تو مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں، میں ایک اچھا دوست ثابت ہوں گا۔ میں قالین کا تاجر ہوں، مسلمان ہوں۔ نام شیر علی شیرو ہے۔ راجا بازار میں گھر ہے۔'' اس نے اپنا حدود اربع بتایا پھر جیب سے کارڈ نکال کر دیتے ہوئے بولا ''اگر کبھی ضرورت پڑے تو اس پتے پر آ جایئے گا، مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی ہوگی۔''

میں نے کارڈ لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر ضرورت پڑی تو میں ضرور آؤں گا۔''

''مجھے یقین ہے، ہم دوبارہ ضرور ملیں گے۔'' وہ اس طرح بولا جیسے وہ کوئی ماہر نجومی ہو، اسے غیب کا سو فیصد علم ہے۔

مجھے وہاں بیٹھنا دوبھر ہو رہا تھا۔ خوف نظر نہیں آتا مگر اس کے نوکیلے پنجے بے چین کر دیتے ہیں۔ میرے اندر بھی خوف اتر رہا تھا۔ اس لیے میں نے اٹھنے پر غور کیا اور چائے کے پیسے دینے کے لیے پاکٹ میں ہاتھ ڈالا تھا کہ وہ بولا۔ ''رہنے دیں، میں دے دوں گا۔''

میں تیز قدموں سے باہر نکل آیا تھا۔ میں چلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ آخر یہ شخص ہے کون؟ میں آگے بڑھتے ہوئے مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ ضرور اس کا تعلق سی آئی ڈی سے ہے اور میں ان کی نظروں آ چکا ہوں اور یہ مجھے جکڑنے کے لیے چھوٹ دے رہے ہیں۔ اپنے تعاقب سے بھی میں پوری طرح باخبر تھا مگر اب تک ایسا کوئی بندہ پیچھے نظر نہیں آیا تھا جس پر تعاقب کرنے کا شبہ ہوتا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں جتنی جلد ممکن ہو، یہاں سے بھی نکل جاؤں گا۔ ابھی میں کچھ ہی آگے بڑھا تھا کہ ایک شخص نے راستہ روک لیا۔ اس کے ہاتھ میں فوٹو البم تھا، اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''سر، میرے پاس اعلیٰ کوالٹی کا مال ہے، جہاں کہیے گا، میں پہنچا دوں گا۔ ریٹ بھی زیادہ نہیں ہے۔''

میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا تھا کہ وہ جھٹ البم کھول کر مجھے دکھانے لگا۔ ''یہ دیکھیے، نیپال سے صرف ایک ماہ پہلے لایا ہے۔ یہ دیکھیے، کشمیر کی کلی، یہ دیکھیے، کیرالہ کا حسن، یہ دیکھیے، مہاراشٹر کی خوب صورتی......'' ابھی وہ کچھ اور کہتا کہ عقب سے آواز آئی۔

''ابے بھوتنی کے، یہ میرا مہمان ہے، مجھے اگر نہیں جانتا تو جا کر کھوکن سے پوچھ لینا۔ اب بھاگ لے۔''

البم والا فوراً نو دو گیارہ ہو گیا۔ اس شخص نے مجھ سے کہا۔ ''اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ نہ صرف اس شہر میں اجنبی ہیں بلکہ بہت معصوم بھی ہیں۔ یہ تو یہاں کے لیے ایک عام سی بات ہے۔ اس شہر کلکتہ میں ایک دو نہیں، بیسیوں طوائف خانے ہیں، سونا گاچھی، ہرکاٹا گلی، چونا گلی، بوبازار، خضر پور، باٹا پور، کالی گھاٹ، ہاوڑا، دمدم وغیرہ وغیرہ۔ جب کمپٹیشن کی مارکیٹ ہو گی تو گاہک کو لبھانے کے لیے نئے نئے طریقے سوچنے پڑتے ہیں۔ یہاں کے غنڈوں کا سردار کھوکن میرا واقف کار ہے اسی لیے آپ بچ گئے ورنہ یہ زبردستی آپ کو کھینچ لے جاتا اور آپ کی جیب میں ایک پائی نہ بچتی۔''

میں منہ پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس نے کہا۔ ''آپ رہتے کہاں ہیں؟ چلیے، میں آپ کو اپنی بلٹ پہ چھوڑ دیتا ہوں۔''

بن گاؤں میں ہی معلوم ہو گیا تھا کہ بھارت میں ہنڈا، یاماہا وغیرہ نہیں چلتی۔ یہاں کی لوکل بائیک بلٹ، راج دوت اور ہیرو چلتی ہے۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''بس دو گلی آگے رہتا ہوں۔''

میں نے سوچا تھا کہ یقیناً وہ میرا گھر دیکھنا چاہتا ہے۔

''اچھی بات ہے مگر میں سمجھ نہیں پایا کہ آپ یہاں کیسے رہتے ہیں؟''

''کیوں، کیا یہاں شرفا نہیں رہتے؟'' میں نے الٹا سوال کر دیا۔

''شرفا ضرور رہتے ہیں مگر صرف ایک مذہب کے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ آپ ہندو نہیں ہیں۔''

میں اندر تک کانپ گیا، گویا میرا راز کھل چکا تھا پھر بھی اپنی بات پر اڑا رہا۔ ''جی نہیں، میرا نام آنند مشرا ہے۔''

''جی نہیں، آپ خود کو مشرا کہیں یا بترا، کچھ بھی کہیں مگر آپ ہندو نہیں ہیں اور یہ علاقہ مسلمانوں کے لیے خطرناک ہے۔'' اس کی باتیں مجھے الجھاتی جا رہی تھیں۔ وہ خود آ کر مجھ سے ملا تھا۔ زبردستی دوستی کرنے کی کوشش کر رہا تھا، بغیر کسی مفاد کے کوئی کسی سے نہیں ملتا، پھر وہ کیوں سر پر چڑھا آ رہا ہے؟ میں اسی سوچ میں تھا کہ اس نے کہا۔ ''اگر آپ یہاں خود کو محفوظ سمجھتے ہیں تو رہیں، ویسے میرا یہی مشورہ ہے کہ آپ کسی مسلم محلے میں شفٹ ہو جائیں۔ اگر میری مدد کی ضرورت سمجھیں تو بلا کھٹکے رابطہ کر لیں گے۔'' کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

میں ہمانشو کے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے یہی سوچے جا رہا تھا کہ اس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ اگر وہ سی آئی ڈی کا بندہ ہے تو پھر بہت زیادہ چھوٹ دے رہا ہے۔ میں اسی سوچ میں ڈوبا ہمانشو کے گھر میں داخل ہوا۔

ہمانشو گھر میں موجود تھا، اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''آپ آ گئے۔ کہاں تک گھوم آئے؟''

''محلے سے باہر نہیں گیا تھا۔''

''شہر دیکھ آتے۔ یہاں دیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ جادو گھر یعنی میوزیم، بوٹانیکل گارڈن، ایڈن گارڈن، ہوڑہ برج، کتنے نام لوں، ہر جگہ دلچسپی۔ اگر لڑکی سے دوستی کرنا ہے تو سیدھے ایڈن گارڈن چلے جاؤ، ہاتھ میں پرس نکال کر بیٹھ جاؤ، کوئی نہ کوئی لڑکی دوستی کے لیے قریب آ جائے گی۔ کسی سنیما ہال کے سامنے دو ٹکٹ لے کر کھڑے ہو جاؤ، دوستی کی دعوت فوراً قبول کر لی جائے گی۔ دراصل اس شہر میں عورت بہت سستی کر دی گئی ہے۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''یار، تم تو اس طرح بول رہے ہو جیسے پورا شہر طوائف خانہ ہے۔''

''بھئی، سیدھی بات ہے، لڑکیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ کمانے والے کم، مجبوراً لڑکیوں کو خود نکلنا پڑ رہا ہے۔ گھر سے باہر آنے کے بعد کمپیٹیشن۔ کوئی ہزار کی ساڑی پہنتی ہے تو دوسری بھی یہی خواہش کرتی ہے، اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتی ہے کیونکہ آج کے معاشرے میں ایسی باتوں کو برا تو سمجھتے ہیں مگر اتنی شدت سے نہیں، اور اسی بات کا فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔''

''یہ تو معاشرے کی تباہی ہے۔''

''جب سب برے ہوں تو پھر برے کو برا کون کہے؟''

''ہاں، یہ بات صحیح ہے۔''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتاؤ، بھابی کو فون کیا؟'' ہمانشو نے کہا۔

''فون کرنا یاد ہی نہیں رہا۔ اب کل کروں گا۔''

''ابھی کر دو تا کہ پریشانی تو کم ہو۔''

''لیکن نمبر تو اسکول کا ہے، ابھی وہ اسکول بند ہو گا۔''

''اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ خیر، کل یاد سے کر دینا۔'' اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ سیاست سے معاشرت تک، کوئی سبجیکٹ نہیں چھوڑا۔ جب رات زیادہ ہونے لگی تو وہ اٹھ گیا کہ۔ ''اب پارول نہیں بخشے گی۔ اس کا غصہ آسمان سے باتیں کر رہا ہو گا۔''

اس کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا۔ دراصل مجھے احساس ہو چکا تھا کہ میں یہاں بھی زیادہ محفوظ نہیں ہوں کیوں کہ میں انسان ہوں، انسان جو ہمیشہ سے غیر محفوظ رہا ہے۔ صحرا میں رہتا ہے تو پیاس مارے دیتی ہے۔ جنگل میں جاتا ہے تو درندے پھاڑ کھاتے ہیں اور شہر میں رہتا ہے تو لوگ تیا پانچہ کر دیتے ہیں۔ کبھی کسی تو کبھی کسی کے تعصب کا شکار ہونا پڑتا ہے کیوں کہ ہر انسان کے اندر بھی ایک انسان پاؤں پسارے رہتا ہے جو انسان نہیں ہوتا، درندہ ہوتا ہے اور موقع ملتے ہی جھپٹ پڑتا ہے۔ یہ لوگ مجھ پر بھی جھپٹ سکتے ہیں کیوں کہ اس علاقے میں بھی انسان ہی رہتے ہیں اور سب کے سب تعصب سے بھرے ہیں۔ میں مسلمان ہوں، اور یہ سب ہندو، ایسے ہندو جو میرے وطن کی پامالی پر شاداں ہیں، اس کے ٹکڑے ہونے پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے ہیں۔ میرے وطن کے سجیلے جوانوں کی گرفتاری پر مٹھائی بانٹ رہے ہیں۔ ان کی حرکات پر میں غمزدہ ہوں لیکن اپنے جذبات پر قابو رکھے ہوئے ہوں کیوں کہ میری ذرا سی غلطی مجھے گرفتار کرا سکتی ہے۔ ایک ہی دن میں احساس ہو گیا تھا کہ ان سے اچھائی کی توقع عبث ہے۔ قرآن نے بھی تو کہا ہے کہ یہود و نصاریٰ کبھی دوست نہیں ہو سکتے، یہ تو کافر ہیں، مسلمانوں سے انتہا درجے کی نفرت کرنے والے۔ ان سے کیسی توقع؟ خود ہمانشو کا دل بغض سے بھرا ہوا ہے۔ کچھ دیر پہلے کتنے ہتک آمیز لہجے میں بولے جا رہا تھا کہ ابھی تو ہم نے پاکستان کا ایک ٹکڑا چھینا ہے، ابھی دوسرا حصہ تو باقی ہے۔ اسی وقت میں نے دل میں کہا تھا۔ ''کمینے، سازش سے وہ حصہ ہتھیایا ہے، ہمارے ہی لوگوں نے ہماری پیٹھ پر چھری ماری ہے، اب ہم تیرے ملک کا حصہ بخرا کریں گے کیوں کہ پاکستان صرف ایک خطہ زمین نہیں، اسلام کا وہ قلعہ ہے جہاں کافروں کو بھی اماں ہے۔ یہ خدا کا عطا کردہ تحفہ ہے۔ شبِ قدر کو بخشا گیا تحفہ ہے۔ 27 رمضان کو عطا کردہ تحفہ ہے۔ اس تحفے کی قدر و قیمت اب ہمیں معلوم ہو چکی ہے۔ ہماری کوتاہی تھی کہ اب سے پہلے ہم نے غور نہیں کیا کہ خدا اگر نعمت دیتا ہے تو ہماری نااہلی پر اسے چھین بھی سکتا ہے۔''

وطن کے ٹکڑے ہو جانے کا غم مجھ سے زیادہ کس کو ہو گا؟ میں تو متاثرین میں سے تھا ورنہ

تو کسے بھی یہاں نہ آتا۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے میں نیند کی وادی میں کھو گیا۔

اگلے دن صبح ہی صبح ہمانشو نے کہا۔ ''تم آرام کرو مجھے بہت کام ہے، باراسات، باٹا پور، نگی، خضر پور، مٹیا برج وغیرہ جانا ہے، پارٹیوں سے ملنا ہے۔''

مجھے تو خود اس گھر میں بوریت ہونے لگی تھی۔ دن بھر اکیلے پڑے رہنا پڑتا تھا۔ کوئی بات کرنے والا بھی نہیں تھا۔ ہمانشو تو گویا پارول کے کمرے کا اسیر بن کر رہ گیا تھا۔ اس کمرے سے باہر نکلتا تو پارٹیوں سے ملنے چلا جاتا۔ اسی وجہ سے میں بوریت کا شکار ہو گیا تھا۔ میں نے جب یہ سنا کہ وہ جا رہا ہے تو کہا۔ ''یار، میں بھی شہر دیکھنے نکل رہا ہوں۔''

''اچھی بات ہے، شام میں ملاقات ہوگی۔'' کہہ کر وہ چلا گیا تو میں نے بھی باہر جانے کی تیاری کر لی۔

☆======☆======☆

باہر آیا تو سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی، خوب گہما گہمی تھی، میں بھیڑ کا حصہ بنا آگے بڑھتا چلا گیا۔ وقت گزرتا رہا۔ کافی دیر تک بازار کی رونق سے لطف اندوز ہوا پھر وہاں سے ٹرام پکڑ کر دھرم تلہ چلا گیا۔ دھرم تلہ پہنچ کر میرا دل خوش ہو گیا۔ شہر کا قلب، ٹرام کا مرکزی اسٹیشن اور اس کے سامنے مسجد۔

مسجد دیکھ کر مجھے کیسی خوشی محسوس ہوئی، اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کا احساس صرف ان لوگوں کو ہو سکتا ہے جو پاکستان سے دور کسی غیر مسلم ملک میں رہ رہے ہوں۔ میں خوشی سے سرشار مسجد کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ مسجد کے اطراف کی دکانوں میں نمایاں طور پر طغرے لگے نظر آئے۔ شاید یہ پہچان تھی کہ یہ دکان مسلمان کی ہے۔ ایک ہوٹل میں سیخ کباب لگ رہے تھے۔ خوشبو نے اشتہا بڑھا دی اور میرے قدم خود بخود اُدھر اُٹھتے چلے گئے۔ کباب پراٹھے سے سیر ہو کر میں باہر آیا، تبھی مسجد سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی تو مجھے یاد آ گیا کہ آج جمعہ ہے۔ سجدۂ شکر کے لیے میرے قدم ادھر اُٹھتے چلے گئے۔

نماز سے فارغ ہو کر میں باہر آیا۔ سامنے ایک بڑا سا مینار تھا۔ میں اسی طرف بڑھنے لگا۔

اس مینار پر لکھا تھا۔ ''1857ء کے شہیدوں کی یاد''

اس مینار کے اطراف میں باغیچہ بنا تھا۔ میں ایک پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر بہت سارے لوگ بیٹھے تھے۔ ہمانشو کا کہا سچ نظر آ رہا تھا۔ ہر پیڑ کے نیچے لڑکیاں لڑکے بیٹھے

گپیں لگا رہے تھے۔ وہاں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور شام گھر آئی۔ وہیں سے شیام بازار کے لیے ٹرام پکڑی اور واپسی کے لیے چل پڑا۔

شیام بازار میں اتر کر بھی ہمانشو کے گھر جانے کو دل نہ چاہا پھر بھی میرے ذہن میں کوئی خاص جگہ نہ تھی، بس وقت گزاری کے لیے چل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے میں کافی دور آ گیا۔ ایک جگہ بہت سارے لوگوں کو جمع دیکھا تو تجسس کی وجہ سے میں بھی ادھر ہی چل پڑا۔ نزدیک جا کر دیکھا تو زمین پر ایک آدمی بیٹھا تاش کے تین پتے الٹائے لوگوں کو دعوت دے رہا تھا کہ بازی لگائیں۔ لوگ آٹھ آنہ، ایک روپیہ لگا رہے تھے، کچھ جیت رہے تھے اور کچھ ہار رہے تھے۔ ایک شخص نے پان کے اکے پر پانچ روپے لگا دیئے۔ جب پتہ الٹا تو وہ دوسرا پتہ تھا، حکم کا غلام تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تھا اس لیے اس کی چالاکی پکڑ لی تھی۔ اس نے نہایت چالاکی سے پان کے اکے کو پیر کے نیچے دبا کر دوسرے پیر کے نیچے سے حکم کا غلام نکال لیا تھا۔ بازی لگانے والے نے بھی اس کی چالاکی کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے احتجاج کیا تو اسے دھکے دے کر ایک دوسرے شخص نے بھگانا چاہا۔ وہ اڑ گیا کہ اس کے روپے واپس کیے جائیں مگر اس کی سنتا کون، الٹے اسے طمانچہ جڑ دیا گیا۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں نے اس کی طرف داری میں کہا کہ یہ تو کھلی بے ایمانی ہے۔ میرا اتنا کہنا غضب ہو گیا، کئی آدمی مجھے مارنے کی دھمکی دیتے ہوئے آگے بڑھے تھے کہ ایک گرجدار آواز سنائی دی۔ ''اوئے...... کیا ہو رہا ہے؟''

میں نے چونک کر ادھر دیکھا، وہ ایک قد آور شخص تھا، انتہائی کالا، اس کا داہنا کان کٹا ہوا تھا، اس کے للکارنے پر سب لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ اس نے بنگلہ میں مجھ سے کہا۔ ''چل یہاں سے بھاگ لے ورنہ آنتیں باہر نکل آئیں گی۔''

مجھے لڑنا جھگڑنا تو تھا نہیں اس لیے خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد مجھے چائے کی ایک دکان نظر آئی۔ ستانے کے لیے میں اس میں داخل ہو گیا۔ ابھی میں نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ وہی قد آور شخص اس دکان میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی دکان میں بیٹھے لوگ خوف زدہ سے دکھائی دینے لگے۔ کچھ لوگ تو اٹھ کر باہر چلے گئے اور کچھ خوف کے عالم میں بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ وہ شخص کسی طرف نظر ڈالے بغیر سیدھا کاؤنٹر کی طرف بڑھا اور پھر کاؤنٹر پر بیٹھے شخص کو گریبان سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ وہ شخص ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا مگر گریبان پکڑنے والے کو اس پر رحم نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کاؤنٹر

والے کو زمین پر گرا کر لاتوں سے دھنائی شروع کر دی۔ یہ ظلم مجھ سے دیکھا نہ گیا اور میں اٹھ کر اس کے پاس جا پہنچا پھر بولا۔ ''اسے کیوں مار رہے ہو؟''

''تُو کئی کے رے؟ تور اِتو شاہوش بے آمار آگے بول چھس۔'' (تُو کون ہے رے؟ تیری یہ ہمت کہ میرے آگے بول رہا ہے؟)

اس کا لہجہ حد سے زیادہ تپا دینے والا تھا۔ اتنی حقارت سے اس نے مخاطب کیا تھا کہ میرا رواں رواں سلگ اٹھا۔ میں نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔

''اوے رے حرام جادہ، امارے چوکھو دیکھا چھے۔'' (حرام زادہ، مجھے آنکھیں دکھا رہا ہے) اس نے چیخ کر کہا اور میری طرف بڑھا۔ اس طرح کہ جیسے مجھے ختم کر دے گا۔

اس نے غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ میں کوئی سڑک چھاپ غنڈہ نہیں ہوں، ابھی چاہوں تو اسے پیس کر رکھ دوں۔ مار کٹائی کے سینکڑوں داؤ مجھے یاد تھے۔ انہیں آزما کر میں اسے دھول چٹا سکتا تھا مگر میں اسے موقع دے رہا تھا۔ یوں بھی میں الجھ کر پریشانی مول لینا نہیں چاہتا تھا پھر پہل کرنا میرے اصول کے خلاف تھا اس لیے خاموش کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ میرا گھورنا اس کے غیض کو بڑھاوا دیتا رہا پھر وہ مڑا اور اپنے ساتھ آنے والے گرگوں سے بولا۔

''تمرا کیو کچھو بولبے نا۔ آمی اکلا ای منڈو کا ٹبو۔'' (تم لوگ کچھ نہیں بولو گے، میں اکیلا اس کے سر کو توڑوں گا)

پھر اس نے پینٹ کی پچھلی جیب سے چاقو نکالا اور اسے کھٹکے سے کھولا۔

کھٹکے سے کھلنے والا چاقو مقابل کے اعصاب پر اثر ڈالتا ہے، خوفزدہ کر دیتا ہے۔ اگر میں بھی ٹرینڈ نہ ہوتا تو خوفزدہ ہو جاتا۔ وہ قدم جماتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا میں نے ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا۔ دکان میں اب کوئی نہیں بچا تھا، یہاں تک کہ کاؤنٹر مین تک بھاگ چکا تھا۔ کچھ لوگ باہر کھڑے تماشہ شروع ہونے کے منتظر تھے۔ خوف کا یہ عالم دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ اس کن کٹے کی دھاک علاقے پر جمی ہوئی ہے۔ میں دل ہی دل میں ہنسا کہ آج کے بعد لوگ اس سے دبنا چھوڑ دیں گے۔ یہ اپنی موت آپ مرنے آ رہا ہے۔ مجھ سے ٹکرا کر اپنی ہی بے عزتی کرائے گا۔ اسے سمجھانے کی آخری کوشش کی۔ ''تم سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں تو اس بے چارے کو بچانے آگے بڑھا تھا۔ وہ مار کھانے سے بچ گیا، اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم بھی خاموشی سے چلے جاؤ۔''

''اوئے ہندوستانی......! تورا تو شاہوش، تور مستانی اکھون دکھا چھی۔'' (اے ہندوستانی......! تیری یہ ہمت، تمہاری بدمعاشی ابھی دکھاتا ہوں) کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

''میں پھر ایک بار سمجھا رہا ہوں، مجھ سے پنگا نہ لو ورنہ بہت پچھتاؤ گے۔ یہی لوگ جو آج تم سے ڈرتے ہیں، کل تمہارا مذاق اڑائیں گے۔ جن سے تم بھتہ لیتے ہو، وہ تم پر تھوکیں گے، اس لیے خاموشی سے چلے جاؤ۔''

''حرام جادہ، آمارے ہوشکانی دچھوس۔'' (حرام زادے، مجھے للکار رہے ہو) کہہ کر اس نے چاقو والا ہاتھ بلند کیا پھر واقعی اس نے ہاتھ کو گھما کر وار کر دیا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو زخمی ہو کر گر چکا ہوتا مگر میں تو بنوٹ کا ماہر تھا۔ چاقو کیسے، کس طرح چلایا جاتا ہے اس سے واقف تھا اسی لیے میں نے اس کے ہاتھ پر نظر رکھی تھی پھر ہوشیار بھی تھا، اسے جھکائی دے کر اس کے پیچھے پہنچ گیا۔ یہ بھی بنوٹ کا ایک داؤ ہے، چاقو بازی کا ایک اہم نکتہ ہے۔ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ پیر سے چپل اتاری اور اس کے سر پر جڑ دی۔

اتنی تیزی کی اسے توقع نہیں تھی، وہ بھناتا ہوا گھوما مگر اس کا پالا مجھ سے پڑا تھا۔ مجھ سے، یعنی اس سے جس پر انسٹرکٹر نے بھرپور محنت کی تھی۔ اپنا پورا تجربہ میرے اندر اتار دیا تھا۔ اسی تجربے کو کام لا کر بجلی کی سی تیزی سے میں گھوم گیا۔ وہ اپنی ہی تیزی میں سامنے والی ٹیبل سے ٹکرا گیا۔ ٹیبل پر رکھی چائے کی پیالیاں چھناکے سے ٹوٹیں، اس کی توجہ ادھر ہوئی اور میں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا، اس کی پیٹھ پر ایک چپل مزید جڑ دی۔

وہ گالیاں بکتا ہوا میری طرف گھوما مگر اس سے پہلے ہی میں نے ایک اور چپل رسید کر کے کہا۔ ''ابھی بھی موقع ہے، واپس چلے جاؤ ورنہ میں وہ حال کروں گا کہ اس علاقے کے بچے بھی مذاق اڑائیں گے۔''

جواب میں گالیاں بکتا ہوا وہ پھر میری طرف لپکا۔ میں ہوشیار تھا، ذرا سا داہنی جانب ہٹ گیا تاکہ وہ اپنی رَو میں آگے بڑھ جائے پھر میں نے ایک اور ہاتھ جڑ دیا۔ اس کے ساتھی تلملا رہے تھے۔ ایک نے آگے بڑھنے کی کوشش بھی کی تھی کہ میں نے اسے بھی ایک کھڑی لات رسید کر دی، وہ دور جا گرا۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے کن کٹے کے سر پر ایک اور چپل بھی رسید کر دی تھی۔

باہر بھیڑ جمع تھی۔ تماشائی حیرت و تجسس سے نظارہ کر رہے تھے۔ اب تک انہوں نے

یہی دیکھا تھا کہ کن کٹا پٹائی کرتا ہے مگر آج وہ خود پٹ رہا تھا، ظالم جب شکنجے میں آتا ہے تو مظلوم خوش ہوتے ہیں۔ اسے پٹتے دیکھ سب کے چہرے کھلے پڑ رہے تھے۔

اسے پٹتا دیکھ کر ایک اور سورما آگے بڑھا۔ اس نے کرسی اٹھا کر مجھے مارنا چاہا تھا مگر اس کی یہ حسرت اس کے دل میں ہی رہ گئی اور میرے گھونسے کا تحفہ اسے ملا۔ اتنی دیر میں دکان کے باہر اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔ ابھی یہ لڑائی اور چلتی کہ پولیس کے موبائل کی سائرن سنائی دے گئی۔ شاید کسی نے پولیس کو اطلاع دے دی تھی۔ سائرن سنتے ہی کن کٹے نے چیخ کر کہا۔

"بھاگو......! اس سے بعد میں نمٹ لیں گے۔"

انہیں بھاگتے دیکھ میں کیوں رکتا، مجھے تو یوں بھی پولیس سے بچنا تھا۔ ان کے سائے سے بھی بچنا تھا۔ میں نے بھی فرار میں عافیت جانی اور دکان سے نکل کر سامنے والی گلی میں دوڑتا چلا گیا۔ اس گلی سے نکل کر سڑک پر پہنچا تو سامنے ہی وہ گلی نظر آئی جو ہمانشو کے گھر کی طرف جاتی تھی، میں اس گلی میں داخل ہو گیا۔

میں ہمانشو کے گھر میں داخل ہوا تو وہ لوٹ کر آ چکا تھا۔ میں اس سے کچھ پوچھتا کہ اس کے چہرے پر نظر پڑ گئی۔ وہ حد درجہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے ہی سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "آنند بابو، آپ نے بہت برا کیا ہے۔"

میں بات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا پھر بھی پوچھنا ضروری سمجھا۔ "ایسا کیا کیا ہے میں نے؟"

"میں ابھی وہیں سے آ رہا ہوں جہاں آپ بہادری دکھا رہے تھے۔ آپ جانتے ہیں، گنیش اس علاقے کا دادا ہے، پورے علاقے میں اس کی دھاک ہے، وہ گنپت کا خاص آدمی ہے، اسے یوں سرعام آپ نے پیٹا ہے۔"

"اچھا، اس کن کٹے کا نام گنیش ہے، لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دو کہ گنپت کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گنپت شیام بازار سے دم دم تک کا بے تاج بادشاہ ہے۔ وہاں بھی آپ نے یہی کیا، خوامخواہ کی بہادری دکھا دی۔ مجبوراً مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اب یہاں بھی مصیبت کھڑی کر دی ہے۔"

"وہ سرعام ایک شخص کی پٹائی کر رہا تھا، میں کیسے خاموش رہ جاتا؟"

"بھائی میرے، وہاں اور بھی تو لوگ ہوں گے، انہوں نے کیوں نہیں مداخلت کی؟ سب

جانتے ہیں کہ اگر گنپت کو یہ خبر مل گئی تو سب کی شامت آ جائے گی۔"

"ظلم کرنا اور ظلم دیکھ کر بھی خاموش رہنا، ایک ہی چیز ہے۔"

"آپ ایک مسافر ہو، کلکتہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ یہ سب یہاں کا معمول ہے۔"

"غنڈے موالی ہم خود پیدا کرتے ہیں۔ اگر ابتدا میں ہی انہیں روک دیا جائے تو یہ اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔" میں نے اس سچ کو بیان کیا جو معاشرے میں غنڈوں کی کھیتی کر رہے ہیں۔

"آنند بابو، سر پر چوٹ لگنے سے پہلے تو آپ ایسے نہیں تھے۔ یہ بہادر بننے کی سنک کیسے سوار ہو گئی؟ سوچیں اگر گنپت کو معلوم ہو گیا کہ اس کے آدمی کی پٹائی کرنے والا میرے یہاں ٹھہرا ہوا ہے تو وہ مجھے بھی جان سے مار دے گا۔ آپ کچھ دن تک باہر نہیں جائیں گے۔" اس کا انداز دوستانہ نہیں تھا ہتک کا پہلو لیے ہوئے تھا۔

اچھی بات بھی اگر برے انداز میں کہی جائے تو وہ گراں گزرتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی بات سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے جل کر کہا۔ "آپ تو بہت بڑے بزدل ہیں، آپ کے ساتھ رہنے کا مطلب ہے، پٹ جانا۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ واپس جلپائی گوڑی چلا جاتا ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" اس نے فوراً کہا۔

اس کفرستان میں آئے ہوئے تقریباً بارہ دن گزر چکے تھے۔ ان بارہ دنوں میں کئی رنگ دیکھ چکا تھا۔ سات دن بے ہوشی اور تین دن ہوش میں بن گاؤں کی ریکھا کے گھر میں اور دو دن اس شہر کلکتہ میں گزار چکا تھا۔ گو کہ اب تک محفوظ تھا مگر کسی بھی لمحے خطرے کی زد میں آ سکتا تھا۔ ایسے بزدل کی وجہ سے تو یقیناً خطرے میں گھر جاتا، کیونکہ نادان دوست دانا دشمن سے زیادہ خطرے کا باعث ہوتا ہے، میں اس لیے بھی میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ مجھے کہیں اور منتقل ہو جانا چاہیے مگر کہاں جاؤں؟ یہ سوال ہنوز تشنہ تھا، مجھے تو اس شہر کا حدود اربع کیا ہے۔ کسی اپنے کی تو توقع ہی فضول تھی۔ ہر طرف دشمن ہی دشمن تھے۔ دشمنوں کے اس شہر میں دوست کہاں سے لاؤں، اسی پر غور کر رہا تھا کہ میرے دماغ میں ایک نام آیا اور میرے پورے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یقیناً وہ شخص مجھے پناہ دے سکتا ہے۔ اس کی تو اس نے آفر بھی دی تھی۔ بس فوراً ہی میں

نے جیب سے کارڈ نکالا اور پڑھنے لگا۔ اس پر فون نمبر بھی دیا ہوا تھا۔ سی آئی ڈی کے خوف کے سائے میں وقت گزارنے سے بہتر تھا کہ اسے آزما لیا جائے۔ وہ مسلمان ہے۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے، وہ برادرانہ ہمدردی دکھا رہا ہو کیونکہ جب دشمن مقابل ہو تو اخوت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی ہندو مقابل ہیں، اس لیے وہ مسلمان سمجھ کر میری مدد کرنا چاہتا ہو۔ اس خیال کے تحت میں نے اس سے ملنے کی ٹھان لی۔

اب قسمت میں جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ یہ سوچ کر، اجازت ملتے ہی میں اس کے گھر سے باہر آ گیا۔ اس نے یا اس کی بیوی نے جھوٹے منہ بھی نہیں روکا۔ باہر آتے ہی میں پی سی او کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا۔ بالآخر بورڈ نظر آ گیا۔ میں نے کاؤنٹر پر بیٹھے شخص کو نمبر دیا۔ اس نے نمبر ملا کر ریسیور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے رابطہ قائم ہوتے ہی کہا۔ ''مجھے شیر علی شیرو سے ملنا ہے۔''

دوسری جانب سے آواز آئی۔ ''بول رہا ہوں۔''

''محترم، میں وہی ہوں جسے آپ نے نمبر دیتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے معلوم ہے، آپ مجھ سے رابطہ ضرور کریں گے۔ اس بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے رابطہ کر رہا ہوں، اب یہ بتائیں، آپ کے یہاں آنے کے لیے کس نمبر کی ٹرام پکڑوں؟''

''بہ شوق آئیں، مجھے پوری امید تھی کہ آپ آئیں گے، تو اب آ جائیں۔ وہاں سے سیدھی ٹرام کوئی نہیں ہے، ٹیکسی پکڑ لیں۔ راجا بازار کا کہیں گے۔ میں راجا بازار کی مسجد کے سامنے کھڑا ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں۔'' کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا اور پیسے ادا کر کے دکان سے باہر نکل آیا۔ پھر میں نے ٹیکسی پکڑی اور راجا بازار کے لیے نکل پڑا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں راجا بازار میں کھڑا تھا۔ یہ علاقہ شیام بازار کی طرح پختہ عمارتوں پر مشتمل نہیں تھا۔ کچی آبادی کہہ سکتے ہیں۔ تختوں اور ٹین کی چادروں سے بنے مکانات تھے۔ زیادہ تر مکان دو منزلہ تھے۔ پہلی ہی نظر میں وہاں کے مکینوں کی حالت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ اس علاقے کی پیشانی پر غربت کا کلنک جھلکتا تھا۔ سڑکوں پر اسٹریٹ لائٹس تھیں مگر گھروں میں بہت کم نظر آ رہی تھیں جس سے بخوبی سمجھ آ جاتا تھا کہ وہاں والے خستہ حال ہیں۔ اس پورے علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ بعد میں پتا چلا تھا کہ وہاں زیادہ تر لوگ بہار

اور مشرقی یوپی کے تھے مگر باہم شیر و شکر ہو کر رہتے تھے۔ بہت زیادہ اتحاد ہونے کی وجہ اقلیت میں ہونا تھا۔

سیالدہ اسٹیشن کا عقب تھا اس لیے اس محلے راجا بازار میں قلی، خوانچہ فروشوں کی تعداد زیادہ تھی یا پھر بک بائنڈر، ہاتھ رکشا چلانے والے، بس، ٹیکسی ڈرائیور اور مل مزدور رہتے تھے۔ گویا انتہائی نچلے طبقے پر مشتمل آبادی تھی۔ میں نے پہلے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی پھر ایک صاحب سے پوچھا کہ مسجد کدھر ہے؟

''اس گلی میں چلے جائیں۔'' اس نے اشارے سے بتایا۔

میں ادھر ہی بڑھتا چلا گیا۔ کچھ دور جاتے ہی شیرو نظر آ گیا۔ وہ مسجد کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بڑی بے تابی سے بڑھا اور گلے سے لگا لیا پھر وہ مجھے ساتھ لے کر اپنے گھر آ گیا۔ اس کا گھر بھی دو منزلہ تھا۔ لکڑی اور ٹین کی چادر سے بنا گھر تھا اور اس گھر کے کل آٹھ پورشن تھے۔ اوپر والے پورشن میں وہ رہتا تھا۔ اس کے کمرے میں پہلے سے ہی تین بندے تھے اکرم، شبراتی اور رمضانی۔ تینوں اس کے ملازم تھے۔ اس گھر کا مالک کوئی سیٹھ یاسین تھا۔ اس پوری عمارت میں صرف دو فیملی ایسی تھیں جن کے ساتھ عورتیں تھیں ورنہ سب چھڑے بندے تھے جو روزی کی تلاش میں دور دراز سے آئے ہوئے تھے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے کہا۔ ''کیوں، میرا اندازہ صحیح تھا نا کہ آپ ہندو نہیں ہیں؟ ہندو کے چہرے پر نور نہیں ہوتا، آپ کے چہرے پر ہے۔''

اس کی بات پر میری ہنسی چھوٹ گئی، تب وہ بولا۔ ''مکرمی، میرا دعویٰ ہے کہ آپ ہندوستان کے بھی نہیں ہیں۔ آپ کا تعلق پوربو پاکستان سے ہے۔ وہاں سے اردو بولنے والے لوگ جان بچا کر برابر یہاں آ رہے ہیں۔ کئی ایک سے میں مل چکا ہوں اسی لیے میں نے اندازہ لگایا تھا۔''

''اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو میں انکار نہیں کروں گا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''کوئی بات نہیں، بس یاد رکھیے گا کہ یہاں ہر طرف دشمن ہیں اس لیے ہمہ وقت ہوشیار رہیے گا۔ اب سونے کی تیاری کریں۔'' کہہ کر وہ فرش پر لیٹ گیا۔ پورے فرش پر بستر لگا ہوا تھا۔ میں بھی ایک طرف لیٹ گیا۔

''جانتے ہیں علی صاحب!'' اس نے کروٹ لے کر اپنا چہرہ میری طرف کیا۔ ''پاکستان

ٹوٹنے کا جتنا اثر پاکستانیوں پر پڑا ہے اس سے زیادہ اثر ہندوستانی مسلمانوں پر پڑا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"سیدھی سی بات ہے۔ پاکستان ہمیں کچھ دے یا نہ دے مگر اس کی وجہ سے ہمیں تقویت ہے۔ ہندوؤں پر دھاک ہے۔ ان کے دل پر خوف ہے مگر اب وہ خوف نہیں رہا۔"

وہ اور بھی بہت کچھ بولتا رہا مگر ذہنی اور جسمانی تھکن نے میری سماعت کی قوت چھین لی اور میں نیند کی بانہوں میں کھوتا چلا گیا۔

صبح اٹھا تو عجیب افراتفری نظر آئی۔ نیچے دونوں پورشن کے لیے مشترکہ باتھ روم تھا۔ لوگ لائن لگائے کھڑے تھے جبکہ نہانے والے سڑک کنارے لگے نلکے پر جمع نظر آئے۔

ناشتے کے لیے شیرو نے دال پوری، گلگلے منگوا لیے تھے۔ ڈھاکا میں بھی یہی دیکھا تھا کہ لوگ اسی قسم کا ناشتا کرتے تھے۔

اس کمرے میں قالینوں کا انبار لگا تھا۔ گویا ہزاروں روپے کا اثاثہ تھا۔ یہ لوگ آرڈر لینے نکل جاتے ہوں گے۔ مجھے اکیلے گھر میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیں گے اس خیال سے ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے کہا۔ "شیرو بھائی، میں ذرا شہر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور، ضرور...... جب بھی واپس آئیں گے، یہ کمرا کھلا ہوا ملے گا۔ یہ لوگ چلے جاتے ہیں تو میں رہتا ہوں اور جب یہ لوگ آتے ہیں، تب میں نکلتا ہوں۔" شیرو نے کہا۔

"میں صرف راستہ پہچاننے کے لیے جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔

"سیدھے جائیں گے تو دیکھنے والی جگہیں ملیں گی۔" شیرو نے کہا۔

"بہتر ہے۔" کہہ کر میں باہر آ گیا۔

باہر آ کر میں سیدھا سیدھا چلتا رہا۔ میرا رخ سیالدہ کی طرف تھا۔ اس سڑک پر ٹریفک شباب پر تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سارے شہر کی ٹریفک اسی سڑک پر آ گئی ہو۔ ٹرام، کاریں، ایک اور دو منزلہ بسیں، ٹرک، آٹو رکشا، ہاتھ رکشا، سب رواں دواں تھیں۔ پیدل چلنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ اپنی اپنی منزلوں کی طرف سب بھاگ رہے تھے۔ میں کافی دور آ چکا تھا، اب واپسی کا سوچ رہا تھا۔

یہ کون سا علاقہ ہے، اس بارے میں اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کیوں کہ دکانوں کے بورڈ ہندی یا بنگلا میں تھے۔ جس دن میں نے ڈھاکا کی سرزمین پر قدم رکھا تھا، کرنل سلطان نے

ایک پتلی سی کتاب دے کر کہا تھا۔ "یہ بنگلا زبان کا قاعدہ ہے۔ اس میں حروفِ تہجی ہیں، انہیں یاد کر لو، وقت پر کام آئیں گے۔"

بدقسمتی سے اس کتاب کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی تاکہ سائن بورڈز وغیرہ پڑھ سکوں اسی لیے میری نظریں کتاب کی دکان کو تلاش کر رہی تھیں مگر ابھی تک ایک بھی بک اسٹال نظر نہیں آیا تھا۔ میں اسی تلاش میں آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ سامنے سے آتے ہوئے شخص پر میری نظر ٹھہر گئی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا کیوں کہ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آ گئے تھے۔ خوفزدہ تو مجھے ہونا چاہیے تھا کیوں کہ میں فوجی تھا اور اس وقت دشمن کی سرزمین پر تھا۔ اگر میں یہاں کی پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو وہ لوگ میری درگت بنا دیتے، زندہ نہ چھوڑتے، ایذا دے دے کر جان نکالتے جب کہ وہ سویلین تھا۔ اگر گرفتار ہو بھی جاتا تو صرف فارن ایکٹ کا مقدمہ چلتا۔

اس کے خوف کو کم کرنے کے لیے میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس نے میرے ہاتھ کو تھام کر سرگوشی میں کہا۔ "سر، آپ؟"

"بس یار اقبال، تمہاری طرح میں بھی بھٹک رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"میں سامنے والے محلے راجا بازار میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو میرے گھر چلیں، وہاں آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" اس نے دعوت دی۔

"میں بھی وہیں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اگر چاہو تو میرے یہاں بھی آرام سے باتیں کر سکتے ہیں۔"

"ایسا کرتے ہیں، پہلے آپ ہمارا گھر دیکھ لیں پھر ہم آپ والا گھر دیکھ لیں گے۔"

"ٹھیک ہے، چلو۔" کہہ کر میں نے قدم بڑھا دیا۔

مکتی باہنی نے جب قتلِ عام کا بازار گرم کیا تھا تو ان کے مقابلے میں مجاہد اور رضا کار تھے۔ یہ نیم فوجی دستے پاکستان کی بقا کے لیے اپنا خون دے رہے تھے۔ ان کی قربانیوں کو یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان کے جذبوں کو سلام کرنے لگتا ہوں۔ وہ سب اتنے جذباتی ہو جاتے تھے کہ بتا نہیں سکتا۔ فوجیوں سے بھی آگے بڑھ کر کام دکھا دیتے تھے۔ دشمن کی کمین گاہ میں کودنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ معمولی رائفل سے دشمن کی آرٹلری کے مقابلے میں اتر آتے تھے۔ اقبال بھی مجاہد فورس میں تھا۔ مجھے حکم تھا کہ میں اپنی شخصیت کی

پر ظاہر نہ کروں مگر اتفاقیہ طور پر میری حیثیت اس پر ظاہر ہوگئی تھی۔ یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ ہوا یوں تھا کہ مجھے حکم ملا کہ ایک کیمپ کے بارے میں معلومات جمع کروں۔ وہ کیمپ دشمن کے ایریا میں تھا۔ اس کیمپ میں دشمن، پوربو پاکستان سے بھاگے ہوئے غنڈے، بدمعاشوں کو ٹریننگ دے کر دہشت گردی کے لیے واپس بھیج دیتا تھا۔ یہ خبر ایک رضا کار کے توسط سے ملی تھی۔ مجھے اس کی تصدیق کرنی تھی اور یہ بتانا تھا کہ اگر کارروائی کی جائے تو کیسے اور کس طرح؟ گویا مجھے ہر قسم کی معلومات جمع کرنا تھیں تا کہ اگر کمانڈو ایکشن ہو تو انہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔

دشمن کے حلق میں گھس کر معلومات حاصل کرنا آسان نہیں ہے مگر یہ میری ڈیوٹی تھی اس لیے میں نے فوراً تیاری کر لی۔ اطلاع کے مطابق اس کیمپ کی دوری سرحد سے صرف ڈھائی تین میل تھی مگر ان حالات میں جب ہر طرف دشمن کے فوجی موجود تھے، ان کے درمیان سے گزر کر اس کیمپ تک پہنچنا آسان نہیں تھا لیکن ہمیں اپنی جان کی پروا کب ہوتی ہے، اگر پروا ہوتی تو فوج میں کیوں آتے؟ آرام سے پرچون کی دکان جما کر بیٹھے رہتے۔ ہم تو اپنا آج قوم کے کل پر قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں تا کہ عوام چین کی نیند سو سکیں۔

☆======☆======☆

خیر، اماوس کی رات تھی، اس کا فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ اندھیرا ہی مجھے کیموفلاج کر سکتا تھا اسی لیے میں شام ڈھلتے ہی نکل پڑا۔ پتلی سی ایک پگڈنڈی دھان کے کھیت کے درمیان سے گزر رہی تھی، میں اسی پر چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے وائٹ لائن بھی کراس کر لی۔ اب میں دشمن کی سرزمین پر تھا۔ میرے پاس ہتھیار کے نام پر ایک قلم تراش تک نہ تھا۔ بس اللہ کے بھروسے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے مجھے اس بات کا خیال بھی رکھنا تھا کہ کہیں بارودی سرنگ پر پیر نہ پڑ جائے۔ پیر پڑتے ہی میرے پرخچے اڑ جاتے اور دشمن بھی ہوشیار ہو جاتا، اس لیے میں بہت احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔ بالآخر میں دشمن کے اس کیمپ تک پہنچ ہی گیا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کیمپ نہیں، بارود خانہ ہے۔ اسلحے کی پیٹیاں ایک جانب ٹال لگی ہوئی تھیں۔ دو ٹرک بھی کھڑے ہوئے تھے۔ شاید آج ہی ان پر لاد کر اسلحہ لایا گیا تھا۔ اگر میں چاہتا تو صرف ایک گرینیڈ سے پورے کیمپ کا صفایا کر دیتا مگر مجھے اس کی اجازت نہیں تھی۔ مجھے صرف وہاں کا حدود اربعہ ذہن میں بٹھانا تھا اور پھر واپس جا کر اسے کاغذ پر منتقل کر کے کمانڈوز کے حوالے کر دینا تھا۔ میں نے خود کو جھاڑیوں کا حصہ بنا رکھا تھا۔ وہیں سے اس بڑے خیمے کی طرف دیکھا جہاں پیٹرومیکس جل رہا تھا۔ اندر چلنے پھرنے والوں کے سائے صاف نظر آ رہے تھے، یقیناً اندر بہت سے لوگ تھے، ٹریننگ دینے یا لینے والے۔ میں نے ان کی تعداد کا اندازہ لگایا۔ اطراف کے نکتوں کو ذہن میں بٹھایا، ایک ایک چیز کو ذہن نشین کیا پھر اسی طرح دبے پاؤں واپس چل پڑا۔

اس بار قدم ذرا تیز اٹھ رہے تھے۔ میں جلد سے جلد اپنے مستقر پر لوٹ جانا چاہتا تھا۔

وائٹ لائن سے کیمپ کی دوری اتنی زیادہ نہیں تھی مگر دشمن کا علاقہ، اس پر حالتِ جنگ، دشمن کے ڈپلائے نزدیک، چپے چپے پر دشمن کی ٹکڑی اس لیے یہ معمولی سا فاصلہ بھی پل صراط بن گیا تھا۔ کسی بھی وقت دشمن کی نظروں میں آسکتا ہوں، اس کا خوف۔ اس لیے تیز رفتاری کے ساتھ احتیاط بھی کر رہا تھا۔ گو کہ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی، میں پاگل کے بھیس میں تھا مگر دشمن بھی تو اپنے ایجنٹوں سے اسی طرح کے بھیس میں کام لیتا ہے اس لیے ذرا سی بھی بے احتیاطی مجھے موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ میں دھان کے کھیتوں میں جھکا جھکا، کیچڑ میں چاروں ہاتھ پاؤں سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وائٹ لائن اب زیادہ دور نہیں تھی۔ بس اب تب میں اپنی سرزمین پر پہنچ جاتا کہ شومئی قسمت۔

میں ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ میں اپنی چالاکی سے دشمن کو بے وقوف بنا آیا ہوں مگر فوراً ہی پتا لگ گیا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ جس طرح میں دبے پاؤں دشمن کے علاقے میں گیا تھا، اسی طرح دشمن بھی دبے پاؤں میرا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آ گیا تھا۔ اس کی خبر مجھے تب ہوئی جب میں سیدھا کھڑا ہوا۔

جیسے ہی سیدھا کھڑے ہوتے ہوئے قدم آگے بڑھایا تھا کہ میرے پیر میں کانٹا چبھا اور میں جھک گیا تھا۔ اضطراری طور پر میرا جھکنا میرے لیے نوید زندگی بن گیا۔ ٹک دھم کی آواز سے فضا گونج اٹھی۔ روسی ساختہ رائفل دو آواز سے چلتی تھی۔ پہلے ٹک کی آواز آتی پھر دھم کی۔ اس کی گولی میرے سر کو پھاڑتی ہوئی نکل جاتی۔ میں نے سنسناہٹ کی ہلکی سی آواز پر ہی خود کو گرا لیا تھا۔ ایسے موقع کے لیے انسٹرکٹر کا کہنا تھا کہ جب دشمنوں میں گھر جاؤ، فائرنگ ہو رہی ہو تو دوڑنے کی بجائے خود کو زمین پر گرا لو اور کرالنگ کرتے ہوئے تیزی سے دور ہٹنے کی کوشش کرو، گو کہ کیچڑ میں لوٹ لگاتے ہوئے آگے بڑھنا آسان نہیں تھا۔ دھان کے کھیتوں میں کیچڑ ہی کیچڑ تھی مگر زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی، میں بھی سانپ کی طرح رینگتا سرسراتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا مگر دھان کے پودوں کا کیا کرتا جو یقیناً ہل رہے ہوں گے جس کی وجہ سے مجھ پر گولیاں مسلسل برس سکتی تھیں۔

میں خدا کو یاد کرتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا مگر میں سیدھا آگے نہیں بڑھ رہا تھا، دشمن کو مغالطے میں ڈالنے کے لیے الٹے ہاتھ پر بڑھ رہا تھا تا کہ وہ یہی سمجھیں کہ میں ہندوستانی علاقے میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔

کچھ دیر بعد میں ایک جگہ دبک گیا۔ اب میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ دشمن ہے کس طرف؟ اس فائر کے بعد گولی نہیں چلی تھی، شاید دشمن زیادہ فائر کرنے سے گریز کر رہا تھا کیوں کہ ہمارے شیر جواں بھی تو قریب تھے، وہ بھی جوابی فائرنگ شروع کر دیتے پھر انہیں بھاگتے راستہ نہ ملتا مگر میں خطرے میں اور زیادہ گھر جاتا کیوں کہ اپنی گولیوں کا بھی ڈر رہتا۔ گولیاں پہچان کر نہیں چلتیں، بس لگتی ہیں، دوست اور دشمن کسی کو بھی لگ سکتی ہیں۔

جب کافی دیر گزر گئی تو میں نے دھیرے دھیرے سر اٹھایا۔ دور، بہت دور دو تین سائے حرکت کرتے نظر آئے، گویا میں نے دشمن سے پیچھا چھڑا لیا تھا، بس میں نے موقع دیکھ کر بھاگنا شروع کر دیا۔ جھک جھک کر بھاگنا آسان نہیں تھا پھر بھی میں بھاگ رہا تھا مگر کچھ ہی دیر میں احساس ہو گیا کہ میں راستہ بھٹک چکا ہوں۔ یہ اور خطرناک بات تھی۔ راستہ بھٹکنے کا مطلب تھا، دشمن کے سامنے واپس پہنچ جانا۔ میں نے آسمان کی طرف نظر کی، سات ستاروں کے جھرمٹ پر نظر ڈالی اور سمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی پھر اندازے سے بڑھنا چاہا لیکن فوراً ہی دبک گیا کیوں کہ ستاروں کی مدھم روشنی میں کچھ دوری پر رائفل تھامے دو آدمی نظر آئے تھے۔ میں نے سوچا، کہیں یہی دونوں تو میرا تعاقب نہیں کر رہے تھے؟ جیسے ہی وہ دونوں مڑے، میں نے پھر سے دوڑ لگا دی۔ کافی دور جانے کے بعد مجھے مکانوں کے ہیولے نظر آئے۔ شاید کوئی چھوٹا موٹا گاؤں تھا۔

کسی گاؤں میں یوں بے دھڑک جانا بھی خطرناک تھا کیوں کہ مکتی باہنی کے ایجنٹ بھی ہمارے دشمن تھے۔ میں کیا کروں، ابھی کھڑا یہی سوچ رہا تھا کہ "داڑاؤ" کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا کہ کس نے مجھے رکنے کے لیے کہا ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہی دونوں ہیں۔ میں نے پھر دوڑ لگا دی۔ وہ بھی رائفل اٹھائے پیچھا کرنے لگے، ساتھ ہی ساتھ کہتے بھی جا رہے تھے۔ "داڑاؤ...... گولی میرے دیبو۔" (رک جاؤ، گولی مار دیں گے)

میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا کہ انہیں روکتا اس لیے سیدھا دوڑتے ہوئے سامنے جو گھر نظر آیا، اس کی دیوار پھلانگ گیا۔ چار فٹ اونچی دیوار میرے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی۔ ایک ہی جمپ میں پار کر لی اور عقبی کھڑکی کے نزدیک پہنچ گیا۔ اندر سے آتی آواز نے مجھے خوش کر دیا۔ باتیں کرنے والے اردو بول رہے تھے۔ اردو بولنے والے ہمارے بازو تھے۔ شورش پھیلانے والوں کے سامنے وہی لوگ ڈٹے ہوئے تھے۔ میں ان کے درمیان محفوظ تھا اس لیے

جلدی سے بولا۔ ''بھائی، دروازہ کھولو۔''

''کون ہو؟'' اندر سے بھی اردو میں سوال کیا گیا۔

''میرے پیچھے مکتی باہنی کے غنڈے لگے ہوئے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''آں...... یہاں مکتی باہنی......'' حیرت بھری آواز سنائی دی۔ ''دروازے کی طرف آؤ۔''

کھڑکی کی الٹی طرف دروازہ تھا۔ دروازہ کھلا اور کسی نے آواز دے کر کہا۔ ''ادھر آجاؤ۔'' میں دوڑتا ہوا ادھر پہنچا اور دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

میرے ہاتھ منہ پر کیچڑ لگا ہوا تھا۔ انہوں نے تہمد دے کر کہا۔ ''آنگن میں تالاب ہے، جا کر نہا لیں۔''

جب میں نہا کر لوٹا تو وہاں مزید دو نوجوانوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ نئے آنے والوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ انہیں میں نے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی دونوں تھے جنہیں دیکھ کر میں دوڑا تھا۔ بڑے میاں جنہوں نے تہمد دیا تھا، انہوں نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''او میرے بھائی، تم نے یہ بات کیوں کہی تھی کہ مکتی باہنی میرے پیچھے لگی ہے؟ اس علاقے کو ہم نے پوری طرح پاک کر رکھا ہے۔ یہاں سے سات کھیرا تک پوری پٹی میں بھارتی دراندازوں کو بھی روک دیا ہے۔''

''کیا آپ رضا کار ہیں؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''ہم کون ہیں، اس کا فیصلہ کرنل اشرف کریں گے۔ انہیں اطلاع دے دی ہے، وہ آتے ہی ہوں گے، تب تک تم چائے پیو۔''

کرنل اشرف کا بلاواسطہ تعلق ہم سے تھا مگر ایک قباحت تھی۔ صرف ایک بار لمحے بھر کو میں ان سے ملا تھا۔ اگر انہوں نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تو خواہ مخواہ مجھے ذہنی کوفت ہو گی اور کیمپ تک قیدی کی حیثیت سے جانا ہوگا کیونکہ وہاں پہنچ کر ہی میں ڈھاکا سے رابطہ کر سکتا تھا۔

میں اسی سوچ میں گم تھا کہ اندر سے ایک بچی پیالوں میں چائے لے آئی۔ ہم چائے پینے لگے تبھی باہر گاڑی کی آواز سنائی دی اور پھر بوٹوں کی دھمک...... اندر آنے والوں میں کرنل اشرف بھی شامل تھے۔ میں اٹین شن ہوتے ہوتے رک گیا مگر انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لیا پھر بولے۔ ''مجھے اندازہ تھا، تمہی ہو گے۔''

''بس آپ کی دعا ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''آپ لوگ مطمئن رہیں۔ یہ ہمارے آدمی ہیں۔'' انہوں نے بڑے میاں سے کہا پھر میری طرف مڑ کر بولے۔

''چلو، میں تمہیں سڑک تک چھوڑ دوں تاکہ آسانی سے اپنے 'ڈیرے' پر جا سکو۔''

انہوں نے مجھے ساتھ لیا اور مڑ گئے۔ سامنے کھڑے دو نوجوانوں میں سے ایک نے اٹین شن ہو کر کہا۔ ''سر، میں ان کے تعاقب میں تب سے لگا ہوا تھا جب یہ بھارتی فوجیوں کی فائرنگ سے بچ کر بھاگے تھے۔ بس انہیں گھیرنے کی کوشش تھی اسی لیے گولی نہیں چلائی۔''

''ہاں اقبال، تم سے کچھ کام ہے، جیپ میں آؤ۔'' اس نوجوان کی بات کو نظر انداز کر کے کرنل صاحب باہر نکل گئے۔

اسی ملاقات نے بہ زبان خاموشی اقبال کو بتا دیا تھا کہ میں بھی فوجی ہوں۔ اس دن کے بعد آج ملاقات ہوئی تھی۔ وہ آگے آگے تھا اور میں پیچھے پیچھے۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے واپس راجا بازار کی طرف بڑھ رہے تھے کہ وہ بولا۔ ''سر، یہ علاقہ بیٹھک خانہ کہلاتا ہے۔ یہاں ہندوؤں کے زیادہ، مسلمانوں کے گھر کم ہیں مگر کشیدگی ہر دم رہتی ہے اس لیے ذرا تیز چلیں۔''

''پہلے یہ یاد رکھو، مجھے اب سر نہ کہنا۔''

''ٹھیک ہے، اب سر نہیں کہوں گا۔''

''میرا نام منتظر ہے، منتظر شاہ، اسی نام سے پکارنا۔''

''شکریہ، کہ آپ نے عزت بخشی، ویسے آگے کہاں جائیں گے؟''

''میں بے منزل راہی ہوں، حادثاتی طور پر یہاں آگیا۔ اب دیکھوں گا کہ اپنے بارڈر تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟ مگر تم کیسے آئے؟''

''16 دسمبر کو میں بھی ڈیوٹی پر تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میری ڈیوٹی سرحدی پٹی کے قریب تھی۔ جیسے ہی ہمیں ہتھیار ڈال دینے کا حکم ملا، میں نے بارڈر کراس کر لیا۔ بعد میں پتا چلا کہ بال بچوں کو کرنل اشرف صاحب نے اپنے ساتھ لے لیا ہے۔ اب وہ P.O.W ہیں۔''

''چلو، وہ محفوظ تو ہیں مگر یہ بتاؤ، وہ ہیں کہاں، کس کیمپ میں ہیں؟''

''خبر ملی ہے، انہیں میرٹھ میں رکھا گیا ہے۔ رابطے کی کوئی صورت تلاش کر رہا ہوں۔''

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ میرٹھ میں ہیں؟"

"میں پابندی سے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سن رہا ہوں۔ اس میں پریزنرز آف وار (prisoners of war) کے میسج آ رہے ہیں۔ ایک دن میری بیوی کا پیغام آیا تھا کہ وہ خیریت سے ہے۔ کرنل اشرف نے اسے بھتیجی بنا کر ساتھ لے لیا تھا۔"

"آج نہیں تو کل P.O.W. کو رہائی ملے گی ہی اور وہ کسی نہ کسی طرح اپنی سرزمین تک پہنچ جائے گی مگر تم کیسے پہنچو گے، کچھ سوچا ہے؟"

"نہیں سر، اب آپ سے ملاقات ہوگئی ہے تو دونوں مل کر راستہ تلاش کریں گے۔"

"فی الحال تو میرے ذہن میں ایک ہی بات ہے کہ کسی طرح ان جانبازوں تک پہنچوں اور ان کو مدد دوں جن کی خبریں اخبار میں تواتر سے آ رہی ہیں کہ دو مردِ مجاہد کیمپ سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔"

"لیکن اتنے بڑے ملک میں آپ انہیں کیسے ڈھونڈیں گے؟"

"یہ میرا خیال، میری تمنا ہے اور تمنا سب پوری تو نہیں ہوتی، بس کوشش کر سکتا ہوں، کروں گا۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے اس نے کہا۔ "شاہ جی، آپ کا رینک کیا تھا؟"

"جو سرحد کے پار رہ گیا، اسے یاد نہ کرو۔ اب ہم یہاں ایک معمولی فارن ایکٹ کے مجرم ہیں یعنی یہاں کی پولیس کسی بھی وقت شبہ ہوتے ہی ہمیں گرفتار کر سکتی ہے اور اگر گرفتاری کے وقت یہ راز کھل گیا کہ تم رضا کار کے کمانڈر تھے یا میں آرمی میں تھا تو سزا اتنی لمبی ہو جائے گی جس کا حساب نہیں۔ پہلے تو یہاں کی انٹیلی جنس کی ہر شاخ باری باری سے اپنے اپنے عقوبت خانے کی سیر کرائے گی جس میں کئی سال گزر جائیں گے پھر عدالت میں پیش کرے گی اور عدالت بغیر ہماری سنے ہمیں دس بارہ سال کے لیے اندر کر دے گی۔ وہ دس بارہ سال، پچیس تیس سال پر محیط ہوں گے۔" میں نے پوری تقریر کر دی۔

"ہاں، یہ خطرہ تو ہے۔" اس نے جواب دیا۔

ہم نیچی آواز میں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک گلی میں چلتے چلتے ٹھٹک گئے۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ رہائشی علاقوں میں یوں بھی ایسے وقت میں سناٹا رہتا ہے۔

مجھے ذرا بھی امید نہ تھی کہ ہمانشو سے دوبارہ ملاقات ہو جائے گی مگر اس وقت وہ میرے سامنے تھا مگر میرے ٹھٹکنے کی وجہ وہ نہ تھا، اس کے ساتھ آ رہا بندہ تھا۔ یہ وہی کن کٹا تھا جس کی میں نے پٹائی کی تھی۔

"میں اپنے دشمنوں کو پاتال سے بھی نکال لیتا ہوں۔ تم جس ٹیکسی پر وہاں سے بھاگے تھے، اس کے ڈرائیور نے بتا دیا تھا کہ تم راجا بازار آئے ہو۔ مسلّوں سے تمہارا کیا رشتہ ہے، یہ تو بعد میں پوچھیں گے، پہلے اپنا حساب بے باق کریں گے۔" کن کٹا بنگالی زبان میں دہاڑا۔

ہمانشو کے علاوہ اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے جو صورت سے ہی حرامی لگ رہے تھے۔ دیکھنے سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ دونوں موالی ہیں، گو کہ ان دونوں کیا، تینوں کی حیثیت میرے لیے معمولی تھی۔ ایسے سڑک چھاپ غنڈے میرا کیا بگاڑ سکتے تھے، پھر بھی میں نے ڈر جانے کی اداکاری کی۔ "بھائی، کیوں میرے دشمن بنے ہو؟ میں تمہیں پہچانتا نہیں تھا، اس لیے بھڑ گیا تھا۔ اب معاف کر دو۔"

"معافی تو تجھے مانگنا ہی ہے مگر ایسے نہیں۔ میں تجھے شیام بازار لے جا کر ننگا کروں گا پھر منہ پر کالک چونا لگا کر بھرے بازار میں گھماؤں گا تا کہ میری ساکھ پھر سے بحال ہو سکے۔ جو لوگ میری ہنسی اڑا رہے ہیں، انہیں سبق ملے۔"

"نہیں بھائی، ایسا نہ کرو، میں پردیسی ہوں۔ آج ہی جلپائی گوڑی چلا جاؤں گا۔ مجھے جانے دو۔" کہتے ہوئے میں غیر محسوس انداز میں اس کی طرف کھسک رہا تھا۔

مجھے خطرے میں دیکھ کر اقبال نے کن کٹے سے بنگلہ میں پوچھا۔ "کیا ہوا بھائی، مجھے کیوں روکا ہے؟" دراصل میں نے اسے رضا کاروں کو سکھائی گئی اشاراتی زبان میں اشارہ کر دیا تھا کہ وہ اجنبی بن کر یہاں سے چلا جائے۔ یہ اشارہ اس وقت دیا جاتا تھا جب دشمن میں گھرا ساتھی مدد لانے کو کہے۔ اس نے بھی میری منشا سمجھ لی تھی۔

"تم اس کے ساتھی ہو، اسی لیے تمہیں بھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔" کن کٹے نے کہا۔

"مگر میں تو اس آدمی کو پہچانتا بھی نہیں۔ یہ راجا بازار جانے کا راستہ پوچھ رہا تھا، میں نے رک کر بتا دیا۔" اقبال روہانسی آواز میں بولا۔

"ٹھیک ہے، تم جاؤ۔" کن کٹے نے کہا۔

اقبال کے جاتے ہی میں پوری طرح مستعد ہو گیا۔ اب مجھے کچھ کر دکھانا تھا مگر میں سوچتا

رہ گیا اور اس کے ساتھی نے پہل کر دی۔ اس نے پیچھے سے میری گدی پر کسی بھاری چیز سے ضرب لگائی تھی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو بے ہوش ہو کر گر چکا ہوتا کیونکہ اس ضرب سے میری آنکھوں میں کالے پیلے ستارے رقص کرنے لگے تھے۔ ضرب پڑتے ہی میں لڑکھڑا گیا تھا اور مجھے اس دم ٹریننگ کا زمانہ یاد آ گیا۔ انسٹرکٹر ہر ایک دو دن کے بعد گدی پر پوری قوت سے گھونسا مار کر ہنستا تھا اور پھر کہتا تھا کہ یہ گھونسا مستقبل میں کام آئے گا، تب ہم دل ہی دل میں اسے ”تاتاری ظالم“ کا خطاب دے کر اس کا رشتہ چنگیز خان کی نسل سے جوڑتے، اس طرح غصہ نکالتے تھے مگر آج عملی زندگی میں آ کر پتا چلا کہ وہ کتنے عظیم لوگ ہیں۔ ہمیں ہر خطرے سے بچانے کا مکمل انتظام پہلے ہی کر چکے تھے، تبھی تو گدی پر پڑنے والی ضرب ناکام رہی۔ اتنی شدت سے محسوس نہ ہوئی جتنی شدت سے وار ہوا تھا۔

اس ضرب کا جواب دینا ضروری تھا، سو میں ایک ٹانگ پر زور دے کر دوسری ٹانگ سیدھی کرتے ہوئے گول دائرے میں گھوم گیا۔ یہ داؤ بھی انسٹرکٹر کا سکھایا ہوا تھا کہ جب کئی دشمن بہت نزدیک ہوں تو ان سے اس طرح نمٹنا۔ کھڑی لات کن کٹے سے ٹکرائی اور وہ اچھل کر اپنے برابر والے پر گرا۔

خود میں بھی ڈگمگا گیا تھا اور اس کا فائدہ پیچھے والے نے اٹھایا۔ گدی پر ضرب لگانے والے نے پھرتی دکھا دی تھی۔ اس نے میرے کالر کو پیچھے سے پکڑ کر کھینچ لیا تھا۔ میں ایکشن میں تھا، اس لیے کالر کھنچتے ہی پیٹھ کے بل گرا۔ اس نے مجھے گھسیٹتے ہوئے دوڑ لگا دی تھی۔ پختہ سڑک پر گھسٹنا ایک بڑا عذاب ہے۔ جسم پر جا بجا خراشیں آ گئیں جو سوئی کی طرح چبھنے لگیں۔ میرے لیے یہ عذاب نیا نہیں تھا، ٹریننگ کے دوران ہمیں جیپ کے پیچھے رسی سے باندھ کر کئی بار گھسیٹا گیا تھا، تب کی وہ ظالمانہ ٹریننگ آج کام آئی اور میں نے خراشوں کی چبھن کو محسوس کیے بنا پیروں کو موڑ کر الٹی اچھال بھری اور اس کے سر پر پہنچ گیا۔

اس جھٹکے سے میرے کالر کا پچھلا حصہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں اس کے سر پر سے گزرتا ہوا اس کے پیچھے پیروں پر کھڑا ہو گیا اور ایک لمحہ بھی توقف کیے بنا پوری قوت سے مٹھی باندھ کر الٹی مٹھی کی ابھار سے اس کی کنپٹی پر وار کیا۔ بس ایک وار کافی ثابت ہوا اور وہ ”ماں گو“ کی آواز نکالتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

اتنی دیر میں کن کٹا بھی سنبھل چکا تھا، اس نے چاقو نکال لیا تھا اور اس کے ساتھی نے

استرا...... بعد میں معلوم ہوا تھا کہ کلکتہ کے غنڈوں کا پسندیدہ ہتھیار استرا ہے۔ وہ پہلا وار چہرے پر کرتے ہیں تا کہ ہمیشہ کے لیے مخالف کے چہرے پر مہر لگ جائے۔ یہی کام وہ بلیڈ سے بھی لیتے ہیں۔ بلیڈ کو منہ میں رکھ کر تالو سے چپکا لیتے ہیں اور لڑائی کے دوران نکال کر دو انگلیوں میں پھنسا کر گال پر وار کرتے ہیں۔ خیر، اس نے استرا چلایا اور عین اسی وقت کن کٹے نے چاقو سے وار کیا۔ اگر میں ہائی جمپ لگا کر اس جگہ سے دور نہ چلا جاتا تو یہ کہانی سنانے کا موقع نہیں ملتا۔ میں نے کن کٹے کے پیچھے پہنچتے ہی اس کی کمر پر لات ماری۔ ضرب کھا کر وہ سامنے کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ سامنے کھمبا تھا۔ وہ بجلی کے اسی کھمبے سے ٹکرایا۔ میں استرے والے سے بھی ہوشیار تھا، اسی لیے فوراً ہی مڑ گیا تھا اور تیزی سے گھٹنا چلا دیا تھا۔ میں نے تاک کر اس کی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں گھٹنا مارا تھا۔ وہ مرتی ہوئی بھینس کی طرح ڈکرایا تھا اور جسم کے اس نازک حصے پر ہاتھ رکھے گرتا چلا گیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا، اب وہ آدھے گھنٹے تک اٹھ نہیں پائے گا۔ اسی وقفے سے فائدہ اٹھانے کے لیے میں نے پوری توجہ کن کٹے پر مرکوز کر دی تھی۔ ہمانشو دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ ایک تو وہ پہلے ہی خوف زدہ تھا، شاید اسے کن کٹا زبردستی لے کر آیا تھا اسی لیے اس کا چہرہ فق تھا۔ اس پر یہ کہ اب کن کٹا پھر سے پٹ رہا تھا۔ ایک بار پٹنے کی وجہ سے کن کٹے نے مجھ سے بدلہ لینے کے لیے اسے ڈھونڈا، شاید تشدد بھی کر چکا ہو، اسی خوف سے اس کا چہرہ اب اور زیادہ زرد ہو گیا تھا کہ اب کی بار تو کن کٹا اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ شاید اسی لیے وہ ٹھنڈ سے سکڑے کتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

میں نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی تھی اور پھر کن کٹے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ کن کٹا دوبارہ حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا تھا کہ میں پھر ایک بار اس پر جا پڑا تھا۔ اس بار میں نے ایک ساتھ دونوں ہتھیلیوں کو کھڑی کر کے اس کی گردن پر دونوں طرف مارا تھا۔ کراٹے کا یہ داؤ خاصا اثر ڈالتا ہے۔ اس کی بھی چیخ نکل گئی تھی اور وہ جھٹکے سے بیٹھ گیا تھا۔ میں نے اسی پر بس نہ کیا، اسی طرح کا ایک وار اور کر دیا۔ وہ خاصا جان والا تھا، پے در پے دو ہاتھ پڑے مگر وہ بے ہوش نہیں ہوا۔ نہ صرف ہوش میں رہا بلکہ اٹھ کر کھڑا بھی ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں اب تک کھلا ہوا چاقو تھا۔ اس نے اسے دوبارہ آزمایا اور سیدھا میرے پیٹ پر وار کیا۔ میں جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا یہ وار بھی خالی گیا۔ گلی کے دونوں سرے پر لوگ جمع ہو رہے تھے۔ کوئی بھی پولیس کو خبر کر سکتا تھا۔ پولیس آ جاتی تو نئی پریشانی کھڑی ہو جاتی اس لیے میں نے اختتامی ہاتھ

رسید کرنے کا سوچا اور وہیں سے ہوا میں جمپ لگا کر اس کے برابر سے گزرتا ہوا اس کے پیچھے پہنچ گیا۔ پیچھے پہنچتے ہی میں نے اس کی گدی کے ذرا نیچے مخصوص مقام پر گھونسا مارا۔ اس بار جسم کی پوری قوت لگا دی تھی۔ نتیجہ حوصلہ افزا نکلا۔ وہ ''کخ'' کی آواز نکالتا ہوا ڈھیر ہو گیا تھا، گویا پورا تماشہ اختتام کو پہنچ گیا۔

اب یہاں ٹھہرنا فضول تھا۔ کوئی اور خطرہ آ سکتا تھا اس لیے گلی کی دوسری سمت میں دوڑتا چلا گیا۔ ادھر جمع لوگوں نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا تو کائی کی طرح بھیڑ چھٹ گئی اور میں ان کے درمیان سے دوڑتا ہوا آگے نکلتا چلا گیا۔

ابھی کچھ ہی دور پہنچا تھا کہ مجھے احساس ہوا جیسے کوئی میرے پیچھے آ رہا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، وہ اقبال تھا جو دوڑتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ میں برابر کی گلی میں داخل ہو کر رک گیا۔ اس نے قریب آ کر کہا۔ ''سیدھے سیدھے نکلتے چلیں۔''

میں نے پھر رفتار تیز کر دی مگر دوڑنا موقوف کر دیا تھا۔ ہم تھوڑی ہی دیر میں سڑک پر پہنچ گئے۔ سڑک پر پہنچ کر ہم نے رفتار کم کر لی اور مڑ کر دیکھا۔ پیچھے دور دور تک کوئی نہ تھا۔ اقبال نے چلتے چلتے کہا۔ ''آپ نے مدد لانے کا اشارہ دیا اور میں وہاں سے ہٹ بھی گیا مگر فوراً یاد آ گیا کہ یہاں تو کوئی ایسا بندہ ہے ہی نہیں جو مدد کے لیے آتا؟''

''دراصل میں تمہیں ہٹانا چاہتا تھا، اکیلے میں زیادہ بہتر طریقے سے لڑ سکتا ہوں نا......'' میں نے ہنس کر کہا۔

''مگر یہ لوگ کون تھے؟'' اس کا تجسس بجا تھا۔ میں اس دیس میں نیا تھا۔ یہاں کوئی اپنا نہ تھا، کوئی دوست بھی نہیں تھا پھر یہ دشمن کہاں سے پیدا ہو گئے۔

''مجھے خود پتا نہیں، بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ لوگ شیام بازار کے غنڈے ہیں اور میں نے اڑتا تیر پکڑا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا اور رفتار تیز کر دی۔ شاید میں سوالات سے بچنا چاہتا تھا۔ مگر وہ بھی پیر تسمہ پا تھا۔ کہ چھوڑنے پر تیار ہی نہیں تھا۔ فوراً بول اٹھا:

''میرے خیال سے خوامخواہ کی دشمنی مول لینا بہتر نہیں ہے۔''

''میں خود بھی یہی سوچتا ہوں مگر عادت سے مجبور ہوں، اس لیے۔''

''میں نے یہ بات اس لیے کہی کہ یہاں کی پولیس پور بو پاکستان سے آنے والوں کی بو سونگھتی پھر رہی ہے۔ اس راجا بازار سے کتنے ہی لوگوں کو پکڑ کر لے جا چکی ہے۔''

''قسمت کا لکھا ہم کب مٹا سکتے ہیں؟ جو لکھا گیا، وہ تو پورا ہو کر رہے گا۔'' میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

ہم آگے بڑھتے بڑھتے سڑک پر پہنچے۔ وہاں سے راجا بازار دور نہیں تھا، پھر بھی میں نے ایک رکشا والے کو روک لیا اور اس پر سوار ہو کر سیالدہ چلنے کو کہا۔

''یہ آپ سیالدہ کیوں جا رہے ہیں؟'' اقبال نے پوچھا۔

''بہت سی باتیں پوچھنے کی بجائے سمجھنا چاہیے۔ خاموش رہ کر دیکھتے جاؤ۔'' میں نے جواب دیا۔

سیالدہ پہنچ کر میں نے کرایہ دیا پھر پلیٹ فارم کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر ایچ وہیلر کے بک اسٹال پر کھڑا رہا پھر پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر اندر چلا گیا۔ لوکل ٹرین کھڑی تھی۔ میں ٹہلنے کے انداز میں ٹرین تک گیا پھر واپس دوسرے دروازے سے باہر نکل آیا اور دوبارہ رکشا لے کر راجا بازار کی جانب چل پڑا۔ اقبال کے چہرے پر حیرت چھائی ہوئی تھی۔ رکشا سے اترنے کے بعد میں نے کہا۔ ''اس غنڈے نے میری تلاش میں ٹیکسی والے سے پوچھ تاچھ کی تھی۔ اس نے یہ تک پتا لگا لیا تھا کہ میں ہمانشو کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں، ہو سکتا ہے، اس کا کوئی آدمی جو تماش بینوں میں کھڑا ہو، میرے تعاقب میں آ سکتا ہے۔ یہی سوچ کر میں سیدھا نہیں آیا۔''

سیالدہ جا کر وقت گزاری کی پھر دوسرے رکشے سے راجا بازار کے لیے چل پڑا۔

''واقعی آپ نے اچھی راہ ڈھونڈی۔'' کہہ کر اس نے توصیفی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے راجا بازار کی گلیوں میں داخل ہو گئے۔

اقبال جس گھر میں ٹھہرا ہوا تھا، وہ آٹھ بائی آٹھ کے دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے میں عادل اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا اور دوسرے میں اقبال اور نقیب۔ اقبال نے بتایا کہ یہ گھر عادل نے لے رکھا تھا۔ کمرے کا کرایہ ساٹھ روپے تھا، تیس عادل دیتا تھا اور تیس نقیب مگر جب اقبال آ گیا تو فی کس 20 روپے ہو گئے۔ اقبال نے یہ بھی بتایا کہ عادل اور نقیب چھابڑی لگاتے ہیں اور اب وہ بھی سوچ رہا ہے کہ چھابڑی لگا لے کیونکہ اس کے پیسے ختم ہو رہے ہیں۔

عادل وغیرہ کو اس نے بتایا تھا کہ وہ کام کی تلاش میں مظفر پور سے آیا ہے۔ اتفاق سے وہ دونوں بھی مظفر پور کے تھے اس لیے دوستی ہو گئی تھی اور انہوں نے اسے بھی اپنے ساتھ رکھ لیا

تھا۔جس وقت ہم پہنچے تو کمرا خالی تھا۔اقبال نے ہی تالا کھولا تھا۔میں نے اس سے پوچھا۔

''جب تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں تو تم کیسے آگے جاؤ گے؟''

''چھابڑی لگا کر کچھ نہ کچھ جمع کرلوں گا۔''

''ویسے اب فکر کی بات نہیں ہے، جب میں نے خود کو اس ملک کی سرزمین پر پایا تو تہی دست تھا،ایک روپیا بھی نہیں تھا پھر کچھ روپے میری منہ بولی سالی نے دیئے۔''

''آں...... یہ منہ بولی سالی کون سا رشتہ ہے؟''اقبال نے حیرانی سے پوچھا۔

''سیدھی سی بات ہے، جو خود ہی بغیر کسی رشتے کے مجھے بہنوئی مان لے،اسے کیا کہوں؟ اسی لیے منہ بولی کہا۔اس نے دو سو روپے دیئے تھے پھر قسمت نے یاوری کی اور ایک ساتھ تقریباً دس ہزار روپے مل گئے۔''

''دس ہزار...... یہ تو بہت بڑی رقم ہے،کہاں سے ملی؟''

''ہوا یوں کہ ایک چائے کا بزنس کرنے والے سے غنڈوں نے روپوں سے بھرا لفافہ چھیننا چاہا کہ میں نے ان غنڈوں کی پٹائی کردی۔اس افراتفری میں رقم کا لفافہ میرے ہاتھ آگیا اور میں نے جیب میں رکھ لیا۔ہانشو نامی اس شخص نے سوچا کہ وہ لفافہ غنڈوں کے پاس رہ گیا اور میں نے اسے مالِ غنیمت سمجھ کر ہضم کرلیا۔''

''اتنی بڑی رقم سے تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ایسا کریں کہ ہم کل ہی یہاں سے چل دیں۔دہلی میں ایسے کچھ لوگ ضرور ہوں گے جو انسانی اسمگلنگ کرتے ہوں گے،انہی کے توسط سے ہم بارڈر پار کرلیں گے۔''

''خیال برا نہیں ہے،میں بھی تیار بیٹھا ہوں۔جب کہو،چل دوں۔''

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ عادل کمرے میں داخل ہوا۔اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت زیادہ خوف زدہ ہو۔

میں نے پوچھا۔''کیا بات ہے،کچھ پریشان لگ رہے ہو؟''

میرا پوچھنا تھا کہ وہ پھپک پھپک کر رو اٹھا۔اسے اس طرح روتے دیکھ کر اقبال بھی پریشان ہوا تھا۔اس نے پوچھا۔''عادل بھائی،کیا ہوا،کیوں رو رہے ہو؟''

''میں...... میں لٹ گیا،برباد ہوگیا......''وہ روتے ہوئے بولا۔

''کیوں،کیا ہوا؟ مجھے بتاؤ۔''میں نے کہا۔

''ایک ماہ پہلے ابو میاں نے یہ دونوں کمرے خالی کرنے کہا تھا۔میں نے انکار کیا تو دھمکی دے کر چلا گیا۔ایک ہفتے پہلے،اور کل بھی اس کے آدمی نے آکر کہا کہ تم یہ گھر خالی کردو ورنہ بہت برا انجام ہوگا۔''

''یہ ابو میاں کون ہے؟''

''اسی علاقے کا دادا ہے۔راجا بازار میں سٹے کے تمام اڈے اس کے ہیں۔شراب کی بھٹی بھی اسی کی ہے۔یہاں مکانوں کی قلت ہے،اس کے آدمی کو مکان چاہیے،اسی لیے وہ کمرے خالی کرانا چاہتا ہے۔''

''کیا آج پھر دھمکی دے کر گیا ہے؟''میں نے سوال کیا۔

''دھمکی دے کر نہیں،عمل کر کے گیا ہے۔وہ میری بیوی کو اٹھا لے گیا ہے۔''اس نے بین کرنے کے انداز میں کہا۔

''کیا......؟''میں حیرت سے کھڑا ہوگیا۔

''اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ چاقو کے زور پر لے گیا؟ ہائے...... میرے بچے کیسے رو رہے ہیں؟ میں خوانچہ بھی اسٹیشن پر چھوڑ کر آگیا۔اب میں کیا کروں؟''وہ بین کیے جارہا تھا۔

''ابو میاں کا اڈا کہاں ہے؟''میں نے پوچھا۔

''پیچھے جو ریلوے لائن ہے،اس سے دائیں چلتے چلے جائیں،آگے قبرستان ہے،اسی کے اندر اس کا اڈا ہے۔''

''اقبال،تم نے قبرستان دیکھا ہے؟''

''جی ہاں......!''

''تو آؤ،جلدی چلو،عورت کی عزت کانچ کی طرح ہوتی ہے،ذرا سی درک گئی تو پھر نہیں جڑتی۔''

کہہ کر میں باہر آگیا۔

اقبال کو لے کر میں تیز قدموں سے ریلوے لائن کی طرف بڑھتا چلا گیا۔میں دوڑنے کی حد تک تیز قدم اٹھا رہا تھا۔

بالآخر قبرستان آگیا۔قبرستان کا گیٹ دوسری طرف تھا۔میں نے گیٹ تک جانا وقت کا زیاں سمجھا اور احاطے کی دیوار پھلانگ گیا۔اندر پہنچتے ہی میں نے مڑ کر دیکھا،اقبال بھی دیوار

پھلانگ کر اندر آ چکا تھا۔ اس نے نزدیک آ کر کہا۔ ''وہ...... اس طرف شراب کی بھٹی ہے، ادھر ہی سے بدبو آ رہی ہے، ابو میاں بھی ادھر ہی ہوگا۔''

ہم اسی طرف بڑھتے چلے گئے۔ بھٹی کھلے آسمان تلے تھی۔ بڑا سا چولہا تھا۔ اس چولہے پر ڈرم چڑھا ہوا تھا۔ نیچے آگ جل رہی تھی۔ میں اس جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگا جو بھٹی کے ساتھ تھی۔

جھونپڑی کے قریب پہنچ کر میں نے ایک درز سے اندر جھانکا، اندر دو تین آدمی کھڑے تھے اور ایک آدمی چوکی پر نیم دراز تھا۔ اس کی انگلی میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا اور سامنے ایک عورت کھڑی تھی۔ وہ گڑگڑا رہی تھی۔ ''خدا کے لیے، مجھے جانے دو، میرے بچے رو رہے ہوں گے۔ میاں پریشان ہوگا۔ تمہاری بھی آخر بہن ہوگی۔''

''میری ماں نے بیٹی پیدا کرنے کی غلطی نہیں کی۔ جو ایک دو نے بہن ہونے کا دعویٰ کیا، میں نے پہلے ہی انہیں دھندے سے لگا دیا، اب تُو بھی دھندے سے لگے گی اگر تیرے میاں نے کھولی خالی نہیں کی تو......''

''میں ایک شریف گھرانے کی عورت ہوں۔'' اس نے تڑپ کر کہا۔

''تو اب واپس جا کر کیا کرے گی؟ محلے والے اب تیری شرافت کا یقین نہیں کریں گے۔ ابو میاں کے اڈے سے واپس جانے والی شریف نہیں رہتی۔ رہا تیرا میاں، وہ تو زندہ درگور ہو ہی چکا ہوگا، اب تُو جا کر زندہ درگور کیوں ہونا چاہتی ہے؟ شرفو گیا ہوا ہے، دو گھنٹے میں کھولی خالی نہیں ہوئی تو تجھے منوا جیسے سؤر کے حوالے کر دوں گا، وہ تجھے کسی اندھیرے کونے میں لے جا کر سؤرنی بنا دے گا......'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں اندر داخل ہوا اور بولا۔

''منوا سؤر ہے یا نہیں، میں نہیں جانتا مگر ابھی تجھے میں سؤر ضرور بناؤں گا......''

''تُو کون ہے رے......؟ اندر کیسے آیا......؟'' اس نے غصے میں جلتی سگریٹ کو ہاتھوں میں مسل دیا، تبھی میرے پیچھے کھڑے شخص نے للکارا۔

''اوئے حرام مُوت...... تُو ابو بھائی سے کس لہجے میں بات کر رہا ہے؟''

میں نے سر موڑ کر اسے دیکھا، اس نے ہاتھ میں کھلا استرا پکڑ رکھا تھا۔ دوسرے نے بھی فٹ سے استرا نکال لیا۔ میں نے بغیر مڑے داہنا پیر موڑ کر پیچھے کی طرف چلایا۔ جوتے کی ٹھوکر اس کے گھٹنے پر پڑی اور وہ جھٹکے سے بیٹھ گیا۔ میں نے توقف کیے بنا ابو میاں کی طرف چھلانگ

لگائی، تبھی اقبال نے، جو دروازے سے لگا کھڑا تھا، اس نے وہیں رکھے اسٹول میں پیر ڈالا اور اسٹول اچھل کر پوری قوت سے دوسرے استرے والے کے چہرے پر پڑی اور اس کا سر پھٹ گیا۔ اتنی دیر میں، میں ابو میاں کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ پوری قوت سے اس کے گھٹے ہوئے سر پر گھونسا رسید کیا، وہ بلبلا اٹھا۔

''کمینے...... کتے...... مسلمان ہو کر مسلمان کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے...... تیری تو......''

میں سانپ کی طرح پھنکارا پھر تیر کی طرح اس کے قریب آیا اور اس کی ناک پر اپنا سر دے مارا۔ ناک کی ہڈی چٹخنے کی آواز ابھری۔ وہ پیچھے کی طرف گرنے لگا۔

اسی اثناء میں پہلا شخص بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ایک استرا لہراتے ہوئے کہا۔

''تمہاری بہادری ابھی یہیں دھری کی دھری رہ جائے گی......''

یہ صورتِ حال بہت نازک تھی۔ آگے ابو میاں، پیچھے استرے والا۔ میں نے اس کی طرف رخ کیا پھر اس کے استرے والے ہاتھ پر زور سے اپنی کلائی دے ماری کیونکہ اس شخص نے تھوڑی سی دیر کر دی تھی۔ استرا تو گر گیا لیکن ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ رہی سہی کسر اقبال نے نکال دی۔ وہی اسٹول جس سے وہ ایک کو نشانہ بنا چکا تھا، اسے اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ وہ تو فوراً لمبا لیٹ ہوگیا۔ اب میں ابو میاں کی طرف مڑا تو وہ اپنی جگہ سے غائب تھا۔ میں نے اقبال سے کہا۔ ''وقت برباد مت کرو، میں ابو میاں کو تلاش کرتا ہوں، تم اسے لے کر اس کے گھر چلے جاؤ۔'' میرا اشارہ عادل کی بیوی کی طرف تھا۔

اقبال اسے لے کر چلا گیا۔ میں نے وہیں رکھے پانی کے مٹکے سے پانی نکالا اور بے ہوش پڑے شخص کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پر چھینٹے مار کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے آنکھیں پٹپٹائیں اور پھر اٹھ بیٹھا۔ سر سے بہنے والا خون اس کے چہرے پر لکیریں بنا گیا تھا۔ میں نے اس کے بالوں کو مضبوطی سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

''اوئے...... تیرا باپ ابو میاں کہاں گیا ہوگا......؟ جلدی بول......''

اس نے خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر مری مری آواز میں بولا۔ ''یہ علاقہ گلفام کا ہے، وہ اس سے مدد لینے گیا ہوگا۔ اب تم بچو گے اور نہ عادل۔ سب کی موت آئی کہ آئی......''

''موت کس کی آئی ہے، یہ بھی تمہیں جلد پتا چل جائے گا۔ مجھے اس کے اڈے کا پتا

بتاؤ۔" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ مجھ پر ایک جال آ کر گرا۔

یہ مچھلی پکڑنے والا موٹا سا جال تھا جسے پھینکنے والے نے نہایت پھرتی سے کھینچا تھا اور میں لمحے بھر میں بے دست و پا ہو گیا تھا۔ جال نے مجھے گٹھڑی بنا دیا تھا۔ جال پھینکنے والا بھی آگے آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "تمہیں استاد کا اڈا دیکھنا ہے نا، خوامخواہ ٹیکسی کا پیسا خرچ کرو گے، ہم تمہیں خود اس کے اڈے پر پہنچا آتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے لات ماری۔ نوکیلے جوتے کی ٹو میری پسلی سے ذرا نیچے لگی۔ میرا جسم ٹریننگ کا مزہ اٹھا چکا تھا اور سخت ہو چکا تھا اس لیے زیادہ تکلیف محسوس نہ ہوئی۔

میں نے غراتے ہوئے کہا۔ "کمینے...... اگر ہمت ہے تو مجھے آزاد کر کے دیکھ، پھر پتا چلے گا کہ تُو کتنا بہادر ہے......"

"یہ کلکتہ بہت بڑا شہر ہے، ہر گلی، محلے میں ایک دادا ہے۔ سب بکھرے ہوئے ہیں پھر بھی ایک ہیں، ہر چھوٹے دادا پر ایک بڑا بھی ہے۔ راجا بازار سے بڑا بازار تک گلفام کا علاقہ ہے۔ سب اس کو بھتہ دیتے ہیں اس لیے وہ ان کی خبر رکھتا ہے اور جس کو وہ بھتہ دیتا ہے، وہ اس کو باخبر رکھتا ہے اور بچاتا بھی ہے۔ شیام بازار میں تُو نے جو کچھ کیا، اس کی بھی ہمیں خبر ہے۔ کچھ دیر پہلے بیٹھک خانہ میں بھی جو کچھ ہوا، وہ بھی ہمارے علم میں ہے۔ یہاں کے تو ہم خود گواہ ہیں۔ تُو مار کٹائی کا ماہر ہے، اس لیے تیری کٹائی اسی طرح کریں گے جیسے خارش زدہ کتے کو بچے رسّی سے باندھ کر کرتے ہیں۔ شاباش اب اپنا منہ بند رکھنا......"

انہوں نے اسی حالت میں مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا اور قبرستان کے باہر کھڑی واکس ویگن میں لا کر ٹھونس دیا۔

ویگن کس راستے سے گزری، کچھ پتا نہیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد گاڑی رکی اور مجھے اسی طرح ڈنڈا ڈولی کر کے اتارا گیا پھر مکان کے اندر لے جایا گیا۔ اندر ایک چوکی پر انتہائی کالا شخص سفید کرتہ پائجامے میں بیٹھا تھا۔ کپڑے کی سفیدی نے رنگت کو نمایاں کر دیا تھا۔

اس نے میرا جائزہ لے کر کہا۔ "بڑا جی دار ہے تُو، کہاں کا رہنے والا ہے؟"

"اس وقت کلکتے میں ہوں تو کلکتے کا ہی کہلاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"تیری بڑی تعریف سنی ہے، ذرا میں بھی دیکھوں کہ تُو کتنا جی دار ہے......؟"

"میرے ہاتھ کھول دے، پھر دیکھ، میں کتنا جی دار ہوں۔"

"تیری اتنی ساری غلطیاں ہیں کہ میں تجھے معاف نہیں کر سکتا۔"

"ذرا میں بھی سنوں، مجھ پر کون کون سے الزام لگے ہیں؟"

"پہلی غلطی کہ تُو نے شیام بازار میں گنپت کے آدمی کی دھاک ختم کرائی، دوسری غلطی یہ کہ راجا بازار کو خراب کیا، میرے خاص آدمی کے منہ سے نوالہ چھیننے کی کوشش کی، پھر بھی میں تجھے ایک موقع دے رہا ہوں، یہ مل ایریا ہے، دور دور تک ویرانہ ہے، اگر تُو اس ویرانے سے نکل کر راجا بازار پہنچ گیا تو میں تجھے ہمیشہ کے لیے معاف کر دوں گا۔"

"میرے ہاتھ پیر کھول دے، اس جال سے نکال دے، پھر دیکھ میری بہادری۔"

"یہی تو میں دیکھنا چاہتا ہوں، تیرے پیچھے دو آدمی جائیں گے، ان کو تجھے شوٹ کرنے کا آرڈر ہے۔ اگر تُو بچ گیا تو بہادر، یہ گلفام میاں کا دربار تیرے لیے وقف اور اگر مر گیا تو تیری قسمت...... چل بھاگ، تیرے جانے کے پورے بیس منٹ بعد یہ دونوں شوٹر نکلیں گے۔ اب دیکھنا ہے، بچ کر کون آتا ہے؟"

میں نے حیرت سے اسے دیکھ کر کہا۔ "واقعی مجھے رہا کر رہا ہے؟"

"بالکل...... میں خود بہادر ہوں، اس لیے بہادر کی قدر کرتا ہوں۔ اگر تُو واقعی بہادر ہے تو ثابت کر......"

اس نے مجھے جال سے آزاد کرایا پھر کہا۔ "چل نکل، اس وقت سات بج رہے ہیں، سات بیس پر یہ دونوں نکلیں گے۔"

اس کی اجازت ملتے ہی میں اس مکان سے نکل آیا۔ واقعی باہر دور دور تک ویرانہ تھا۔ کافی فاصلے پر شہر کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں شہر کی سمت دوڑنے لگا۔

میں اس طرح سے دوڑ رہا تھا جیسے جہنم کی بلائیں میرا پیچھا کر رہی ہوں۔ ویرانے میں تاریکی کچھ زیادہ ہی نظر آتی ہے، یہ تاریکی ہی مجھے بچاتی، اسی لیے میں اس تاریکی کا فائدہ اٹھانے کی خاطر جان توڑ کر دوڑ رہا تھا۔ میں کئی بار کانٹے دار جھاڑیوں سے الجھا جس سے ہاتھوں اور چہرے پر خراشیں آ گئی تھیں پھر بھی تیزی سے دوڑ رہا تھا کیونکہ اُس گھر کے روشن دروازے سے دو آدمیوں کو نکلتے جو دیکھ لیا تھا۔ ان کے اور میرے درمیان کافی فاصلہ تھا مگر بندوق کی گولی کے لیے یہ فاصلہ کچھ بھی نہ تھا اسی لیے اس طرح دوڑ رہا تھا۔

لگاتار دوڑنے کی وجہ سے میری سانس پھولنے لگی تھی۔ پھیپھڑوں میں برداشت کی

گنجائش نہیں تھی لیکن میں رک نہیں سکتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ رکنے کا مطلب موت ہے۔ وہ دو آدمی جو پیچھا کر رہے تھے، یقیناً پیشہ ور قاتل ہوں گے۔

میرے دائیں بائیں ویرانہ تھا۔ پیچھے موت تھی۔ سامنے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر رہائشی علاقہ تھا۔ اگر میں وہاں تک پہنچ جاتا تو جان بچنے کی امید تھی لیکن یہ ایک میل کا فاصلہ، ایک ہزار میل سے زیادہ لگ رہا تھا۔

دفعتاً میرا پیر جھاڑیوں میں الجھا، قدم لڑکھڑائے اور میں ایک کھڈ کی ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا اور پھر قدِآدم جھاڑیوں میں الجھ کر رک گیا۔ پتھروں پر لڑھکنے سے جسم پر چوٹیں آئی تھیں لیکن یہ معمولی سی تکلیف، اذیت ناک موت سے بہتر تھی۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا، وہ کھڈ تقریباً دس ہاتھ گہرا تھا۔ ایک طرف بارش کے پانی کی وجہ سے زمین پر کٹاؤ سا آ گیا تھا جو دور تک چلا گیا تھا۔ چاروں طرف اونچی کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ اوپر آسمان پر بہت دور ستارے چمکتے نظر آ رہے تھے۔

دفعتاً ویرانے میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر مجھے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ جن موت کے سوداگروں سے بچ کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ میرے سر پر آن پہنچے تھے۔ میں نے بے بسی سے اطراف میں دیکھا۔ اگر میں کھڈ سے نکل کر کسی بھی طرف بھاگنے کی کوشش کرتا تو چند گز سے زیادہ فاصلہ طے نہیں کر سکتا اور جسم گولیوں سے چھلنی ہو جاتا۔ اس تاریک کھڈ میں میرے لیے امید کی ہلکی سی کرن موجود تھی اسی لیے میں کانٹوں کی پروا کیے بغیر جھاڑیوں کے مزید اندر گھستا چلا گیا۔

دوڑتے قدموں کی آوازیں رک گئی تھیں۔ میں نے جھانک کر اوپر دیکھا، ستاروں کی ہلکی روشنی میں کھڈ کے کنارے کھڑے دو ہیولے نظر آئے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں پستول نظر آئے۔ انہوں نے آپس میں سرگوشی بھی کی تھی لیکن واضح نہ ہونے کی وجہ سے میں سن نہیں پایا تھا پھر ایسا لگا جیسے وہ پاگل ہو اٹھے ہوں، انہوں نے جھاڑیوں پر گولیاں برسانا شروع کر دی تھیں۔ بے نشانہ گولیاں ہر انچ پر برس رہی تھیں کہ ایک گولی نے مجھے ڈھونڈ لیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے آگ کا جلتا ہوا انگارہ میرے داہنے پیر میں اترتا چلا گیا ہے۔

اگر میں منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخ کو دبا نہ لیتا تو موت کے وہ ہرکارے میری کمین گاہ سے آگاہ ہو جاتے اور میرے جسم میں اَن گنت گولیوں کے نشان ثبت ہو کر مجھے موت کے منہ میں

پہنچا چکے ہوتے۔ چند سیکنڈ بعد ہی گولیوں کی برسات رک گئی اور گڑھے کے اوپر سے آواز سنائی دی۔ لگتا ہے وہ یہاں نہیں کہیں اور چھپا ہے، اگر اس کھڈے میں ہوتا تو ایک نہ ایک گولی اسے ضرور لگتی اور اس کی بے ساختہ چیخ خود بتا دیتی کہ اس کی موت نے اسے ڈھونڈ لیا ہے۔"

"ممکن ہے وہ کھڈ کے اندر ہی اندر کہیں دور نکل گیا ہو، جھاڑیاں بھی تو دیکھو کیسی گھنی ہیں۔ ان کی آڑ لے کر پوری پلٹن بھاگ سکتی ہے۔" شاید وہ بقراط کی نسل سے تھا مسلسل بولے جا رہا تھا اور وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس نے پھر کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ چڑا کارخانے کی طرف نکل گیا ہو۔"

میں بالکل دم سادھے پڑا تھا۔ سانس لینے میں بھی احتیاط کر رہا تھا کیونکہ ہلکی سی بھی آواز انہیں متوجہ کر سکتی تھی۔ زخم سے نکلنے والا خون مسلسل نکلے جا رہا تھا۔ میں اسے بند کرنے کی کوئی تدبیر کرنے سے بھی معذور تھا۔ اگر ہاتھ پیر ہلتے تو پتے کھڑکتے اور ان کے کان کھڑے ہو جاتے اس لیے اس تکلیف کو موت سے بہتر جان کر برداشت کرتا رہا۔

"میری مانو تو چڑا مل کی طرف چلتے ہیں، وہ ادھر ہی گیا ہوگا۔ قسمت کا سانڈ ہے ابھی تک ہم سے بچا ہوا ہے، اب تو مجھے ڈر لگنے لگا ہے کہ کہیں وہ واقعی کامیاب نہ ہو جائے۔" وہی بڑبولا پھر بولا۔ اس بار اس کی آواز میں ہلکی سی مردنی تھی۔

"سالا کب تک بھاگے گا۔ ہم اس شہر کے چپے چپے سے واقف ہیں اور وہ نیا پنچھی ہے۔ شاید بہار کا ہے اس لیے کہ ہندی اچھی بول لیتا ہے۔"

"ابے ہمارے بہار کی یہی تو خوبی ہے کہ وہاں صرف جی دار جنم لیتے ہیں۔" شاید وہ بھی بہار کا تھا اسی لیے بہار کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔

"جتنے چور چوٹے ہیں، سب وہیں کے ہوتے ہیں۔ اگر کلکتہ نہ ہوتا تو یہ کہاں جاتے۔" دوسرے والے نے مزاح کے انداز میں کہا۔

"ابے، منہ سنبھال کر بول، تیرے یو پی میں چور کم ہیں کیا؟ نٹور لعل کے رشتے دار، یاد کر نٹور لعل یو پی کا تھا۔" اس نے چڑ کر کہا۔

"نٹور لعل چور نہیں، فنکار تھا۔ وہ معمولی چوری کرتا تھا؟ وہ کھڑے کھڑے بیچ شہر میں کھڑا گھنٹا گھر، قطب مینار بیچ دیتا تھا۔ یاد کر اس نے لعل قلعہ کا سودا کر لیا تھا کہ پکڑ میں آ گیا۔" وہ اس بہاری کو تپانے پر آمادہ تھا کہ بہاری نے کہا:

''چل تیری بات مان لیتے ہیں۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد، پہلے وزیراعظم کو بھی یو پی کا بنا دیتے ہیں۔ گاندھی جی نے ستہ گرہ (عدم تعاون تحریک) کے آغاز کی سرزمین بھی سیتا مڑھی نہیں یو پی کو بنایا یہ بھی تاریخ کی کتابوں میں لکھ دیتے ہیں۔ ابے، ہمارے بہار کی برائی کرتا ہے۔ بھارت بھر میں کہیں بھی ایسے عقل مند تجھے نہیں ملیں گے، سمجھا۔''

''اچھا بابا، اچھا، تیرا بہار مہان۔ مان لیا، چل اب آگے بڑھ۔'' کہہ کر شاید وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ قدموں کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد میں بھی اس کمین گاہ سے نکلا اور کھلی فضا میں آ گیا۔ تھوڑی دیر تک میں نے سن گن لی کہ کہیں وہ یہیں کہیں تو چھپے ہوئے نہیں ہیں جب کچھ اطمینان ہو گیا تو پیر کی طرف نظر ڈالی۔ خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ میں وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور بے بسی سے چاروں طرف نظر ڈالی کہ شاید کہیں سے مدد مل جائے مگر دور دور تک کوئی نظر نہیں آیا اگر آ بھی جاتا تو میں اس کی طرف جا نہیں سکتا تھا، صرف انسانی نفسیات تھی جس کی وجہ سے میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تھا پھر پائنچہ اٹھا کر زخم پر نظر ڈالی۔ مزید اطمینان کے لئے ہڈی پر انگلی، ٹیڑھی کر کے ماری اور مطمئن ہو گیا۔ ہڈی محفوظ تھی۔ گولی گوشت پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ پوری پنڈلی پر چیرا لگ گیا تھا۔ زخم سے خون رس رہا تھا اسے بند کرنے کا طریقہ سوچنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ جس تیزی سے خون رس رہا ہے، اس کا صرف یہی حل ہے کہ اسے روکا جائے ورنہ جان پر بن آئے گی۔ میں نے قمیص کی آستین کو پھاڑا پھر اسے تہہ در تہہ بنا کر زخم پر کس کر باندھ دیا۔ اب خون کا بہنا بند ہو چکا تھا مگر درد میں کمی نہیں آئی تھی۔

کچھ دیر ستانے کے بعد میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اس لیے کہ مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں ابھی بھی خطرے میں ہوں۔ سامنے کی طرف دیکھا، کوئی نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان دونوں کا خطرہ ٹل گیا۔ وہ ابھی بھی میری تلاش میں ہوں گے۔ کسی بھی وقت میرا نشانہ لے سکتے ہیں۔ میں محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ کافی آگے جانے کے بعد مجھے ایک عمارت نظر آئی جو شاید متروک تھی۔ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے ادھر بڑھنا شروع کر دیا۔

تاریک عمارت کا ہیولہ اب واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ کچھ نزدیک پہنچنے کے بعد اس عمارت کا دروازہ نظر آیا۔ دروازے میں پلڑا نہیں تھا۔ شاید کسی نے اکھاڑ لیا ہو۔ میں اس سے

اندر داخل ہو گیا۔

اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے ریڈیم ڈائل کی گھڑی پر نظر ڈالی دس بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ گویا مجھے اس شوٹر سے، موت کے ان دو فرشتوں سے لکا چوری کھیلتے ہوئے تین گھنٹے بیس منٹ ہو چکے تھے۔

میں اندر کی طرف کچھ اور آگے بڑھا۔ گو کہ مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس عمارت کا اندر سے لے آؤٹ کیا ہے پھر بھی میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کچھ آگے جانے کے بعد مجھے سیڑھیاں سی محسوس ہوئیں اور میں نے سنبھل سنبھل کر پیر رکھنا شروع کر دیا آہستہ آہستہ میں اُوپر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اُوپر پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ اب لمبی راہ داری ہے۔ میں اس راہ داری میں بڑھنے لگا۔ میں دیوار کو ٹٹولتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک دروازے سے ہاتھ ٹکرایا۔ میں اس میں داخل ہو گیا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے دیوار سے پیٹھ لگائی اور کھڑا ہو گیا، پھر جھک کر زخم پر بندھی پٹی پر ہاتھ پھیرا، پٹی گیلی ہو رہی تھی۔ ہاتھ میں چپچپاہٹ سی آ گئی تھی۔ یقیناً یہ خون کی چپچپاہٹ تھی۔ سختی سے پٹی باندھنے کے بعد بھی خون نہیں رکا تھا، صرف بہاؤ میں فرق آ گیا تھا اور اب رِس رہا تھا جس سے پٹی تر ہو گئی تھی۔ اس کام کو انجام دے کر میں کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ کھڑکی بغیر پلڑے کی تھی، جسے ضرورت ہو گی، اس نے موقع پا کر اکھاڑ لیا ہو گا یا پھر مالکان خود کھول کر لے گئے ہوں گے۔ میں اسی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ باہر ستاروں کی مٹمیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ گاؤں دیہات میں ستاروں کی روشنی تیز ہوتی ہے مگر شہروں میں یہ روشنی بھی پرانی ثقافت کی طرح دم توڑ دیتی ہے، بڑی مدہم نظر آتی ہے، میں اسی مدہم روشنی میں دور، کافی دور جلتی بجھتی روشنی کو دیکھ رہا تھا جبکہ ذہن میں موت کا خوف تھا، کسی بھی وقت موت کے ہرکارے پہنچ سکتے تھے۔

بالکل ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا ایک بار اور ہوا تھا، تب میں آن ڈیوٹی تھا۔ جیسور کی سڑکوں پر پاگل بنا گھومتا رہتا تھا۔ ایک دن حکم ملا کہ بینیا پوکور کے بارے میں معلومات جمع کروں۔ بینیا پوکور شہر سے باہر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہ گاؤں جیسور سے سرحد کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے بسا ہوا تھا۔ یہ سڑک جیسور سے نکل کر پیٹرا پول تک جاتی تھی۔ پیٹرا پول ہماری سرحدی چوکی تھی۔ یہیں امیگریشن اور کسٹم ہوتا تھا۔ اس کے بعد بھارتی سرحد تھی۔ ان کی

سرحدی چوکی بینیا پوکور میں تھی۔ بینیا پوکور سے کچھ آگے بھارتی قصبہ بن گاؤں تھا۔ گویا وہ چھوٹی سی بستی بینیا پوکور کافی اہمیت کی حامل تھی۔ رضا کاروں نے اطلاع دی تھی کہ اس گاؤں میں مکتی باہنی کا اجلاس ہونے والا ہے، اس اجلاس میں کس کس نے شرکت کی، کیا لائحۂ عمل طے ہوا، اس کا پتا لگانا تھا۔

میں اسی کا پتا لگانے کے لیے پیدل اس گاؤں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف میں املی کے بڑے بڑے درخت کھڑے جھوم رہے تھے پھر ڈھلان تھی جس کے بعد دھان کے کھیت تھے۔ کھیت میں چاولوں کے خوشے بہار دکھا رہے تھے۔ بڑا خوش نما منظر تھا، ایسا منظر جو ذہن کو اسیر کرلے، آنکھوں پہ سحر طاری کردے مگر میرے پاس اس منظر سے لطف لینے کا، آنکھوں کو تراوٹ بخشنے کا وقت نہیں تھا اس لیے میں ہر جانب سے لاتعلق بنا آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ابھی اس گاؤں سے دو ڈھائی کلومیٹر دور تھا کہ میں ٹھٹک گیا۔ ٹھٹکنے کی وجہ وہ دونوں آدمی تھے جو پیڑوں کی آڑ سے نکل کر کسی جن کی طرح نمودار ہوئے تھے۔ پتا نہیں، وہ دونوں کب سے وہاں کھڑے تھے اور میرے نزدیک آنے کا انتظار کر رہے تھے؟ اُن میں سے ایک نے اسٹین گن پکڑ رکھی تھی جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ یہ دونوں اسلحے فوجیوں کے استعمال کے تھے۔ ایسے بھاری ریوالور سویلین کو نہیں دیئے جاتے، اسی لیے میں نے سمجھ لیا تھا کہ ان کا تعلق مکتی باہنی سے ہے پھر ان کا رویہ بھی اجڈ گنواروں جیسا تھا، گویا اطلاع صحیح تھی کہ یہاں سرحد پار سے آنے والے شرپسند شیلٹر لیتے ہیں۔

میں پاگل کے بھیس میں تھا اور اب تک گونگے کی ایکٹنگ کر رہا تھا اس لیے جیسے ہی ایک شخص نے آگے بڑھ کر میری داہنی پسلی پر اسٹین گن کی نال چبھائی اور بولا۔ ''توئی کے رے؟ باڑی کو تھائے۔'' (اے، تو کون ہے رے، اور گھر کہاں ہے؟)

میں نے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکالیں۔ ان میں سے ایک بولا۔ ''ای تو بوبا اچھے۔'' (یہ تو گونگا ہے) '' یہ وہی تھا جس نے پستول پکڑ رکھا تھا۔

''نہ نہ رے، بوبانہ او ہوتے پارے۔'' (نہیں نہیں، یہ گونگا نہیں بھی ہو سکتا ہے)

''تا ہولے تومی، انوشندھان کرو۔'' (تب تمہی تحقیق کرو)

ابھی میں ان دونوں سے نمٹنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ مزید دو نوجوان آگئے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسلحے نہیں، کھلونے ہیں جو ہر ایک کو دے دیئے گئے ہیں۔ ان چاروں کے کھڑے ہونے کا

انداز ایسا تھا جو چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ انہیں دشمن کو گھیرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ میں ایک ہی بار میں ان چاروں کو مٹی چٹا دیتا مگر میں پہل کرنے سے گریزاں تھا۔ چاہتا تھا کہ بس انہیں مطمئن کر دوں تاکہ اس گھر تک بہ آسانی جا پہنچوں۔ پہرے کا مطلب ہی یہ تھا کہ وہاں کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ میرے وطنِ عزیز کے لیے خطرناک ہی ہوگا۔ اس خطرے کا گلا گھونٹنے کے لیے اس مرکز کو تباہ کرنا ضروری تھا اس لیے انہیں ورغلانے کے لئے میں نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ یہ اچھل کود ردھم میں تھی۔ ہمارے پچھمی پاکستان کے مزاروں پر جس طرح عقیدت مند دھمال ڈالتے ہیں، بالکل ویسے ہی میں نے ڈھاکا کے شاہ علی بغدادی کے مزار پر بھی دھمال دیکھا تھا پھر جیسور میں بھی ایسا ہی منظر نظر آیا تھا اسی لیے میں دھمال کی نقالی کر رہا تھا۔

مجھے دھمال کرتے دیکھ کر اسٹین گن والے نے میری پیٹھ پر زور سے اسٹین گن کی نال ماری۔ اگر میرا جسم کسرتی نہ ہوتا، انسٹرکٹر کی مہربانی سے جسم فولادی نہ بن گیا ہوتا تو میری چیخ نکل جاتی۔ میں نے چوٹ کی پروانہ کی اور اسی رفتار سے اچھلتا کودتا رہا جیسے مجھ پر ''حال'' آگیا ہو۔

اسٹین گن والے کی اس حرکت پر پستول بردار کو غصہ آگیا۔ اس نے تیز لہجے میں ڈانٹا۔

''یہ...... یہ اللہ والا ہے۔ اسے جانے دو۔''

''ایسے کیسے جانے دوں، دیکھ نہیں رہا ہے، اس کا قد بالکل پنجابیوں کی طرح لمبا ہے۔''

''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ...... اگر اب تم نے اسے کچھ کہا تو میں گولی چلا دوں گا۔'' وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا کہ بعد میں آنے والوں میں سے ایک نے اسٹین گن والے سے کہا۔

''کنائی......! جانے دو، اس کا باپ بھی فقیر ہے ناں، اسی لیے یہ ہر فقیر کی عزت کرتا ہے۔''

مجھے معلوم تھا کہ بنگال میں فقیر کو بھکاری کہتے ہیں جبکہ فقیر انہیں کہتے ہیں جو ''پیر'' ہوں یا پھر کسی خانقاہ یا مزار سے منسلک ہوں۔ گویا میری قسمت اچھی تھی۔ ستارہ عروج پر تھا جس کی وجہ سے ایک خانقاہی بندہ مل گیا تھا جبکہ دوسرا اپنے نام ہی سے ہندو لگ رہا تھا۔

میں اسی طرح اچھل رہا تھا کہ میرے ہمدرد نے میرے نزدیک آ کر حق، حق، حق الا اللہ، کا نعرہ لگایا۔ یہ خانقاہیوں کا اشارہ ہے کہ اگر ''حال'' شباب پر نہیں ہے تو ہوش میں آجاؤ اور میں نے فوراً خود کو روک لیا۔ اس نے جھک کر میرے پیر چھوئے جو کہ وہاں قدم بوسی کہلاتا ہے پھر

مڑ کر اپنے ساتھیوں سے بولا۔ ''یہ واقعی فقیر ہے، چلو، واپس چلتے ہیں۔'' پھر مجھ سے بولا۔ ''میاں صاحب، آگے خطرہ ہے، واپس چلے جائیں۔''

''آں......آں......'' میں نے اس طرح کہا جیسے میں نے اس کی بات سمجھ لی ہے۔ اس وقت مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ جو گونگے ہوتے ہیں، انہیں سنائی بھی کم دیتا ہے مگر وہ لوگ تو بس ایویں سے غنڈے تھے جو پیسوں کی لالچ میں مادرِ وطن کا سودا کرنے کے لیے دشمن کے غلام بن گئے تھے۔

انہیں واپس مڑتے دیکھ کر میں بھی واپس مڑ گیا تھا۔ ان کا رخ سرحد کی طرف اور میرا شہر کی طرف تھا۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا تھا۔ میں نے دانستہ اپنی رفتار سست رکھی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد میں ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا ایسے جیسے ستانا چاہتا ہوں۔ بیٹھنے کے بعد میں نے سڑک کا جائزہ لیا تھا۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ وہ سب پھر سے پیڑ کی آڑ میں کھڑے ہو گئے ہوں گے اور مجھے دیکھ رہے ہوں گے کہ میں واقعی جا رہا ہوں یا نہیں؟

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں پھر کھڑا ہو گیا اور شہر کی طرف بڑھنے لگا۔ کافی دور آنے کے بعد میں پھر بیٹھ گیا مگر اس بار میں بیٹھا ضرور تھا مگر پہلے کی طرح نہیں، بیٹھتے ہی میں نے کھسکنا شروع کر دیا تھا۔ کھسکتے کھسکتے سڑک سے کھیت میں اترا پھر جھک کر اسی طرف دوڑنے لگا جدھر سے آیا تھا۔ دھان کے کھیتوں میں پانی رہتا ہے جس کی وجہ سے کنارے کی زمین بھی کیچڑ والی ہوتی ہے۔ میں کیچڑ میں ہی چل رہا تھا مگر احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ کیچڑ میں پیر پڑنے سے آواز پیدا ہوتی ہے، اس لیے پیر رکھنے میں بھی احتیاط کر رہا تھا۔

اسی طرح جھکی جھکی حالت میں، میں تقریباً تین چار فرلانگ آگے آ گیا تھا کہ میری نظر دو شخص کے ہیولے پر پڑی۔ وہ دونوں سڑک کی دوسری جانب کھڑے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دونوں وہی ہیں۔ دوسری جانب ہونے کی وجہ سے مجھے دیکھ نہیں پائیں گے۔ اندھیرے نے مجھے کیموفلاج کر رکھا تھا۔ میں مزید جھک کر آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد مجھے وہ آبادی نظر آ گئی۔ چھوٹے بڑے گھروں پر مشتمل اس آبادی میں وہ گھر بالکل الگ نظر آ رہا تھا۔ اس عمارت کو حویلی کہا جا سکتا تھا۔ میں دبے قدموں اسی حویلی کی طرف بڑھنے لگا۔ حویلی کے گرد چھ فٹ اونچی دیوار تھی۔ عام آدمی کے لیے وہ فصیل ہوگی مگر میرے لیے ایسی دیوار کیا

حیثیت رکھتی، ایک ہی جمپ میں اس دیوار پر پہنچ گیا پھر دوسری طرف اتر گیا۔ میں ننگے پاؤں تھا اس لیے دھمک کا سوال نہ تھا۔

دوسری جانب اترتے ہی میں نے اس کھڑکی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا جس سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ میں گربہ پا چلتا ہوا اس کھڑکی تک پہنچا پھر دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر تک سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا پھر اندر جھانکا، اندر ایک دو نہیں، تقریباً بیس نوجوان ہوں گے، سب کے سب مسلح تھے۔ خباثت بھرے چہروں والے...... وہ سب جیسور کینٹ پر حملہ کرنے، افراتفری پھیلانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ میں ان کی ایک ایک بات کو ذہن میں نوٹ کر رہا تھا کہ میرے داہنے شانے پر مگدر سا پڑا اور میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں پھرتی سے مڑا تھا۔ میرے پیچھے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، اسی لاٹھی سے اس نے میرے سر پر وار کیا تھا۔ عین وقت پر میں کچھ جھک گیا تھا ورنہ وہ لاٹھی میرے سر پر بجتی۔ اس نے انجانے میں شیر کی دُم پر پیر رکھ دیا تھا، سزا تو بھگتنا ہی تھی۔ میں نے اچھل کر اس کی گردن پکڑ لی تھی اور بلا تکلف دباتا چلا گیا تھا۔

جب وہ میرے ہاتھوں پہ جھول گیا تو میں نے اسے اچھال دیا، گو کہ یہ لڑائی بے آواز تھی پھر بھی لوگ اندر سے نکل نکل کر باہر آ رہے تھے اس لیے میں وہاں سے نکل بھاگا مگر میرا رخ سڑک کی طرف نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں اُدھر گیا تو گھر جاؤں گا۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ آسان راہ کو پسند کرتا ہے، وہ لوگ بھی مجھے ڈھونڈنے کے لئے آسان راستے پر جائیں گے اسی لئے میں نے دشوار راہ چن لی۔ بجائے سڑک کی طرف جانے کے، میں سامنے والے احاطے میں داخل ہو گیا تھا۔ احاطے میں داخل ہوتے ہی میں نے عمارت کی طرف دوڑ لگا دی تھی اور ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے کمرے میں کود گیا تھا۔

کمرا بالکل خالی تھا۔ میں نے مزید اندر جانے، دوسرے کمروں کو چیک کرنے کی بجائے پھرتی سے کھڑکی بند کی تھی اور دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس عمارت میں کتنے افراد ہیں، یہ گھر کس کا ہے، کتنے لوگ ہیں، باہر کیا ہو رہا ہے، مجھے کچھ پتا نہ تھا، بس غیبی امداد کے سہارے وہاں چھپا ہوا تھا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک زنانہ آواز سنائی دی۔ ''کیا ہوا، باہر اتنی بھاگ دوڑ کیوں ہو رہی ہے؟'' سوال بنگلہ میں کیا گیا تھا، جواب بھی بنگلہ میں آیا۔

''لگتا ہے، پاک فوج نے حرامیوں کو گھیر لیا ہے۔'' اس جواب نے مجھے خوش کر دیا کہ یہ

گھر کسی محبِ وطن کا ہے۔ بنگالیوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان کی بقا چاہتی تھی اور مکتی باہنی کو، ہندوستانیوں کو گالیاں دیا کرتی تھی۔ گویا اس گھر میں، میں محفوظ ہوں پھر بھی میں اسی طرح دیوار سے چپک کر کھڑا رہا۔

"اللہ کے بندے باہر نکل کر تو دیکھو، یہیں سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہو۔" اسی عورت کی آواز آئی۔

"اچھا بھئی اچھا، میں باہر جا رہا ہوں۔" پھر قدموں کی آواز دور جانے لگی۔ میں مطمئن ہو گیا۔ گو کہ ان سے خطرہ نہیں تھا مگر اضطراری طور پر وہ چیخ کر لوگوں کو جمع بھی کر سکتے تھے۔

خطرہ ٹلا تو میں دوبارہ کھڑکی تک جانے کا سوچنے لگا تا کہ باہر کی خبر لوں مگر ابھی پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا تھا کہ تیز چیخ گونجی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے عورت کے سینے میں چھری ماری ہو۔ میں اچھل پڑا تھا اس لئے کہ وہ آواز میرے عقب سے آئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ وہ اسی کمرے میں آ گئی تھی مگر اس دروازے سے نہیں جس کے پیچھے میں کھڑا تھا۔ وہ اس دروازے سے داخل ہوئی تھی جس طرف میری پیٹھ تھی۔ اسے چیختے دیکھ کر میں نے گھبرا کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ "اللہ کی بندی خاموش ہو جا۔ میں فوجی افسر ہوں۔"

میں اسے خاموش کرنے کے لئے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا کہ میری پیٹھ پر گھونسا پڑا۔ "کمینے، کتے، جھوٹ بولتا ہے۔"

میں پھرکی کی طرح گھوما۔ ایک درمیانی عمر کا آدمی کھڑا تھا۔ اس نے میرے گال پر طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ "ہماری فوج ہاتھ جوڑ ہی نہیں سکتی۔"

غصہ تو پہلے ہی چڑھ رہا تھا، عورت پر ہاتھ اٹھا نہیں سکتا تھا اس لئے مرد کے منہ پر پنچ مارا۔ پنچ پڑتے ہی اس کے منہ سے خون نکلنے لگا مگر اس نے جوابی کارروائی نہیں کی بلکہ ہتھیلی کی پشت سے منہ صاف کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں، اب یقین آیا تم ہمارے فوجی ہو۔ ایسا کرارا ہاتھ انہی کا ہوتا ہے۔" پھر بیوی سے بولا۔ "مومنہ، جا، جا کر چائے بنا، ہمارے گھر میں مردِ مجاہد آیا ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں بچھی چارپائی پر بٹھا لیا تھا۔

"آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ تم میرے فوجی نہیں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ارے بابا، سیدھا سیدھا جواب ہے کہ ہماری فوج سر کٹا سکتی ہے، ہاتھ نہیں جوڑتی۔"

"بھائی! سامنے یہ تھیں، ان جیسی عورتیں تو ہماری سلامتی کے لئے دعا کرتی ہیں پھر میں کیسے ان پر ہاتھ اٹھا دیتا؟"

اس نے سوج گئے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ "مگر میرا تو تھوبڑا ہی بگڑ گیا ہے۔"

"معافی چاہتا ہوں، دراصل میں پہلے ہی جان گیا تھا کہ یہ گھر محبِ وطن کا ہے اسی لئے ہاتھ ہلکا رکھا تھا۔"

"جب رات ہے ایسی متوالی تو صبح کا عالم کیا ہوگا۔ ہلکے ہاتھ میں پورا جبڑا ہل گیا، ہونٹ پھٹ گئے۔" وہ پُرمزاح انداز میں بولا۔

میں نے اسے شانے سے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا پھر بولا۔ "اب تو معاف کر دیں۔"

"اچھا چلئے آپ کا بوری قبول کیا۔"

"آں، بوری! کس چیز کی بوری؟" میں نے تعجب بھرے انداز میں کہا۔

"ارے بابا وہی معافی انگلش میں معافی۔"

"اوہ اچھا! آپ سوری کہنا چاہتے ہیں۔"

"یس یس۔" اس نے سر ہلایا۔ اتنے میں اس کی بیوی چائے لے آئی۔ بیوی کے ہاتھ سے کپ لے کر میری طرف بڑھا کر بولا۔ "آپ چائے پیو، میری جورو سے دو چار بوڈی فل بات کرو میں باہر کی خبر لے کر آتا ہوں۔"

اس جملے نے بھی حیران کر دیا۔ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "آپ کی بیوی سے بوڈی فل بات کروں؟"

"یس، یس، خوب صورت باتیں۔" تب میں نے سمجھا کہ وہ بیوٹی فل باتیں کہنا چاہتا تھا۔

ابھی وہ باہر نکلا تھا کہ گولیاں چلنے اور پھر میگا فون پر مجھے پکارنے کی آواز سنائی دی۔ میری قسمت اچھی تھی، مجھے جو وقت دیا گیا تھا، وہ ختم ہو گیا تھا اور کرنل صاحب کمانڈوز کے ساتھ آ پہنچے تھے۔ انہوں نے سیدھے سیدھے اس عمارت پر حملہ کر دیا تھا۔ دشمنوں سے زبردست مقابلہ ہوا تھا۔ مذکورہ گھر تباہ ہو چکا تھا۔ دشمن کے ایجنٹوں کا صفایا ہو گیا تھا۔ کرنل صاحب مجھے وہاں سے نکال لائے تھے مگر یہاں...... یہاں ایسے کسی بندے کے آنے کی امید نہ تھی۔ اگر آتے تو وہی دونوں شوٹر جو مجھے بچانے نہیں، نشانہ بنانے کے لیے آتے۔

ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ بری طرح چونک گیا۔

دفعتاً قدموں کی آواز ابھری تھی۔

یہ آواز نیچے سے آئی تھی۔

میں نے کان لگا دیئے۔

وہ دو آدمیوں کے قدموں کی آواز تھی۔

تبھی کسی نے کہا۔ ”وہ یہاں آیا تھا۔ زخمی بھی ہے۔ یہ دیکھو خون کے دھبے!“

اس آواز نے دہلا دیا۔ گویا موت کے دونوں فرشتے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔

شاید وہ پہلے جھاڑیوں کے سیدھ میں گئے ہوں گے اور اب لوٹ کر یہاں تک آ گئے۔

”ارے یہ دیکھو، گرد پر قدموں کے نشان بھی ہیں۔ اوپر کی طرف جا رہے ہیں۔“ اس آواز کو سنتے ہی کلیجہ منہ کو آ گیا۔

”تم یہیں ٹھہرو میں اُوپر دیکھ کر آتا ہوں، ٹارچ بھی بجھا دو، وہ ہوشیار ہو سکتا ہے۔“

قدموں کی آواز اب اُوپر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں پوری طرح ہوشیار ہو گیا۔ دیوار سے بالکل چپک کر کھڑا ہوا تھا۔ پیچھے ہٹنے کی وجہ سے میرے پیروں سے کوئی چیز اُلجھی تھی۔ میں نے جھک کر اسے اٹھایا تو دل خوش ہو گیا۔ وہ تار تھا، اسکوٹر کا کلچ وائر۔ تقریباً دو فٹ کا ہو گا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کے دونوں سرے لپیٹ لیے۔ اب وہ ایک خطرناک ہتھیار بن گیا تھا۔ اب میں پوری طرح قدموں کی آواز کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

قدموں کی آواز اب راہ داری میں آ رہی تھی پھر وہ آواز کمرے کے دروازے پر آ کر رک گئے۔ شاید اس نے گرد پر بنے قدموں کے نشان سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اسی کمرے میں ہوں۔

میں نے دروازے اور فرش کے درمیان کے خلا میں دیکھا ہلکی روشنی اندر تک آ رہی تھی۔ شاید اس کے ہاتھ میں پنسل ٹارچ تھی پھر وہ روشنی بجھ گئی۔ میں مزید ہوشیار ہو گیا کیوں کہ دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ پھر پستول کی نال کی جھلک نظر آئی اور ایک سر داخل ہوا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، بڑی احتیاط سے داخل ہو رہا تھا۔

دروازے کے پیچھے کھڑا میں پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ یہ لمحہ ہی اتنا تناؤ بھرا تھا، اعصاب جواب دے رہے تھے۔ میدان جنگ میں لڑنا، تڑاتڑ گولیاں چلانا آسان ہے مگر اس طرح دشمن

کا انتظار بہت مشکل ہے۔ میں نے کلچ وائر کے دونوں سروں کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور دونوں ایڑیوں پر کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگا، بالآخر ایک ڈیڑھ سکنڈ بعد وہ اندر آ گیا مگر جیسے ہی اس نے اندر قدم رکھا، میں نے اچھل کر اس کی گردن میں وائر سے حلقہ کیا اور پھر اسے کستا چلا گیا۔ آنے والا لڑکھڑایا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ شکار کرنے آیا تھا اور خود شکار ہو گیا تھا۔ یہی تو اس دنیا کا قانون ہے، جو کمزور پڑا، وہ شکار ورنہ شکاری۔

میں پوری قوت سے تار کے دونوں سروں کو کھینچ رہا تھا۔ دشمن بری طرح مچل رہا تھا، تڑپ رہا تھا۔ آزادی کی کوشش کر رہا تھا مگر میں نے ذرا بھی موقع نہیں دیا اور سروں پر اتنی قوت صرف کی کہ اس کی دونوں آنکھیں باہر ابل پڑیں۔

اس کا زور لگاتا جسم ساکت ہو گیا اور وہ لہراتا ہوا زمین پر گرتا چلا گیا۔

اس سے فرصت پا کر میں نے تار کو گچھے کی شکل دی۔ اسے لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔ اب یہی میرا ہتھیار تھا اسی سے آگے بھی کام لینے تھے۔ اس زور آزمائی میں مَیں بری طرح تھک گیا تھا۔ زخم کی پٹی پر نظر ڈالی وہ پھر سرخ ہو گئی تھی۔ اس کی طرف توجہ دینا فضول تھا، میں نے ادھر سے نظریں ہٹا کر لاش کی طرف نظر ڈالی۔ وہ سیدھا سیدھا دروازے پر پڑا تھا۔ وہ جب نیچے نہیں جائے گا تو اس کا ساتھی اُوپر ضرور آئے گا۔ اس کی نظروں سے لاش کو چھپانا ضروری تھا۔ میں نے لاش کو کھینچ کر دروازے کے پیچھے دھکیلا تا کہ اندر گھسنے کے ساتھ لاش نظر نہ آئے پھر پہلے کی طرح دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ اس کا ساتھی اسے ڈھونڈتا ہوا اُوپر ضرور آئے گا۔

ابھی زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ گونجی پھر آنے والا دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے پہلے آواز دی۔

”گھوش، او گھوش۔“ پکارتا ہوا دروازے کے اندر داخل ہوا۔

میں سمجھ گیا کہ مرنے والے کا نام گھوش تھا۔ تیسری بار وہ آواز دیتا کہ میں نے ریوالور کا دستہ پوری قوت سے اس کے سر کی گدی پر مارا۔ وہ چیختا ہوا زمین پر گرا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

”ہنہ، مجھے تر نوالہ سمجھ کر شکار کرنے آئے تھے اور خود شکار ہو گئے۔“ میں نے اسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا پھر وہیں بیٹھ کر پٹی بدلنے لگا۔ اس بار میں نے پٹی کے لیے بے ہوش شخص کی

قمیص کو پھاڑا تھا۔

اس کام سے فرصت پا کر میں سیڑھیوں سے نیچے اترتا چلا گیا۔

اُس عمارت سے نکل کر میں باہر آیا، ہر طرف اندھیرا تھا، ماحول پر سکوت طاری تھا۔ میں نے دور جھلملاتی روشنیوں پر نظر ڈالی۔ پتا نہیں، وہ کون سا علاقہ تھا؟ میں اُسی طرف بڑھنے لگا۔

مجھے امید تھی کہ میں زخمی ٹانگ کے ساتھ بھی یہ فاصلہ طے کرلوں گا۔ اگر میں وہاں تک پہنچ گیا تو راجا بازار کے لیے رکشا، ٹیکسی ضرور مل جائے گی۔ میں اِسی خیال سے لنگڑاتا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھتا چلا گیا۔

ناہموار راستہ، زخمی پیر، پھر بھی میں نے کافی فاصلہ طے کرلیا تھا۔ اب سڑک زیادہ دور نہ تھی۔ میں نے کچھ دیر سستانے کا فیصلہ کیا اور وہیں ایک طرف بیٹھ گیا۔

گوکہ میں نے بہت زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا، بہت زیادہ پیدل نہیں چلا تھا پھر بھی تھکن مارے ڈال رہی تھی۔ شاید یہ بہت زیادہ خون نکل جانے کا اثر تھا۔ میں نے ٹٹول کر پٹی کو دیکھا، وہ چپچپا رہی تھی۔ گویا خون اب بھی رس رہا تھا مگر میں رکا نہیں، چلتا رہا۔

وہ رات......

اُس رات کو میں بھول نہیں سکتا، رینگنے کی رفتار سے میں چل رہا تھا، فاصلے سمٹ رہے تھے، سمٹتے ہوئے فاصلے نے بالآخر مجھے اُس جگہ پہنچا دیا جسے سڑک کہہ سکتے ہیں۔

یہ سڑک نہ پختہ تھی اور نہ کچی، برسوں پہلے کولتار سے بنی ہوگی مگر اب چھوٹے بڑے کھڈوں کا مجموعہ تھی۔ آثار بتا رہے تھے کہ دن بھر میں ایک دوبار کوئی نہ کوئی سواری گزرتی ہوگی مگر اُس وقت وہ ٹوٹی پھوٹی سڑک کسی عاشق کے دل کی طرح ویران نظر آ رہی تھی۔

جدھر سے روشنی نظر آئی تھی، میں اُدھر ہی بڑھنے لگا۔ وہ روشنیاں اب اور واضح ہو چکی تھیں۔ کلو، دو کلومیٹر کا فاصلہ رہا ہوگا کہ میرا دل دھڑک اٹھا۔ عقب سے گھنٹی کی آواز آئی تھی۔

میں نے دیکھا تھا، اس کلکتے میں جو رکشے چلتے تھے، وہ نہ تو آٹو انجن سے چلتے تھے اور نہ سائیکل والے پیڈل سے، اُسے آدمی کھینچتے تھے۔

رکشا کھینچنے والے کے ہاتھ میں ایک بڑا سا گھنگھرو ہوتا تھا جسے وہ دوڑتے دوڑتے بجاتا تھا۔ یہ مخصوص آواز رکشے کی پہچان تھی۔ اُس وقت میں نے جو آواز سنی تھی، وہ بھی کسی رکشا کی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تھا، واقعی وہ کسی رکشے کا ہیولہ تھا جو نزدیک آتا جا رہا تھا۔ میں اپنی

جگہ کھڑا ہوگیا۔ کچھ وقت گزرا تھا کہ رکشا نزدیک آ گیا۔ اُسے قریب دیکھ کر میں نے کہا۔

''بھائی......! راجا بازار چلو گے؟''

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔'' اُس نے جلدی سے کہا۔ اُس کی عجلت سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اُدھر ہی جا رہا تھا۔

رکشے والے نے اگلا حصہ زمین پر رکھ دیا تھا۔ یہ اشارہ تھا کہ میں اُس پر سوار ہو جاؤں اور میں سوار ہوگیا۔ رکشے والے نے آگے لگے لمبے لمبے دونوں ڈنڈوں کو اپنی دونوں بغلوں میں دبا کر دباؤ ڈالا پھر دوڑنے لگا۔ ٹوٹی ہوئی سڑک، جابجا اینٹ پتھر کے ٹکڑے، رکشے کا پہیہ اچھل اچھل جاتا مگر رکشے والا بے پروا سا دوڑ رہا تھا۔

اگر میں زخمی نہ ہوتا تو کبھی رکشے میں نہ بیٹھتا۔ وہ رکشا نہیں، انسانیت کی تذلیل تھی۔ پہلی بار ایسے رکشے کو دیکھ کر میں نے یہی سوچا تھا مگر ابھی مجبوری تھی، اِسی لیے پچھلی سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ رکشے والا دوڑتا رہا۔ رکشا آگے بھاگتا رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ہم پکی سڑک پر پہنچے۔

سڑک پر آتے ہی میری متلاشی نظریں دکانوں کے بورڈز پر پھسلنے لگیں کہ انگریزی میں لکھا ایک بورڈ نظر آ گیا، تب پتا چلا کہ اُس وقت ہم بیلیا گھاٹا نامی علاقے میں ہیں مگر یہاں سے راجا بازار کتنی دور ہے، یہ پتا نہیں تھا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ جیب بھی چیک کرلوں، کہیں افراتفری میں روپے گر نہ گئے ہوں۔

میں نے پینٹ کی پچھلی جیب کو ٹٹولا اور اطمینان ہوگیا، جیب پھولی ہوئی تھی۔ اِس جیب میں سو سو روپے کے تقریباً بیس نوٹ رکھے تھے جواب بھی موجود تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ رکشے والے کو اتر کر سو روپیا دے دوں گا جو اُس کے لیے نعمت ہوگا۔ میں نے دیکھا تھا کہ لوگ دو تین روپے سے زیادہ کرایہ اَدا نہیں کرتے تھے۔

میں سوچ میں ڈوبا بیٹھا تھا کہ رکشے والے نے اپنی رفتار کم کرنا شروع کردی۔ اِس رکشے میں ایک خرابی یہ بھی تھی کہ یہ یکلخت نہیں رکتا، اِسے کھینچنے والا آہستہ آہستہ اس کی رفتار کم کرتا تھا۔ میں نے ازراہِ تجسس پوچھ لیا۔ ''کیوں بھائی! رک رہے ہو کیا؟''

''جی بابو جی......! مجھے پیشاب کرنا ہے، یہاں سناٹا ہے، آرام سے فارغ ہو جاؤں گا۔ بڑی سڑک پر بیٹھا تو پولیس والے چالان کردیں گے، پانچ روپیا جرمانہ دینا ہوتا ہے۔ ہم غریب

کہاں سے اُدا کریں گے؟''

رکشا روک کر وہ سڑک کنارے جا بیٹھا۔ میں اُس کے لوٹنے کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ یکا یک ہی دو نوجوان اندھیرے سے نکلے اور رکشے کی دو طرف کھڑے ہو گئے۔ ہلکی روشنی میں اُن کے ہاتھوں میں پکڑے استرے نظر آ گئے۔ یہ کون ہیں، کیا چاہتے ہیں، ابھی میں پوچھنے ہی والا تھا کہ اُن میں سے ایک بولا۔ ''گھڑی اور پرس میرے حوالے کر دو......''

میں نے ناقد نظروں سے اُن کا جائزہ لیا پھر بولا۔ ''کیوں بھئی، ایسا ظلم کیوں کر رہے ہو؟''

''استرا دیکھا، ابھی گال پر لکیر بن جائے گی۔'' داہنے جانب کھڑے ایک قد آور جوان نے کہا۔

''اور اگر میں نہ دوں تو......؟'' میں نے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''لگتا ہے، استرا گال کی جگہ شہ رگ پر چلے گا......''

''اگر تمہیں پرس چاہیے تو یہ لو......'' رکشے سے نیچے اترتے ہوئے میں نے کہا۔

یہ دو نوجوان میرا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ نیچے اترتے ہی داہنی جانب کھڑا نوجوان میری زد پر آ گیا۔ میں نے اترتے ہی ہاتھ چلا دیا تھا۔ اپنی کلائی سے اُس کی کلائی پر مارا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا استرا تھا جو چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ اپنے ساتھی کی حالت دیکھ کر دوسرا نہایت تیزی سے میری طرف بڑھا۔ درمیان میں رکشا تھا، وہ گھوم کر آیا تھا۔ میں پہلے سے تیار تھا۔ جیسے ہی نزدیک پہنچا، میں نے زخمی ٹانگ پر وزن ڈالا اور دوسری ٹانگ اٹھا کر پوری قوت سے گھوم گیا۔ میرے جوتے کی نوک اس کے چہرے سے ٹکرائی۔

جوتے کی سختی، گھومنے کی قوت، اس کا تھوبڑا بگڑ گیا، منہ سے خون کی چھینٹیں نکل آئیں۔

وہ ہائے ہائے کرتا ہوا بیٹھ گیا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ رکشے والا جو کچھ دوری پر بیٹھا پیشاب کرنے کا ڈراما کر رہا تھا، اپنے ساتھیوں کو پٹتے دیکھ ان کی مدد کو آ گیا۔ آتے ہی اس نے گھونسا چلایا مگر اس کا گھونسا مجھ پر کیا پڑتا، میرے گھونسے نے اس کا مزاج پوچھ لیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے کہا۔ ''کیوں بیٹے! یہ اوور ٹائم لگا رہے تھے ناں، شہریوں کو لوٹنے کا اچھا طریقہ نکالا ہے۔''

جواب میں اس نے ایک موٹی سی گالی دی، اس گالی نے کمال کر دکھایا۔ میری رگوں میں خون کی جگہ غصہ دوڑ گیا اور میں نے گالی کا جواب دینے کے نام پر ایسا گھونسا رسید کیا جو اس کے

لیے یقیناً یادگار رہا ہوگا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ وہ پیچھے ہٹا تو اس کا پہلا ساتھی جس نے لات کھائی تھی، میری طرف دوڑا بالکل ایسے جیسے وہ ٹکر مار کر مجھے گرا دے گا۔ میں نے فوراً ہی اس کا جواب دیا۔ پوری قوت سے اس کے سر پر گھونسا مارا اور وہ ایک ہی گھونسے میں زمین پر گرا۔ کچھ دیر تڑپا پھر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ اب دو بچ گئے تھے، میرے لیے ان دونوں کی کوئی حقیقت نہ تھی مگر میں زخمی بھی تھا، گولی لگی تھی، ڈھیر سارا خون بہا تھا بلکہ اب بھی بوند بوند رس رہا تھا جس کی جانب میری توجہ نہیں تھی۔ غصہ پاگل پن کی ایک قسم ہے، پاگل پن میں درد تکلیف ہوا ہو جاتی ہے، انسان خونخوار ہو جاتا ہے، میں بھی خونخوار بن چکا تھا اور ان دونوں کو خونی نظر سے گھور رہا تھا۔ وہ دونوں اب سہمے سہمے نظر آ رہے تھے۔ یہ میرے حق میں بہتر تھا۔ میں نے مزید رعب ڈالنے کے لیے کہا۔ ''اگر مرنے کی تمنا ہے تو ٹھہرے رہو، پٹتے رہو اور اگر زندگی عزیز ہے تو موقع کا فائدہ اٹھاؤ اور نو دو گیارہ ہو جاؤ......''

شاید وہ بھی فرار چاہتے تھے، میرا جملہ ختم ہوتا کہ اُن دونوں نے دوڑ لگا دی۔ رکشے کو بھی لینا گوارہ نہ کیا۔ میں اکیلا کیا کرتا، سو میں نے قدم بڑھا دیئے۔ کچھ دور چلنے کے بعد اسٹریٹ لائٹ کی قطار نظر آ گئی۔ میں نے قدم تیز کر دیئے جبکہ مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا پھر بھی لنگڑاتے ہوئے بڑھتا جا رہا تھا۔ سڑک پر پہنچتے ہی ایک چائے خانہ نظر آ گیا۔ اس چائے کی دکان کے سامنے ایک ٹیکسی بھی کھڑی تھی، اس ٹیکسی نے میرے جوش کو آواز دے دی۔ میں مزید تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ رکشے والے کی حرکت نے مجھے ہوشیار کر دیا تھا۔ لٹیرے ہر ملک، ہر جگہ ہوتے ہیں مگر یہاں کے لٹیرے تو پلانرز تھے۔ کتنی عمدہ پلاننگ کی تھی، ویران جگہ پر کھڑے ہو گئے کہ اکیلا راہی ملے گا تو اُسے لوٹ لیں گے۔

انہوں نے تو لوٹ لیا ہوتا اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا۔ یہ تو میری قوتِ ارادی تھی کہ زخمی ہوتے ہوئے بھی میں نے مقابلہ کیا۔ کہیں یہ ٹیکسی والا بھی لٹیرا نہ ہو، اسی شش و پنج میں ڈوبا ہوا میں اس دکان تک پہنچ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور سردار تھا، اس سکھ سے میں نے کہا۔ ''بھائی......! راجا بازار چلو گے؟''

''آہو......'' اس نے چائے کا سِپ لے کر کہا۔

میں نے وقت گنوانا مناسب نہیں سمجھا اور دروازہ کھول کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ اس طرح دکان میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی میری طرف متوجہ نہیں ہوئے۔

سردار جی نے مجھے دس منٹ میں راجا بازار پہنچا دیا۔ شیر علی شیرو کی گلی کے سامنے اترتے ہوئے میں نے کرایہ ادا کیا اور اس کے گھر میں داخل ہو گیا۔ گھر میں تقریباً تمام لوگ موجود تھے۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ ''یار شیر علی! یہاں کوئی ایسا ڈاکٹر ہے جس پر تم اندھا اعتماد کر سکو؟''

''ہاں، کیوں نہیں، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ ہیں ناں، سرجن ہیں، سرجن......''

''تو چلو، اُن سے پٹی کراتے ہیں۔ میں گر گیا تھا، کافی چوٹ آئی ہے۔'' میں نے دروغ گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''ارے، تو پھر وقت کیوں برباد کر رہے ہو، جلدی چلو۔'' وہ مجھے ساتھ لے کر مسجد کے پاس آیا۔ وہیں وہ نرسنگ ہوم تھا۔

ڈاکٹر نے زخم کا معائنہ کرتے ہی کہا۔ ''میاں! یہ زخم سلاخ کے چبھنے کا نہیں ہے، یہ گولی کا زخم ہے۔ خیر مناؤ، میرے پاس آ گئے، کسی اور ڈاکٹر کے پاس جاتے تو پولیس کیس بنا دیتا۔''

ڈریسنگ کروا کر لوٹا تو سخت بھوک کا احساس ہوا۔ یہاں کی دکانیں ساری ساری رات کھلی رہتی تھیں۔ شیرو نے لڑکے کو بھیج کر کھانا منگوا لیا۔ کھانا کھا کر میں لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ تقریباً تمام لوگ اپنی اپنی روزی کی تلاش میں نکل چکے تھے۔ کمرے کے فرش پر یہاں سے وہاں تک قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک کونے پر میں لیٹا ہوا تھا دوسرے کونے پر شیرو کا ایک نوکر نئے آئے قالین کے باہر نکلے دھاگوں کو کاٹ رہا تھا۔ اس کے برابر میں ٹرانسسٹر رکھا ہوا تھا جس سے گانے نشر ہو رہے تھے۔ شاید آل انڈیا ریڈیو تھا وہیں سے وہ گانے آ رہے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری توجہ ادھر چلی گئی۔ گانے کے بول کچھ یوں تھے۔ ''اے میرے وطن کے لوگوں، تم آنکھ میں بھر لو پانی، جو شہید ہوئے ہیں ان کی ذرا یاد کرو قربانی......''

اس گانے نے میری آنکھوں میں بھی پانی بھر دیا۔ مجھے وہ دوست یاد آنے لگے جنھوں نے اپنے آپ کو، پاک وطن کی حفاظت کے نام پر، قربان کر دیا تھا۔ پتا نہیں ایسے کتنے ساتھی ہوں گے جن کو قبر تک نصیب نہیں ہوئی ہو گی۔ اس افراتفری کے ماحول میں کتنے ہی جوان شہید ہوئے ہوں گے۔ مختلف مورچوں پہ، شہر سے دور اہم چوکی پر بھی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں

تعینات تھیں جب ان کو واپسی کا حکم ملا ہو گا تو ان میں سے بہت سارے لوگ واپس نہیں پہنچ پائے ہوں گے۔ کچھ جوان ملٹری لاء کے خلاف جوش میں آگے بڑھ گئے ہوں گے۔ انہوں نے ہتھیار ڈالنے کی بجائے اپنی قربانی پیش کر دی ہو گی اور اگر ان کی لاش دشمن کے ہاتھ لگی ہو گی تو...... میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ اناؤنسر کی آواز گونجی ''اب سنیں باقی کے پیغامات۔ ان پاکستانی فوجی قیدیوں کے جو انہوں نے اپنے پیاروں کو بھیجے ہیں۔'' ''پہلا پیغام ہے، میجر سجاد زیدی کا۔'' پھر ایک مردانہ آواز گونجی ''السلام علیکم۔ علی شاہ کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے تو......'' بس اتنا سنتے ہی میں چونک گیا۔ اپنا نام سن کر کون نہیں چونکتا ہے۔ میجر صاحب کو بھی میں پہچان گیا تھا۔ جیسور سیکٹر جوائن کرنے کے بعد پہلے میں نے انہی کو رپورٹ کی تھی۔ انہی کی کمانڈ میں مجھے کام کرنا تھا مگر بعد میں مجھے دوسرے سیکٹر میں بھیج دیا گیا تھا۔ اتنے دنوں بعد بھی مجھے ان کی آواز پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے مخصوص لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہے تھے۔ ''علی شاہ کو جہاں تعینات کیا گیا تھا وہ وہاں سے واپس نہیں آیا۔ شاید کسی محفوظ ٹھکانے پر ہو گا فکر نہ کریں وہ بھی جلد آ جائے گا۔''

میں سمجھ گیا کہ میرے گھر سے کسی نے پیغام دیا ہو گا جس کا انہوں نے جواب دیا ہے۔ یقیناً میرے گھر والے میرے بارے میں بہت پریشان ہوں گے۔ میری نئی نویلی بیوی تو کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گی۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے مجھے شہید سمجھ لیا ہو۔ میرا سوئم چالیسواں بھی کر لیا ہو۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا۔ لیٹا ہوا بس ایک ہی نکتے پر غور کیے جا رہا تھا۔ پھر پتا نہیں کب میری آنکھ لگ گئی اور میں نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔ میں بے خبر سو رہا تھا کہ میں نے دیکھا، میری جان سے پیاری دلہن سرخ کپڑوں میں ملبوس چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی بڑھی آ رہی ہے۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی ہیں۔ اسے دو طرف سے اس کی دو سہیلیوں نے تھام رکھا ہے۔ وہ آگے بڑھنا نہیں چاہتی یا پھر اس کے قدموں میں حیا کی زنجیر ہے جو اسے آگے بڑھنے نہیں دے رہی ہے۔ مگر اس کی سہیلیاں اسے زبردستی آگے بڑھا رہی ہیں۔ وہ زار زار رو رہی ہے اور اسے چپ کرانے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ سب خوشی سے سرشار ہیں۔ اپنے آپ میں مست ہیں۔ جھوم رہے ہیں۔ گا رہے ہیں۔ میں اسی کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ ہزار جان سے نثار ہو رہا ہوں۔ مگر وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی۔ بس روئے جا رہی ہے۔ تبھی دیکھتا ہوں

ایک اجنبی آگے بڑھتا ہے اور اسے بانہوں سے پکڑ کر لے جانے لگتا ہے۔ وہ بار بار مچل رہی ہے۔ آگے جانے سے اپنے آپ کو روک رہی ہے مگر وہ شخص اسے کھینچنے لگتا ہے۔ میں آگے بڑھتا ہوں کہ میری امی مجھے روک لیتی ہیں کہ نہیں بیٹا اس پر اب تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ کسی اور کی ہو چکی ہے۔

ایسا بھیانک خواب دیکھ کر کسے چین پڑتا ہے؟ میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ میری چیخ پر شیرو کا نوکر گھبرا کر کہتا ہے "کیا ہوا؟"

اب میں اسے کیسے بتاتا کہ اگر میں جلد گھر نہیں پہنچا تو میری دنیا لٹ جائے گی۔ میں برباد ہو جاؤں گا۔ مجھے جلد سے جلد اپنے گھر گلگت پہنچنا ہے۔ مگر یہ بات میں اسے بتا نہیں سکتا تھا، اس لیے بولا "بس میں خواب میں گھبرا گیا تھا۔" کہہ کر میں اٹھ گیا۔ اب مجھے شیر علی شیرو کا انتظار تھا کہ وہ آ جائے تو میں جا کر گلفام سے مل لوں۔

ابھی میں گلفام سے ملنے، اس تک پہنچنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کا انداز بے ڈھنگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دستک دینے والا کسی پریشانی میں ہے یا بہت جلدی میں ہے۔ میرے دل میں وسوسے نے سر اٹھایا، کہیں وہی شوٹر نہ ہو۔ اسے ہوش آ گیا ہو اور وہ بدلہ لینے کے لیے سیدھا یہاں آ پہنچا ہو، اس لیے کہ انڈر ورلڈ میں یہی ہوتا آیا ہے کہ مارو یا مر جاؤ۔ وہ مرا نہیں تھا، اس لیے مارنے آ پہنچا ہو کیونکہ میں ابھی زندہ ہوں، میری زندگی اس کے لیے موت ہے۔ اس کی ایامِ حیات کے صفحات پر سیاہی بکھیرنے کے لیے کافی ہے۔ گلفام اس ناکامی پر اسے موت کا تحفہ ضرور دے گا۔ ہر شخص زندہ رہنے کا خواہش مند ہے، خود زندہ رہنے کی خاطر وہ مجھے مارنے آ گیا ہو، اسی سوچ کے تحت میں نے پاکٹ سے رول کیے ہوئے تار کو نکالا، اسی تار کو جو اس کے ایک ساتھی کی موت کا پروانہ بن چکا تھا پھر اسے کھول کر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا تاکہ حملہ آور کے گلے میں فوراً ڈال کر کس دوں۔ اس تیاری کے ساتھ میں آگے بڑھا تبھی دروازے کو پھر دھڑ دھڑایا گیا۔ اب تک میں نے یہ تک نہیں پوچھا تھا کہ باہر کون ہے؟ اس پاگل پن کا مظاہرہ کون کر رہا ہے؟ بس خاموشی سے گربہ پا چلتا ہوا دروازے تک پہنچا تھا اور کنڈی کھول کر پھرتی سے داہنی جانب سرک گیا تھا تاکہ دروازہ کھلتے ہی میں کواڑ کی آڑ میں ہو جاؤں اور آنے والا فوراً مجھے نہ دیکھ سکے۔

☆======☆======☆

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اور ہے، میرا اندازہ سو فیصد غلط نکلا تھا۔ اندر آنے والی ہستی کو دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

میں نے خواب و خیال میں بھی نہ سوچا تھا کہ اسے میں دوبارہ دیکھ سکوں گا مگر وہ ہستی میرے سامنے موجود تھی۔

تمام حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھی۔

میرے ہوش و خرد کو لوٹنے کے لیے موجود تھی۔ مجھے ایسا لگا، وہ آسمان سے اتری ہے، میں زمین سے اگا ہوں اور خلا میں ہم مل رہے ہیں۔ حیرت کے خلا میں۔

میں نے اسے فرشی بستر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر اس کے ساتھ کھڑے آدمی سے کہا۔ "آپ بھی بیٹھیے......"

"اپن کو کام ہے، چلتا ہے، سلام صاب!" وہ مشینی انداز میں بولا اور باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی میں نے مڑ کر پوچھا۔ "ریکھا......! تم......! تم یہاں کیسے؟ یہ گھر کا پتا کس نے دیا؟"

میرا اتنا پوچھنا غضب ڈھا گیا۔ اس کے صبر کا بند ٹوٹ گیا۔

جب بند ٹوٹتا ہے تو گاؤں کے گاؤں بہہ جاتے ہیں۔

اس کی آنکھوں کے سیلاب میں مجھے اپنا قرار بہتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا، تسلی دینا چاہی تھی کہ وہ پیر تسمہ پا بن گئی۔

آکٹوپس کی طرح مجھ سے لپٹ گئی۔

ایسا لگا جیسے وہ مجسم میرے اندر سما جانا چاہتی ہو۔

سینے کا پنجرہ توڑ کر دل میں کھب جانا چاہتی ہو۔
ساتھ ہی ساتھ رونا بھی تواتر سے جاری تھا۔

کچھ بھی ہو، میں مرد اور وہ نوخیز کلی...... مرد بھی ایسا جو نوعروس کو گھر چھوڑ آیا ہو، جسم کی مہک سے واقف بھی اور ترسا ہوا بھی ہو، ایسی حالت میں مجھ پر کیا گزر رہی ہوگی؟ اس کا اندازہ خود کریں۔ اس کی ہر سسکی پر میرے اندر تلاطم کا پیدا ہونا فطری تھا۔ کہیں میں جذبات کے گرداب میں نہ پھنس جاؤں، اس لیے جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا پھر مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کسی بھی وقت کوئی بھی آسکتا ہے۔ کمرا مردوں کا تھا، کبھی بھی، کوئی بھی آسکتا تھا پھر ایسے کمرے میں کسی عورت کا ہونا پورے محلے میں میرا کردار مشکوک کر سکتا تھا۔ برابر کا پورشن اس وقت خالی تھا کیونکہ اس میں بھی چھڑے بندے تھے لیکن نیچے کے پورشن میں دو فیملی تھیں، وہاں تک آواز پہنچ رہی ہوگی، وہ کیا سوچ رہی ہوں گی؟ کوئی ٹھیک نہیں کہ بچے کو بھیج کر کسی کو خبر دے چکی ہوں گی۔ عام طور پر لوگوں کی سوچ سطحی ہوتی ہے، وہ غلط مطلب فوراً لیتے ہیں۔ رونے کی آواز سن کر سوچا گیا ہوگا کہ...... اب میں اپنی زبان سے کیا کہوں، قارئین خود سمجھ لیں۔

خیر، اس افتاد پر گھبرا کر میں نے جھٹکے سے خود کو چھڑایا پھر کہا۔ ''وہ پانی ہے، پی کر دماغ ٹھنڈا کرو پھر باتیں ہوں گی۔''

وہ پانی پینے کے لیے مٹکے کی طرف بڑھی۔ دراصل اس وقت فریج ہمارے ہاں (پاکستان میں) عام نہ تھا تو ان کے ہاں کہاں دکھتا؟ وہاں مٹی کے مٹکے رائج تھے۔ وہ پانی لینے کے لیے اُس طرف بڑھی اور جھٹکے سے مڑ گئی۔ اس نے ناک پونچھتے ہوئے کہا۔ ''جمائی دا......! یہ...... یہ گھر تو مسلمان کا ہے۔''

''ہاں......! تم نے کیسے اندازہ لگایا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ...... یہ پیالہ...... مسلمان پیالے میں پانی پیتے ہیں۔'' اس نے کہا تو مجھے یاد آیا کہ اس کے ہاں اور دوسرے ہندوؤں کے ہاں یا تو پیتل کا گلاس دیکھا تھا یا پیتل کا چھوٹا سا بغیر ٹونٹی کا لوٹا۔

''تو کیا ہوا، اِس وقت یہی ہمارے دوست ہیں، اِن کے یہاں ہی محفوظ ہوں۔''

''مگر مجھ سے اس میں پانی پیا نہیں جائے گا۔''

میں نے دیکھا تھا، اکثر ہندو برتن منہ سے ایک بالشت دور رکھ کر حلق میں پانی کی دھار

گرا کر پیتے تھے جسے وہ ''پان کرنا'' کہتے۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''تو پان کر لو۔''

اس نے ناک سکوڑ کر کہا۔ ''ایں ہیں...... میاں لوگ (مسلمان) منہ تو لگاتے ہوں گے۔'' اس کے نفرت بھرے انداز پر میرے دماغ میں ایک سڑی ہوئی انتہائی غلیظ گالی گونج کر رہ گئی پھر بھی میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''جب زندگی بچانے کا سوال آجائے تو سب کچھ جائز ہے۔ آنکھ بند کر کے پی لو۔''

کئی بار کی استدعا کے بعد اُس نے دو گھونٹ پانی پیا پھر میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ تب میں نے پوچھا۔ ''ہاں، اب بولو، کیا بات ہوئی جو تم اکیلی کلکتہ آگئیں؟ میرا ٹھکانہ کیسے تلاش کر لیا؟''

''وہاں...... گھر پہ ایک قیامت گزر گئی ہے۔ کل رات تین آدمی گھر میں گھس آئے۔ ان سب کے ہاتھ میں رام داؤ (بغدا) تھے۔ انہوں نے دیدی کو پکڑ لیا تھا۔ وہ آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ دیدی نے کچھ بتانے سے معذوری کا اظہار کیا تو ان کے سر پر داؤ سے مارا پھر ماں کو اور آپ کے بچوں کو مارا۔ جب وہ لوگ باپو کو قتل کر رہے تھے تو میں بھاگ نکلی۔ گرمی کی وجہ سے میں چھت پر سوئی تھی، وہیں سے یہ سب تماشا دیکھا، خوف سے میں اسی وقت پرنالے کے پائپ سے پیچھے اتر گئی اور بھاگتی ہوئی ''آم بگان'' جا پہنچی۔''

''چیخ پکار ضرور مچی ہوگی؟ کیا کوئی بھی مدد کے لیے نہیں آیا؟''

''ہر گھر میں اجالا دیکھا، سب جاگ گئے ہوں گے مگر کسی نے ہمارے گھر آنے کی جرأت نہیں کی یا پھر دروازے پر بھی کچھ غنڈے ہوں گے، جنہوں نے انہیں بھگا دیا ہوگا۔ پیچھے کی طرف پوکور (تالاب) اور جھاڑیاں تھیں جن کی آڑ لے کر میں چھپتے چھپاتے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی۔''

''آم بگان اور اسٹیشن کے درمیان تو کافی فاصلہ ہے، وہاں سے اسٹیشن کیسے پہنچی؟''

''قسمت اچھی تھی، گورانگو مل گیا، وہی گورانگو جو پڑوس میں رہتا ہے۔ بازار میں جس کی دکان ہے جس نے ایک بار آپ کو اپنی دکان میں چائے پلائی تھی، مجھے خوش کرنے کے لیے یاد آیا؟ وہ راج دوت پر تھا، اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''جلدی بیٹھو۔'' میں اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھ گئی۔''

''تو کیا راج دوت پر یہاں تک آئیں؟''

"نہیں، وہ ہوا کی تیزی سے کچی سڑک سے ہوتا ہوا "بوگیلا" پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے سفر میں اس نے بہت کچھ بتایا۔ اس کا کہنا تھا کہ سنڈیکیٹ والے پاگلوں کی طرح تمہارے بہنوئی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ اگر وہ نہیں ملا تو تمہارے سب گھر والوں کو مار دیں گے۔ تمہیں بوگیلا میں اپنے ایک رشتے دار کے ہاں پہنچانے جا رہا ہوں، تم وہیں رہنا۔" اسے میرے گھر میں آئی قیامت کی خبر نہیں تھی۔ اس کی معلومات پرانی تھی۔

"مگر تم یہاں تک کیسے پہنچیں؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"صبر کرو، بتا رہی ہوں۔ رات کا آخری پہر تھا اس لیے میں اس کے رشتے دار کے گھر میں ٹھہر گئی اور وہ واپس چلا گیا۔ میرا پورا پریوار (خاندان) قتل ہو چکا تھا، مجھے نیند کیا آتی۔ گورانگو نے بتایا تھا کہ سنڈیکیٹ والوں کے قتل میں آپ اور ہمانشو ملوث ہیں۔"

"مختصر مختصر یہ بتاؤ کہ یہاں کیسے پہنچی؟" اس کی تمہید سے میں اکتا رہا تھا۔

"وہی بتا رہی ہوں، انیل نے بتایا تھا کہ آپ ہمانشو کے ساتھ اس کے ہوٹل میں گئے ہیں۔ پھر لوگوں سے سنا کہ ہمانشو کے کمرے میں قتل ہو گیا ہے اور آپ کے ساتھ فرار ہو گئے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں جب جلپائی گوڑی میں تھی وہاں ہمانشو سے کئی بار ملاقات ہوئی تھی، وہیں اس نے بتایا تھا کہ اس کی ایک بیوی شیام بازار میں رہتی ہے۔ نمبر بھی بتایا تھا جو حافظے میں محفوظ تھا۔ مجھے یقین تھا، آپ یہیں ہوں گے، بس میں شیام بازار پہنچ گئی۔" اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔

اس کی ہنسی پر مجھے حیرت ہوئی۔ جس کا باپ قتل ہو گیا، ماں ماری گئی، بہن اور بھانجی ختم ہو گئی، وہ اس طرح ہنس رہی ہے؟ مگر میں نے کچھ کہا نہیں، صرف اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "مگر ہمانشو تو میرے اس گھر کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ تم ٹھیک یہاں کیسے پہنچ گئیں؟"

اس نے اسی طرح بھید بھری مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔ "جمائی وا......! دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ اسی دن تم میرے دل میں بس گئے تھے جب تم نے مجھے لڑکی کی قطار سے نکال کر عورت کی صف میں کھڑا کیا تھا۔ عورت بہت کچھ کھو کر بہت کچھ پاتی ہے۔ میں نے بھی کنوارپن کھو کر تمہیں پایا ہے۔ بھگوان خود چاہتا ہے، تم میرے رہو، اسی لیے شیام بازار پہنچتے ہی تمہارا پتا مل گیا۔" ابھی وہ اور لاف گزاف کرتی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے گھبرا کر

پوچھا۔

"کون......؟"

"کانا سلطان...... اُپن کانا سلطان ہے۔ مجھ کو بھائی نے بھیجا ہے، مہمان کے واسطے ناستا دے کر۔" باہر سے آواز آئی۔

"آجاؤ دروازہ کھلا ہے۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔

"جی اچھا۔" کہتے ہوئے باہر کھڑے شخص نے دروازے کو ہلکے سے دھکا دیا، دروازہ کھل گیا۔ ایک کالا کلوٹا جس کے چہرے پر استرے کے زخم کے لمبے لمبے دو داغ تھے، ہاتھ میں کاغذ کے تھیلے لیے داخل ہوا۔ اس نے تھیلے میری طرف بڑھائے پھر بولا۔ "چاند بھائی بولا ہے کہ آپ کو جو جرورت ہو، بولو، سب پورا ہوگا۔ اب اس علاکے (علاقے) کا بھائی چاند میاں ہے۔ یہاں کا چوکی اس کا ہے۔ چاند بھائی بولا ہے، آپ کو بہوت عجت (بہت عزت) دیا جائے۔"

"کیوں بھائی، ایسا کیوں؟ یہ چاند بھائی کون ہے، میں تو اسے جانتا بھی نہیں ہوں۔"

"ابو میاں سالا بجدل تھا، آپ سے مار کھا گیا، جو مار کھا جاتا ہے، اسے پاڑے میں رہنے کا حک (حق) نہیں ہے۔ چوکی کھالی (خالی) کرنا پڑتا ہے۔ گلفام بھائی نے اس کا چوکی چاند بھائی کو دے دیا۔ اسے پاڑے سے نکال دیا۔"

"اچھا تو یہ گلفام کی مہربانی ہے۔"

"یہ لو، آپ کو کھبر (خبر) نہیں؟ آپ سے گلفام بھائی بہت کھوس (خوش) ہے۔ بھائی نے آپ کو سیر (شیر) کہا ہے سیر، اس کا داہنا باجو (بازو) سلیمان اس بہن کو سیام باجار سے لے کر آیا ہے۔"

اب سمجھا کہ ریکھا سیدھی یہاں کیسے پہنچ گئی۔ میں نے لفافہ کھول کر پلیٹ میں انڈیلا، سموسے، جلیبی، نمک پارے، شکر پارے اور امرتی تھیں۔ میں نے سب کچھ نکال کر کہا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، تم جاؤ، ہاں، باہر والے سے چائے کا کہتے جانا۔"

"آتے آتے میں چائے کا بول آیا۔ چائے لے کر وہ آتا ہی آتا۔" کہہ کر وہ لوٹ گیا۔

اس کے جاتے ہی میں نے اشارہ کیا۔

"لو کھاؤ، پتا نہیں کب سے تم نے کچھ کھایا نہیں ہوگا؟"

"نہیں، پہلے منہ میٹھا کراؤ۔" ریکھا نے شوخی سے کہا۔

"جلیبی، امرتی، شکر پارے، اتنا کچھ میٹھا ہے، جو مرضی ہو، اٹھا کر منہ میٹھا کرلو۔"

"اوں ہوں...... اس میں مٹھاس کہاں، مجھے تو یہ والی مٹھاس چاہیے......" کہہ کر وہ میرے چہرے پر جھکی تھی کہ میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"ارے، ارے، تم تو ایسے بدک رہے ہو جیسے مجھے پائیوریا ہے، منہ سے بدبو آتی ہے۔"

"یہ مردانہ کمرا ہے، ذرا تہذیب سے، کبھی بھی کوئی آ سکتا ہے۔" میں نے منمناتی آواز میں کہا۔ دراصل اس کی حرکت پر میرے خون کی روانی بڑھ گئی تھی۔ حلق اس طرح خشک ہوگیا تھا جیسے گلے میں بلاٹنگ پیپر ٹھونس دیا گیا ہو، کانٹے سے آگ آئے ہوں، پپڑیاں درک رہی ہوں۔

میں نے تھوک نگل کر حلق تر کرنے کی کوشش کی پھر بولا۔ "جب تک یہاں ہو، خود پر قابو رکھو۔"

"یہ لو، دل پر بھی کبھی قابو رہا ہے، یہ تو وہ ہرجائی ہے جو کبھی اپنا نہیں ہوتا، بس ایک پل میں کسی اور کا ہو جاتا ہے، دھڑکتا کسی سینے میں ہے، اور دھڑکن کسی اور کے نام کی ہوتی ہے۔ یہی حال میرا ہے، تمہیں دیکھتے ہی یہ باورا من تال بدل دیتا ہے۔"

"اس من کو سمجھاؤ، دل کو بتلاؤ، اک ذرا سی غلطی زندگی بھر کا روگ لگا دیتی ہے اور ڈائلاگ کم کم بولو۔"

"روگ، ہاں پریم روگ لگا دیتی ہے، روگی بنا دیتی ہے، میں بھی جانتی ہوں کہ ہر عہد میں یہی ہوتا آیا ہے کہ پریم روگی کو موت ملتی ہے خواہ لیلیٰ مجنوں ہوں یا شیریں فرہاد، وامق عذرا ہوں یا ہیر رانجھا، رومیو جیولیٹ ہوں یا سسی پنوں، سب کی قسمت موت ٹھہری...... یہی میں نے ناولوں میں پڑھا ہے۔"

"گویا تم نے مرنے کی ٹھان لی ہے؟"

"اگر موت تمہاری بانہوں میں آئے تو وہ بھی قبول ہے۔" اس نے نہایت رومانی انداز میں کہا۔

پتا نہیں یہ لڑکی ہے یا ذہنی معذور...... پل بھر میں ٹریک سے اتر جاتی ہے، یہی کچھ سوچتا ہوا میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ بولی۔ "میں ابھی تک سمجھ نہیں پائی ہوں کہ تم یکا یک بدل

کیوں گئے ہو؟ کہاں تو میرے نام کی مالا جپتے تھے۔ اگر دیدی کا ڈر نہ ہوتا تو مجھے دل میں سمائے رکھتے اور اب میری ذرا سی پہل پر ایسے بدک رہے ہو جیسے گھوڑا، سانپ کو دیکھ لے......"

"ہر پھل کا موسم ہوتا ہے، ہر چیز کا وقت، یہ وقت محبت کے اظہار کا نہیں ہے۔" میں نے اُسے سمجھانا چاہا۔

"ارے واہ......! اتنے دنوں بعد ملے ہو، آزادی کے ساتھ ملے ہو تو کیا میں اپنی محبت کا اظہار بھی نہ کروں؟" وہ جھنجلا کر بولی۔

"اظہارِ محبت کے لیے زندگی پڑی ہے۔" میں نے سمجھ لیا تھا کہ ریکھا پیر تسمہ پا بن چکی ہے۔ اب میرے لیے رہائی ممکن نہیں۔ وہ کسی حال میں میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اب میں اس کا کیا کروں؟ کہاں رکھوں؟ کیونکہ یہ کمرا مردانہ تھا۔ میں خود شیرو کے رحم و کرم پر تھا۔ اس کا مہمان بن کر ٹھہرا ہوا تھا۔ اگر ریکھا کو اس کمرے میں ٹھہراتا ہوں تو شیرو کہاں رہے گا؟ اس کے دونوں نوکر کہاں جائیں گے؟ گویا وہ ایک بڑا مسئلہ بن کر آئی تھی، اس مسئلے سے نجات کی راہ بھی سجھائی نہیں دے رہی تھی۔

ابھی میں اسی نکتے پر غور کر رہا تھا کہ یکا یک ذہن میں عادل کی شبیہہ تھرک اٹھی۔ اس کی بیوی کا عکس ابھر آیا۔

اس کے ساتھ اسے ٹھہرا سکتا تھا مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں سے چڑتی تھی۔ اس کی ایک مثال پانی و پیالہ کی شکل میں سامنے تھی۔ جب پیالے میں پانی پینے کی روادار نہ تھی تو اس کے ساتھ کھانے پینے پر کیسے تیار ہوگی؟ پھر بھی میں نے اسے ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش کی۔ "ریکھا......! ایک بات جانتی ہو؟"

"جی بولیں......" وہ دیوار پہ لٹکے آئینے کے سامنے کھڑی بکھری لٹوں کو صحیح کرتے کرتے بولی۔

مجھے حیرانی تھی کہ یہ کس قماش کی لڑکی ہے؟ اتنے بڑے سانحے کو ایسے بھلا بیٹھی ہے جیسے یہاں پکنک پر آئی ہے تبھی میرے دل نے کہا۔ بے وقوف، یہ یہاں کی مٹی کا اثر ہے۔ میر جعفر کی مثال بھول گیا، اس نے بہنوئی نواب سراج الدولہ اور بہن کو کس کسمپرسی کی حالت میں شہید کرایا تھا۔ ڈھاکا سے جیسور آتے ہوئے بوڑھی گنگا اور سیتا لکھا ندی کو نہیں دیکھا تھا کہ ایک ساتھ بہتے ہوئے بھی دونوں کے پانی مل نہیں پا رہے تھے، الگ الگ سمت میں بہہ رہے تھے۔

جہاں کی ندی کا پانی مل نہ پاتا ہو، وہاں لوگوں کے دل کیا ملیں گے؟ ان کی تو فطرت میں گلا کاٹنا ہے، اسی لیے اس نے اتنے بڑے سانحے کو اتنی آسانی سے بھلا دیا، میں نے بھی یاد دلانے کی کوشش نہیں کی اور آنے والے وقت کی پیش بندی کے طور پر بولا۔ ''اس وقت ہم دونوں کی جان خطرے میں ہے۔ سنڈیکٹ والے ہمیں قتل کرنے کے لیے کتے کی طرح ہماری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ وہ ہر اس جگہ ہمیں ڈھونڈ رہے ہوں گے جہاں ہم چھپ سکتے ہیں۔''

''بات تو صحیح ہے۔'' اس نے سر ہلا کر کہا۔

''مگر انہوں نے خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ ہم مسلمانوں کی شرن (حفاظت) میں ہوں گے۔''

''ہاں، ہم برہمن کسی ملیچھ میاں (گندے مسلمان) کے گھر میں کیسے رہ سکتے ہیں؟ واہ......!'' اس نے ہنس کر جواب دیا۔

''اسی لیے میں چاہتا ہوں، دو چار دن کے لیے تمہیں کسی مسلمان فیملی کے ساتھ ٹھہرا دوں۔''

''یہ بھی تو مسلمان کا گھر ہے، میں یہیں ٹھہر جاتی ہوں۔''

''یہ گھر مردوں کا ہے، تم کیسے رہوگی؟ برابر میں ہی عادل کا گھر ہے، اس کی بیوی بھی ساتھ ہے۔ تم وہاں ٹھہر جاؤ ورنہ کہو تو میں ہمانشو کے گھر بھیج دوں، وہاں رہ لینا۔''

''نہیں، نہیں، سنڈیکیٹ کے لوگ اس کو بھی ڈھونڈ رہے ہیں پھر وہ تمہارا نام بھی سننے پر تیار نہیں۔ مجھے جس طرح دھتکارا تھا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ وہ تو بھلا ہو گنیش کا جس کے حوالے ہمانشو کتے کے بچے نے مجھے کر دیا تھا کہ تم خود اس سے نمٹو، یہ آنند کی سالی ہے۔ شاید وہ وہاں کا غنڈا تھا۔ اس نے آپ کا نام سنتے ہی بڑی عزت دی۔ ایک نوجوان کو بلا کر بولا کہ یہ گلفام بھائی کے خاص آدمی آنند جی کی سالی ہیں، انہیں ان کے پاس پہنچا دو، گلفام نے کسی سلیمان سے کہا کہ اس لڑکی کو راجا بازار پہنچا دو۔ ایسے کمینے آدمی ہمانشو کے ساتھ ٹھہرنے کا مطلب موت ہے......''

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ یہ زندگی بھی عجیب ہے، زندگی ہے تو ہزار شکوے، ہزار تہمتیں، جیسے ہی زندگی پر پکڑ ڈھیلی پڑے، زندگی کا زندانی مچل اٹھے، تڑپ اٹھے، ہاتھ بڑھا بڑھا کر اسے پکڑنے کی کوشش کرے، اس وقت یہ بھی زندگی جانے کے خوف سے کیسے

مسلمانوں کے ساتھ رہنے پر تیار ہو گئی ہے؟

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر والا چائے لے آیا۔ چائے کی کیتلی لیتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔ ''جاتے جاتے عادل کے گھر میں کہتے جانا کہ شیرو کے مہمان نے آپ کو بلایا ہے۔''

''جی، اچھا۔'' کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ریکھا سے کہا۔

''چلو چائے نکالو۔''

''چائے تو نکالوں گی مگر یہ ایک بار پھر بتا دوں کہ میں اب تمہارے ہی ساتھ رہوں گی۔'' اس نے اس طرح کہا جیسے وہ میری حاکم ہے۔

''اچھا بابا، میرے ہی ساتھ رہنا مگر اس کمرے میں نہیں تمہیں میں برابر والے گھر میں ٹھہراؤں گا۔ بس ایک دو دن کی بات ہے جیسے ہی نیا گھر ملا میں تمہیں اپنے ساتھ رکھ لوں گا۔''

''ہاں، یہ ہوئی نہ مردوں والی بات۔'' اس نے خوش ہو کر کہا۔

ابھی ہم چائے کی چسکی لے ہی رہے تھے کہ عادل کی بیوی آ گئی۔

''بھائی! آپ نے بلایا؟ وہ تو ہیں نہیں۔'' میرے بلانے پر وہ ایسے دوڑتی ہوئی آئی تھی جیسے میری زرخرید ہو۔

''ان صاحبہ کو تم اپنے یہاں رکھ لو۔ یہ ابھی گاؤں سے آئی ہیں، بعد میں گھر لیتے ہی میں انہیں لے جاؤں گا۔''

میری بات سنتے ہی اس نے معنی خیز انداز میں ریکھا کو دیکھا پھر بولی۔ ''آؤ بہن، چلو۔'' اس وقت بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ میں بھی کوئی بدکردار آدمی ہوں۔ اسی لیے میں نے اسے اشارے سے کہا کہ وہ ریکھا کو گھر پہنچا کر میرے پاس آ جائے۔

ریکھا کو میں نے عادل کے گھر بھیج دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ عادل کی بیوی اسے سنبھال لے گی۔ عورت کی نفسیات عورت ہی بہتر جانتی ہے۔ اس پاگل لڑکی کو کیسے سنبھالا جائے یہ وہ خود سمجھ لے گی۔ ابھی میں اسی بات پر غور کر رہا تھا کہ عادل کی بیوی واپس آ گئی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ''بھائی صاحب، اسے آپ کہاں سے پکڑ لائے، یہ تو بڑی خطرناک لگ رہی ہے۔''

''کیوں کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو ایسے باتیں کر رہی ہے جیسے آپ کی بیوی ہو۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

"اس کے اوپر کی منزل خالی ہے۔" میں نے اپنے سر پر انگلی گھماتے ہوئے کہا۔ "اس پر نظر رکھنا، اور ہاں، یہ یاد رکھنا، وہ مجھے ہندو سمجھتی ہے۔ اس کے سامنے مجھے آنند بابو کہنا۔ کسی طرح میں اسے اس کے گھر پہنچا دوں تو سمجھو آزادی ملی۔ یہ میرے دوست کی سالی ہے۔"

"اچھا!" اس نے گویا اطمینان کی سانس لی۔

"میری چھوٹی بہن رشیدہ بھی یہی کہہ رہی تھی کہ آپ بہت شریف آدمی ہیں یہ لڑکی خود ہی آپ کے گلے پڑی ہوگی۔"

مجھے اس کی بہن کے کمنٹ سے کیا مطلب تھا، اس لیے جلدی سے بولا۔ "ہاں، یہ ایک مصیبت میں پھنس گئی تھی، میں وہاں سے نکال کر لایا ہوں۔"

"آپ سب کو مصیبت سے نکالنے کے لیے رہ گئے ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دنیا اسی کا نام ہے۔ اگر لوگ ایک دوسرے کی مدد نہ کریں تو یہ دنیا مصائب کا گھر بن جائے۔ خیر، تم گھر جاؤ ورنہ وہ سوچے گی کہ پتا نہیں کیا کرنے لگی۔"

"میں آتے وقت بہن سے بول کر آئی تھی کہ میں بازار جا رہی ہوں۔ وہ بھی اسی کے پاس بیٹھی تھی۔"

"بہن کو بھی سمجھا دینا کہ وہ یہ راز نہ کھولے کہ میں مسلمان ہوں۔ عرصہ کی دوستی ہے، اس کا بہنوئی بھی مجھے ہندو سمجھتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ دوستی میں رخنہ آئے اور وہ نفرت پر آمادہ ہو جائے۔"

"ملعونوں سے دوستی میں اتنا آگے بڑھنا نہیں چاہیے۔"

"بزنس میں ایسا کرنا ضروری ہے ورنہ کتنے ہی ہندو ہم مسلمان تاجروں کا پیسا مار کر ڈکار بھی نہ لیں۔" میں اسے جلد سے جلد بھگانا چاہتا تھا اور وہ خوامخواہ گلے پڑ رہی تھی۔ تنگ آ کر کہا کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ ہوٹل جا رہا ہوں۔

"ارے واہ، ہوٹل کیوں جائیں گے، میرے گھر چلیے۔ رشیدہ نے کھانا بنا لیا ہوگا۔ دو چار لقمے آپ بھی لے لیجیے گا۔" وہ کسی طور پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ اکیلے گھر میں عورت، لوگوں کو شک میں مبتلا کر سکتا تھا۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"چل رہے ہیں چلیے اس بہانے آپ ہمارے یہاں کا کچھ کھا بھی لیں گے۔ اصولاً ہمیں آپ کو مٹھائی بھجوانا چاہیے تھا۔" اس نے ہاتھ نچا کر کہا۔

اب میری سمجھ میں آ چکا تھا کہ ابو میاں نے اسے کیوں اغوا کیا تھا اسی لیے تو کہتے ہیں کہ عورت شرگیں رہے تو بحفاظت رہتی ہے۔ کچھ بھی ہو میں اس کے لیے نامحرم تھا اور وہ مجھ سے کس بے حجابی سے باتیں کر رہی تھی۔ مردوں سے زیادہ فری ہونا ہی خطرے کو دعوت دینا ہے۔

اس کے بہت زور دینے اور ریکھا کے بارے میں تازہ معلومات کے لیے میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

اس کا گھر پڑوس میں ہی تھا اس لیے فوراً ہی ہم پہنچ گئے۔

ابھی ہم جا کر بیٹھے ہی تھے کہ ریکھا آ دھمکی۔ اس کے چہرے پر ذرا بھی رنج و غم کے آثار نہ تھے۔ وہ پوری طرح تر و تازہ لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کسی تیز رفتار میل کی طرح بولنا شروع کر دیا۔ "اب بولو اتنی دیر سے میں انتظار کر رہی ہوں اور آپ اب آئے ہو۔ میرا کچھ خیال ہی نہیں۔ یہ کوئی شرافت تو نہ ہوئی۔"

وہ مجھ پر ایسے دعوا کر رہی تھی جیسے میں سچ مچ اس کا شوہر ہوں۔ اس کے ناز و ادا معراج پر تھے۔ وہ اپنی قاتل اداؤں سے مجھے گھائل کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اگر اس میں مَیں ذرا بھی کشش محسوس کرتا تو شاید میں اس ادا پر نثار ہو جاتا۔ مگر اس کی بے حجابی، اس کی خود سپردگی نے میرے دل میں اس کے لیے اچھے خیال کو جگہ نہیں دی تھی۔ جو بغیر کچھ سوچے سمجھے اپنے آپ کو غیر مرد کے سامنے پیش کر دے، وہ قابلِ بھروسہ نہیں ہوتی، اسی لیے میں اس سے بھاگ رہا تھا۔

میرے چہرے پر ابھر آئی ناپسندیدگی کو اس نے محسوس نہیں کیا مگر عادل کی بیوی نے تاڑ لیا۔ شاید اسی لیے وہ جلدی سے بولی۔ "ریکھا جی کے پاس کپڑے تو ہیں ہی نہیں، اگر آپ کہیں تو میں ان کو بازار سے دلا دوں، سامنے ہی بازار ہے۔"

میں خود اس سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ فوراً بولا۔ "میں اسی لیے تو آیا ہوں۔ یہ لو پیسے۔" کہتے ہوئے میں نے جیب سے نوٹوں کا بنڈل نکالا ہی تھا کہ ریکھا نے جھپٹ کر پوری رقم لے لی، ایسے جیسے اس کے باپ کی رقم ہے۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ یہ اپنے میاں کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ میں نے ایک بات اور محسوس کی تھی کہ نوٹ دیکھ کر عادل کی بیوی کی آنکھوں میں بھی چمک آ گئی تھی۔ اس نے ایسی نادیدہ نظروں سے دیکھا تھا کہ میں بتا نہیں سکتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کا میاں ایک خوانچہ فروش تھا، اس نے ایک ساتھ اتنی رقم کب دیکھی ہوگی۔

رقم لے کر ریکھا نے عادل کی بیوی سے کہا۔ "حمیدہ آپا، چلیے، دو چار اچھی ساڑیاں

اور کچھ دوسری چیزیں لینی ہیں۔"

"ارے بھائی، اس بنڈل میں کئی ہزار روپے ہیں۔ اتنا کیا کرو گی۔ ایسا کرو صرف ایک ہزار رکھ لو، اتنا بہت ہے۔" میں نے کہا

تو وہ بولی۔ "ایک ہزار سے کیا ہوگا۔ تم دیدی کو دو دو ہزار کی شاپنگ کراتے تھے، مجھے ایک ہزار؟"

"اچھا بابا، ایسا کرو، تین ہزار لیتی جاؤ مگر سب کا تم اپنے لیے خریداری مت کرنا۔ ان کو بھی ایک ساڑی دلا دینا۔" میں نے کہا تو وہ جھٹ بولی۔

"یہ تم مجھے بتاؤ گے۔ میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ ایک ساڑی ان کے لیے اور ایک سوٹ رشیدہ کے لیے لینا ہے۔"

وہ آپ سے تم پر آ گئی تھی۔ میں نے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا اور اسے جلدی جانے کا کہا تاکہ میں جا کر آرام کروں۔ وہ دونوں جانے کے لیے اٹھی تھیں کہ میں بھی کھڑا ہو گیا۔

مجھے کھڑا ہوتے دیکھ حمیدہ بولی۔ "ارے بھائی صاحب، آپ کہاں چلے۔ میں نے رشیدہ کو کہہ دیا ہے، وہ سالن گرم کر رہی ہے۔" پھر میرے قریب آ کر آہستہ سے بولی۔ "مغل اعظم ہے اسی لیے ریکھا کو ہٹا لیا۔"

کلکتہ میں گائے کے گوشت کا کوڈ نام مغلِ اعظم ہے، یہ میرے علم میں تھا اس لیے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کہاں تو میں بڑے گوشت سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ کہہ کر انکار کر دیتا تھا کہ یہ بادی ہے۔ نقصان کا باعث بنے گا اور اب ڈھونڈ کر کھانے لگا تھا کیونکہ با آسانی مل نہیں رہا تھا۔ گھر کا پکا ہوا ہے، یہ سوچ کر میں وہیں بیٹھ گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ پاکستان پہنچ کر گائے کا گوشت خوب خوب کھاؤں گا وہ دونوں باہر نکل گئیں مگر ریکھا فوراً ہی لوٹ آئی۔

اس کے چہرے پر شیطانیت کھیل رہی تھی اس نے قریب آ کر مسکراتے ہوئے نیچی آواز میں کہا۔ "میں بہت برا سلوک کروں گی اگر میرے حق پر ڈاکہ پڑا۔"

"میں سمجھا نہیں، تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" میں نے تعجب بھرے لہجے میں کہا۔ واقعی اس کی بات میں سمجھ نہیں پایا تھا۔

"زیادہ انجان نہ بنو، میں تمہیں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ رشیدہ بہت خوبصورت ہے، اسے دیکھ کر تمہاری نیت ڈانواں ڈول ضرور ہوگی۔ دو چار روز بعد بھلے ہی تم اس سے رابطہ

بڑھا لینا مگر ایک ہفتہ تک تم میرے صرف میرے ہو۔"

اس وقت میرا دل چاہا کہ گھما کر ایک ہاتھ ایسا دوں کہ مزاج درست ہو جائے۔ مجھے بھی اپنے بھائی بندوں جیسا سمجھ رہی تھی، کمین فطرت کا۔ غصہ پر قابو رکھ کر صرف اتنا کہا۔ "اچھا بابا، اب تم جاؤ۔"

ایسا لگ رہا تھا کہ رشیدہ اسی انتظار میں تھی کہ وہ باہر نکلے تو کھانا لے کر داخل ہو۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں اندر تک ہل گیا۔ پتا نہیں، اللہ تعالیٰ کیا دکھانا چاہتا تھا؟ مجھے کس طرح آزمانا چاہتا تھا؟ وہ بلا کی حسین تھی، حسین بے شمار لڑکیاں ہوں گی مگر ایک اور بات تھی جس نے مجھے لرزا دیا تھا۔ اس لڑکی میں میری بیوی کی شباہت تھی۔ وہی ٹھوڑی، وہی ہونٹوں کا کٹاؤ، وہی پھولے پھولے گال، وہی گوری رنگت۔ اگر کچھ فرق تھا تو یہ کہ رشیدہ کی رنگت کچھ دبی ہوئی سی تھی۔ برفیلے علاقے کی ہوتی تو اس کی رنگت بھی کھل جاتی پھر اس کی آنکھیں بھی میری بیوی سے زیادہ بڑی تھیں۔

گویا رشیدہ میرے امتحان کا سوالنامہ تھی۔ میری آزمائش کا سامان تھی۔ میں نے سر جھکا کر کہا۔ "تم بھی بیٹھ جاؤ۔"

وہ اسی چوکی پر بیٹھ گئی۔ اس کی یہ ادا بھی مجھے پسند آئی تھی کہ اس کی آنکھوں میں حیا کے دیپ جل رہے تھے۔ چہرے پر معصومیت کا پرتو تھا۔ لقمہ اٹھاتے ہوئے میں نے دیکھ لیا تھا۔ وہ جھکی جھکی نظروں سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر واقعی میرے دل میں جذبوں کی بجلی کڑکی تھی، رگوں میں پسندیدگی کا طوفان مچلا تھا، دماغ میں چاہت کی قوسِ قزح جاگی تھی اور میرے اندر کا مرد انگڑائیاں لینے لگا تھا مگر میں خاموش آہ بھر کر رہ گیا جو دل سے اُٹھی اور دل میں ہی دم توڑ گئی تھی۔ ایسی آہ رعبِ حسن ہی ممکن بناتی ہے۔

بعض لڑکیاں اس قدر حسین، اس قدر نفیس، اتنی باوقار اور کچھ ایسا رعبِ حسن لیے ہوتی ہیں کہ مرد اُن کی تمنا تو کرتے ہیں لیکن چھوتے ہوئے ہمت نہیں ہوتی۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ عورت چھونے ہی کے لیے بنائی گئی ہے پھر بھی وہ رعبِ حسن سے تھرا جاتے ہیں۔ نظر بھر کر دیکھ بھی نہیں پاتے۔

رشیدہ بھی حسن کا ایسا مجسمہ تھی کہ اس کے اَنگ اَنگ سے رعبِ حسن پھوٹتا تھا۔ جو پاگل بنانے کے لیے کافی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میری تمام چاہتیں جذبۂ اظہار سے خالی رہیں۔

چاہے جانے کی تمنا ہر جواں دل میں ہلکورے لیتی ہے۔ یقیناً اس کے دل میں بھی جذبے کی بیل پروان چڑھنے کی تمنائی تھی مگر حالات کی جکڑ بندھ نے موقع نہیں دیا ہوگا۔ اس کا بہنوئی خونچہ فروش تھا۔ دیگر رشتے دار بھی اسی قبیل کے ہوں گے۔ اب جو خوشحال شخص نظر آیا، پیٹ بھر کر روٹی ملنے کا آثار دکھائی دیا تو جوان جذبے بھی اُمنڈنے لگے۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے کہا۔ ''میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔ تمہاری باجی آ جائیں تو آ جاؤں گا۔''

جملہ ختم کر کے میں نے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے لاتعداد جگنو اُس کی آنکھوں میں جگمگا اُٹھے ہوں پھر یک دم ہی وہ چمک ماند پڑ گئی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں ناچتے ہوئے مور نے گویا اپنے پیر دیکھ لیے۔ اس کے لب کتاب کے اوراق کی طرح پھڑ پھڑائے۔ ''کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اتنی جلدی چلے جائیں؟''

''کیوں؟ اِس میں کیا قباحت ہے؟''

میں نے اُس کے بگلے کے پروں جیسے گورے ہاتھ پر نظروں سے استر کاری کرتے ہوئے کہا حالانکہ میں خود اچھی طرح جانتا تھا کہ اس میں اڑچن کہاں ہے۔

رشیدہ جوانی کی دہلیز پر پہنچ چکی تھی۔ مردوں کی نظروں کو پہچاننے لگی تھی۔ اسی تجربے نے میرے جھوٹ کو پکڑا تھا۔ نظروں کے فرق ہی سے تو اس نے پہچانا تھا۔ اس وقت بھی جب میری نظروں کو اپنے ہاتھ پر پھسلتے، گوری کلائی پر پھیلے ریشم جیسے سنہرے روئیں میں سرسراتے پایا تو اس نے تپش سے محظوظ ہوتے ہوئے اپنے ہاتھ کو تہہِ چادر کر لیا۔

اس حرکت کو میں نے بھی محسوس کر لیا تھا اور محجوب ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے شاید مجھے شرمندگی سے بچانا چاہا تھا۔ جھوٹے برتن اٹھا کر بولی تھی۔ ''میں چائے لا رہی ہوں۔ ابھی جایئے گا نہیں۔''

خود میں شش و پنج میں تھا کہ جاؤں کہ نہیں، میں کسی فیصلے پر پہنچتا کہ وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں جسم کو آرام دینے کے لیے تکیہ پر سر رکھ کر وہیں چوکی پر لیٹ گیا۔ اس طرح میں اس کے بارے میں سوچنا بھی چاہتا تھا اور اس کے حسن کی بھیک سے اپنے کاسۂ نظر کو بھرتے رہنا بھی چاہتا تھا۔

ابھی میں لیٹا ہی تھا کہ چائے لے کر وہ آ گئی۔ خلافِ توقع اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ شرمائی شرمائی سی مسکراہٹ۔ حجاب آلود تبسم۔ جھکی جھکی نظروں سے قیامت برپا کر دینے والی مسکراہٹ۔ اس نے طشت کو میرے نزدیک رکھا اور چوکی ہی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''آپ چلے جائیں گے؟'' اس کے لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔ جیسے اس کی دلی تمنا ہو کہ میں یہیں بیٹھا رہوں۔ اس کے ساغرِ حسن سے جرعہ جرعہ اپنی آنکھوں کی پیاس بجھاتا رہوں۔ اسے کمرے میں آتا دیکھ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''انسان کی زندگی کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتی ہے۔ خواہ دوسروں کو آزار پہنچاتے رہو یا مسیحا بن کے انسانیت کے جسم سے کانٹا کانٹا چنتے رہو، زندگی کی شام ہو ہی جاتی ہے کیوں کہ زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر۔ سب کو جانا ہے۔'' کہتے ہوئے میں نے رشیدہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی مگر وہ دو صاف آنکھیں ایسی تھیں جیسے مسجد کا صحن جہاں کوئی گند نہیں صرف ہلکورے لیتا ہوا تقدس تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے وہ بولی۔ اس کا چہرہ حیا کی سرخی سے سج گیا تھا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا۔ چاہا کہ اس کے لال گلابی ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لوں کیوں کہ وہ ہاتھ زبردست تھے اور میرے ہاتھ من مانیوں پر آمادہ تھے۔ دل نے کہا، ہاتھوں کے کٹورے میں اس کے چہرے کو بھر لوں۔ میں ہاتھوں کی گلابیوں سے جامِ اُلفت پینا چاہتا تھا کہ رشیدہ گھبرا کر بیڈ سے نیچے اتر گئی۔

وہ عمر کے اس حصے میں کھڑی تھی جب آنکھوں میں خواب اور دل میں امنگیں جاگتی ہیں۔ اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ گھر اکیلا ہے۔ کمرے میں صرف ایک لڑکا ہے اور وہ ایک لڑکی ہے۔ جب لڑکا اور لڑکی یکجا ہوں تو ہل چل پیدا ہونا ضروری ہے۔ ہل چل جو زندگی کی نوید ہے۔ مگر طریقہ کار غلط ہو تو زندگی میں بھونچال لا دینے کے لیے کافی ہے پھر اس کے دل میں بھی کشش پیدا ہوئی ہوگی ہی اور اس کا ادراک بھی اسے ہو چکا ہوگا کہ اس کے دل کی دنیا میں انقلاب آ چکا ہے اور اس انقلاب کی وجہ میری آنکھیں ہیں۔

ان آنکھوں میں چھپا پیغام ہے۔

یہ پیغام اس کی دنیا جگمگا بھی سکتا ہے اور اجاڑ بھی سکتا ہے۔

مگر اس وقت یقیناً حوصلہ افزا خیالات ہی آ رہے ہوں گے۔ اس کی دھڑکن کی لے میرے نام کی مالا جپنے لگی ہوگی۔ اس کا احساس مجھے اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔

ادھر میرے دل نے بھی بغاوت کر دی تھی۔ وہ کہے جا رہا تھا کہ میں اپنی ہتھیلی کے رحل پر اس کا چہرہ رکھ لوں تاکہ گدگدانے کے انداز میں تجسّس کی انگلیاں اس کے احساس کے گداز حصوں میں کھبنے لگیں۔

لڑکیوں کی حِس مردوں سے بہت تیز ہوتی ہے۔ شاید اس نے میری نظروں کی چبھن کو پکڑ لیا تھا کیوں کہ اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا تھا۔

ہر عکس خود آئینہ ہے کیوں کہ ہر سایہ اپنی زبان بولتا ہے اس کا چہرہ بھی بتا رہا تھا کہ اس کا دل بغاوت پر آمادہ ہے۔ یہ دل اس کے سینے میں صرف دھڑک رہا ہے مگر اس کی ہر دھڑکن میرے نام کی گردان کر رہی ہے جب کہ اسے علم ہوگا کہ میں جتنا قریب ہوں، اتنا ہی دور۔

باہر، آسمان پر سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ گرمی خوب تھی مگر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ٹھنڈی چاندنی گدگدا رہی ہے اور نرم ہوائیں جن میں نامعلوم پھولوں کی باس رچی ہے، کچھ کہہ رہی ہیں۔

یہ دوپہر کی ہوا بھی بڑی ظالم ہوتی ہے۔ تھپک تھپک کر سلا دیتی ہے یا پھر نشہ پلا کے جذبات بھڑکا دیتی ہے۔ مجھے بھی اپنے انگ انگ میں عجیب سی سرسراہٹ، نامعلوم بےخودی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا حل کیا ہو، میں نے سوچا، پھر اس کی طرف دیکھا۔

وہ بھی ننھی بچی تو ہے نہیں، وہ دور گزرے زمانہ گزر چکا ہے۔ بچپن تو کھلونے کی طرح ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی عمر کی مٹھی سے بھی وہ کھلونے کی طرح چھوٹ گیا تھا۔ نوجوانی کی دہلیز بھی چھوڑنے والی تھی۔ اسی دور کو جوانی کے ٹوٹ کر آنے کا دور کہتے ہیں۔ لڑنا جھگڑنا بچپن کی ضرورت ہے تو خواب دیکھنا جوانی کی۔ وہ بھی خواب دیکھا کرتی ہوگی مگر حالات کے عصا نے تمام خوابوں کو بھگا دیا ہوگا لیکن اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اب وہی خواب ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ بھوک کے وقت سوکھی روٹی بھی مزہ دیتی ہے۔ عرصے بعد اس کے دِرِ دل پر دستک ہوئی ہوگی اس لیے وہ من کے دوار کھولنے پر صدفی صد آمادہ تھی مگر حالات کی نزاکت کو بھی محسوس کر رہی تھی۔ کیسے یہ بحرِ آتش پار ہوگی، اسی پر غور کر رہی تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی اور ریکھا لدی پھندی داخل ہوئی۔ اسی وقت رشیدہ کو چھینک آ گئی اور ریکھا تھم گئی۔ اس نے غصے سے رشیدہ کی

طرف دیکھا اور بولی۔ ”کر دی نا بدشگونی۔“

”اے لو، میں نے کیا کر دیا؟“ رشیدہ نے حیرت سے پوچھا۔

”اری بےوقوف، اُدھر میں اندر آئی، اور ادھر تم نے چھینک دیا۔“ ریکھا بولی۔

اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ غصے میں ہے۔ اس دور میں بھی شگون، بدشگونی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ رات رہتے مرغ نے بانگ دے دیا تو بدشگونی، کالی بلی نے راستہ کاٹ دیا تو بدشگونی، گھر سے نکلتے وقت خالی مٹکا نظر آ گیا تو بدشگونی، راستے میں ٹوٹا جھاڑو دیکھ لیا تو بدشگونی، بدصورت بڑھیا دکھائی دے گئی تو بدشگونی یعنی قدم قدم پر شگون بدشگونی کا چکر۔

ریکھا کو یہ بات پسند نہیں آئی ہے اس لیے اس کا موڈ بگڑ گیا ہے، یہ بات میں نے محسوس کر لی تھی اس لیے کہا۔ ”او بی بی، قدرت سے بڑا کوئی وید حکیم نہیں ہے۔ انسان کے اندر بھی ایک ڈاکٹر ہے۔ جیسے ہی کسی بیماری کے آثار سر اٹھاتے ہیں، وہ ڈاکٹر جھاڑو لے کر دوڑ پڑتا ہے اور وہ بیماری ناک کے راستے نکل جاتی ہے۔“

پُرمزاح انداز میں وضاحت کی تو حمیدہ بھی بول پڑی۔ ”اسی لیے تو حکم ہے کہ فوراً الحمدللہ کہو۔“

”آں، میں کوئی میاں (مسلمان) ہوں کیا جو ایسا بولوں؟“ ریکھا نے منہ بنا کر کہا۔

کہیں بات بڑھ نہ جائے، اس خوف سے میں نے جلدی سے کہا۔ ”ریکھا، پہلے یہ تو دکھاؤ، کیا کیا لیا؟ ہاں، اور پیسوں کی ضرورت تو نہیں ہے؟“ اس کی دکھتی رگ کو میں نے چھیڑا۔

وہ لالچی لڑکی فوراً خاموش ہو کر میری طرف بڑھی۔

”چلو، کمرے میں چل کر دکھاتی ہوں۔“ اس نے کہا اور اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

میں بھی ادھر ہی بڑھتا چلا گیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے کہا۔ ”یہ نیلی ساڑی مجھ پر خوب کھِلے گی ناں؟ ٹھہرو، ابھی پہن کر دکھاتی ہوں۔“

اس نے اپنی ساڑی کی چنٹیں کھولنا شروع ہی کی تھیں کہ میری ہوا سرک گئی۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”ارے، ارے، دروازہ کھلا ہوا ہے، کوئی آ جائے گا۔“

”کوئی نہیں آتا، وہ دونوں بھی عورتیں ہیں، جانتی ہیں کہ میں اپنے پتی کے ساتھ ہوں، اندر کوئی نہیں آئے گا۔“ وہ بےشرمی سے ہنستے ہوئے بولی اور ساڑی کو بیڈ کی طرف اچھال دیا۔

اس وقت وہ پیٹی کوٹ اور بلاؤز میں تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میری رگوں میں لاوا سا

دوڑنے لگا، ہونٹوں پر پپڑیاں جمنے، حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ میں وہاں سے بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ باہر والے دروازے پر کسی نے زبردست چوٹ کی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے پوری قوت سے لات ماری ہو۔ میں چونک کر ادھر دیکھنے لگا تھا کہ دوسری بار چوٹ پڑی اور دروازہ کھل گیا۔ سامنے ابومیاں کئی دوسرے نوجوانوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ سب کے ہاتھ میں استرے تھے۔

میں نے ایک نظر ابومیاں پر ڈالی پھر اس کے ساتھیوں پر۔ وہ سب اپنے ہاتھوں میں استرا پکڑے ہوئے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے رشیدہ اور حمیدہ کو کمرے میں چلے جانے کا اشارہ کیا مگر ان پر تو سکتہ طاری تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ جم گئی تھیں جیسے پتھر کی مورت بن گئی ہوں۔ ادھر سے نظریں موڑ کر میں نے ابومیاں پر نظر ڈالی۔ وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی تیغ بے نیام بنے ہوئے تھے۔ استرے کی مار کتنی خطرناک ہوتی ہے، اس کا مجھے اندازہ تھا۔ ان کے وار سے بچنے کے لیے جگہ کی ضرورت تھی اور آنگن اتنا چھوٹا تھا کہ میں زیادہ اچھل کود نہیں کر سکتا تھا۔ باآسانی گھر جاتا پھر یہاں عورتیں تھیں، ہاتھ پیر چلتا تو خون بھی بہتا اور جب خون بہتا تو عورتیں چیختیں اور میرا دھیان بٹتا اس لیے فرار کی راہ ڈھونڈ رہا تھا۔ یوں بھی باہر دکانیں تھیں، بھیڑ بھاڑ تھی۔ وہ کتنے ہی بہادر تھے مگر بھیڑ بھری سڑک پر مجھے گھیرنے کی غلطی نہیں کرتے مگر وہ تینوں تو دیوارِ چین بنے کھڑے تھے۔ انہیں ہٹائے بنا باہر نکل نہیں سکتا تھا اس لیے میں نے انہیں باتوں میں الجھانے کی کوشش کی اور نہایت دھیمے لہجے میں کہا۔ ''کیوں ابومیاں! مجھ سے مقابلہ کرنے آئے ہو؟ خود پر بھروسہ نہیں، اسی لیے اتنے سارے لوگوں کو ساتھ لائے ہو؟''

''تمہیں خود پر بہت ناز ہے نا، اسی لیے ان کو لایا ہوں۔ اگر میں زخمی نہ ہوتا تو میں یقیناً اکیلا آتا۔'' اس نے کہا اور ایک قدم آگے بڑھایا۔

''آگے بڑھنے سے پہلے سوچ لینا پھر اپنے پیروں پر چل کر جا نہیں سکو گے۔''

''تم میں کتنا دم ہے، یہ ابھی معلوم ہو جائے گا۔'' کہتے ہوئے وہ مزید آگے بڑھا۔

''مجھ میں کتنا دم ہے، یہ تو ابھی احساس ہو جائے گا مگر میرے اس سوال کا جواب کون دے گا کہ تمہاری پیدائش میں شیطان کا کتنا عمل دخل ہے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے ایسے کہا جیسے وہ مذاکرات کے لیے آئے ہوں۔

''میں مجسم شیطان ہوں، اسی لیے لوگ میرا نام سن کر کانپنے لگتے ہیں، پناہ مانگنے لگتے

ہیں۔''

''مگر اس دن تو تم مجھ سے پناہ مانگ رہے تھے؟''

''اسی لیے تو میں تمہاری ہستی مٹانے آیا ہوں۔'' اس نے استرا لہرا کر کہا۔

''اَب تُو اپنی سوچ......'' کہتے ہوئے میں نے قدم بڑھایا۔ مجھے یقین تھا، مجھے آگے بڑھتے دیکھ ابومیاں بھی آگے بڑھے گا اور میں ہائی جمپ لگاؤں گا، اس کے سر پر سے اڑتا ہوا باہر نکل جاؤں گا مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ اسے اپنی جگہ ایستادہ دیکھ کر میں نے ایک دوسری کوشش کی۔ اپنے جسم کو سکیڑ کر لمبی چھلانگ لگائی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ یہ سمجھیں گے کہ میں ان پر گرنے والا ہوں تو وہ سامنے سے ہٹ جائیں گے اور مجھے باہر نکلنے کا راستہ مل جائے گا مگر میرا یہ اندازہ بھی غلط نکلا، وہ اپنی جگہ کھڑے رہے اور میں ان کی ثابت قدمی کا نشانہ بن گیا۔ ابومیاں نے ہاتھ اونچا کر کے استرا چلا دیا تھا۔ استرے کی دھار میرے سینے سے ٹکرائی، شرٹ کٹی، سینے پر خراش آئی اور خراش سے بھل بھل خون نکلنے لگا۔

''اس استرے پر پھول رہے ہو۔'' کہہ کر میں نے ہوا میں دوبارہ اچھال بھری اور صرف داہنی ٹانگ سے فلائنگ کک اس کے سینے پر ماری۔ وہ الٹ کر اپنے ساتھیوں پر گرا۔ میں نے انہیں موقع دینا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی زخمی ٹانگ سے سامنے پڑے اسٹول کو ہوا میں اچھالا، اسٹول ہوا میں اڑتا ہوا کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے اس کے ساتھی کے سر سے ٹکرایا اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سر سے خون نکلنے لگا تھا۔ میری زخمی ٹانگ نے کمال کر دکھایا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''میں استرے پر نہیں، اپنے بازو کی قوت پر بھروسہ کرتا ہوں۔''

ان میں سے ایک اٹھ کر میری طرف بڑھا۔ میں نے اس کو روکنے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے زور میں ہی آگے کی سمت دوڑتا چلا گیا، تبھی ابومیاں میری طرف لپکا۔ میں نے اسے روکنے کے لیے جھٹکے سے اپنی ٹانگ کو سیدھا کر دیا، وہ الجھ کر گر پڑا، تبھی دوبارہ میں جھک گیا کیوں کہ میں نے اپنے پیچھے سے وار کرنے والے کا سایہ دیکھ لیا تھا۔ وہ استرا سیدھا کر کے میری طرف لپکا تھا۔ اس حالت میں میری ذرا سی غفلت مجھے دوبارہ زخمی کر سکتی تھی اور اگر وہ استرا میری گردن پر پڑتا تو میں ملکِ عدم بھی روانہ ہو سکتا تھا اس لیے میں کسی سانپ کی طرح پلٹا تھا اور اپنے پیر کو آگے کر دیا تھا۔ وہ اپنے زور میں میرے پیروں سے ٹکرایا تھا اور آدھے جسم سے جھول گیا تھا۔ میں فوراً ہی اپنے گھونسے کو کام میں لایا تھا نتیجتاً وہ

پیچھے کی جانب الٹ گیا تھا۔ تبھی ایک دوسرے شخص نے مجھ پر چھلانگ لگائی۔ میں نے اسے دونوں ہاتھ پر روکا اور سر سے اس کی ناک پر وار کیا، وہ اپنی ناک پکڑ کر بیٹھ گیا، تبھی اس کے ساتھی نے اسٹول سے میری پیٹھ پر ضرب لگائی۔

چوٹ کھا کر میں زمین پر گرا تھا مگر گرتے ہی پھرتی سے اٹھ گیا تھا اور اٹھتے ہی میں نے گھونسا چلا دیا تھا۔ میرا گھونسا ابومیاں کے گھٹنے پر پڑا تھا۔ وہ کھڑے کھڑے بیٹھ گیا تھا۔ اس قلیل وقفے کا فائدہ ابومیاں کے ساتھی نے اٹھایا تھا۔ اس نے میری پیٹھ پر استرا مارا تھا۔ سورج کی روشنی میرے عقب میں تھی اس لیے اس کا سایہ میں نے دیکھ لیا تھا۔ اگر نہ دیکھتا تو بری طرح زخمی ہو جاتا۔ سائے کو ہلتے دیکھ کر ہی میں نے قلابازی کھائی تھی اور لڑھکتا ہوا کافی دور آ گیا تھا پھر بھی استرا پیٹھ سے مس ہو گیا تھا۔ میرے پیچھے ابومیاں لپکا تھا کہ میں نے لیٹے لیٹے لات چلا دی جو اسی گھٹنے پر لگی جہاں گھونسا لگا تھا۔ وہ پھر پہلے کی طرح گدے سے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ گو کہ میرا ایک پیر زخمی تھا، سینے اور پیٹھ پر بھی خراشیں آ گئی تھیں مگر میں تکلیف کو بھلا بیٹھا تھا۔ اگر اس تھوڑی سی تکلیف کی طرف دھیان دیتا تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ میں اٹھ ہی رہا تھا کہ ٹھگنے قد والا نوجوان میرے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے پھر استرا چلایا۔ اس بار اس نے دائیں سے بائیں ہاتھ ہلایا تھا۔ میں بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ پر زور دے کر کولہے کے بل آگے کھسکتا چلا گیا تھا۔ فرش پختہ تھا، اس لیے با آسانی پھسلتے ہوئے کافی دور چلا آیا تھا جبکہ استرا چلانے والا اپنے ہی زور میں گھوم گیا تھا۔

میرے لیے اتنا وقفہ کافی تھا۔ میں جھٹکے سے کھڑا ہوا تھا اور کسی گڈے کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا تھا۔ تنگ جگہ ہونے کے باوجود میں نے فلائنگ کک چلائی تھی جو استرے والے کی پیٹھ پر لگی تھی۔ وہ اچھل کر سامنے والی دیوار سے ٹکرایا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی اور میری خوش قسمتی تھی کہ اس کا استرا اسے ہی چاٹ گیا۔ دیوار سے ٹکرا کر اس کی گردن پر لگا تھا اور وہ مرغِ بسمل کی طرح پھڑکنے لگا تھا۔

اسے اس کے حال پر چھوڑ کر میں ابومیاں اور اس ٹھگنے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اپنے ساتھی کا برا حال دیکھ کر وہ دونوں سکتے میں آ گئے تھے۔ یہ موقع مناسب تھا، میں نے ان میں سے ایک کو تاک لیا اور اپنا آزمودہ داؤ آزمانے کی کوشش کی۔ دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر مٹھی بنائی اور اس مٹھی کو پوری قوت سے اس کے سر پر مارا۔ یہ وار اگر گھوڑے کے سر پر پڑے تو وہ بھی ڈگمگا

جائے، ٹھگنا تو پھر بھی انسان تھا، گھوڑے جیسا سخت جان نہیں۔ وار پڑتے ہی اس کے منہ سے کریہہ چیخ نکلی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھے گیا۔

اس کی چیخ نے ابومیاں کو ہوش کی دنیا میں کھینچ لیا۔ وہ میری طرف لپکا۔ اس کی زبان پر غلیظ گالیاں تھیں۔ انسان جب ہوش کھوتا ہے تو پاگل کہلاتا ہے، وہ بھی غصے میں پاگل ہوا تھا۔ اس نے سیدھے سیدھے مجھ پر چھلانگ لگائی، میں کوئی سڑک چھاپ غنڈا نہیں تھا کہ اس کے جھانسے میں آ جاتا۔ میرے استادوں نے ہر موقع کے لیے کارآمد داؤ سکھائے تھے، وہی کام آ رہے تھے۔ انہوں نے سکھایا تھا کہ جب دشمن سامنے سے دوڑتا ہوا آئے تو دائیں یا بائیں ہٹ جانا۔ میں نے بھی یہی کیا تھا، پھرتی سے داہنی جانب سرک گیا تھا۔ وہ اپنے ہی زور میں سیدھا دوڑتا چلا گیا۔ اس موقع کے لیے استادوں نے یہ بھی سکھایا تھا کہ دشمن کی پیٹھ پر پیچھے سے لات رسید کر دو۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کی کمر سے کچھ نیچے کھڑی لات رسید کر دی۔ وہ منہ کے بل فرش پر گرا، اسے گرتے دیکھ کر میں اپنی جگہ سے اچھلا اور دونوں پیروں سے اس کی پیٹھ پر جمپ لگائی۔ جوتے کی ہیل نے اس کی ریڑھ کا مزاج پوچھا۔ یہ وار بھی ٹریننگ میں سیکھا تھا۔ اس کا اثر کتنا ہے، اس کا بھی اندازہ تھا پھر بھی دوبارہ اچھال بھر کر اسی مقام پر ایڑی بجائی۔ وہ ذبح ہوتے بھینسے کی طرح ڈکرایا۔ میرا وزن، اس پر اچھلنے کی فورس، سب ملا کر اس کے لیے مہلک ثابت ہوئے اور وہ تڑپنے لگا۔ انسٹرکٹر نے بتایا تھا، دشمن کو کبھی رحم کھا کر نہ چھوڑنا ورنہ گولی مقدر ٹھہرے گی۔ ہمیشہ خیال رہے، تمہارا مقابل تمہاری جان اور مادرِ وطن کی آزادی دونوں کو چھیننے کے لیے آیا ہے اس لیے اسے بھرپور سزا دو۔ اس نکتے کو یاد کرتے ہی میں اپنی تکلیف بھول گیا اور یہ سمجھ لیا کہ اس وقت یہ شخص اگر میرے ہاتھوں سے بچ گیا تو مجھے ختم کر دے گا، اسی لیے میں نے جھک کر اسے کالر سے پکڑا اور اوپر اٹھایا پھر جھٹکے سے اس کے گلے کے گرد بازو کو ہالہ کر دیا۔ اس کی گردن کو بازو کے حلقے میں لے کر دباؤ ڈالنے لگا۔ اسے سانس لینے میں تکلیف ہوئی تو وہ جھٹکے لینے لگا۔ اس کے چہرے پر وحشت سمٹ آئی تھی۔ شاید موت کی آہٹ سننے لگا تھا۔ مجھ سے ٹکرانے آیا تھا، نتیجتاً جان گنوا رہا تھا۔ میں نے اس پر رحم کھانا کفر سمجھا اور بازو کا حلقہ تنگ کرنے لگا۔

جیسے جیسے میں دباؤ بڑھا رہا تھا، اس کا جسم ویسے ویسے جھٹکے لے رہا تھا۔ بالآخر وہ ساکت ہو گیا۔

آنگن میں تینوں بے حس وحرکت پڑے تھے۔ میں نے اس پر سے نظریں ہٹا کر اپنے تینوں دشمنوں کا جائزہ لیا۔ تینوں ہنوز بے حس وحرکت پڑے تھے، ساکت و جامد پڑے تھے۔ ایک جان سے گزر چکا تھا، دو ہوش کھو چکے تھے۔ میرا شکار کرنے آئے تھے اور خود شکار ہو گئے تھے۔ اکیلے میں نے تین تین وکٹ گرائی تھیں، اس کی بھی خوشی تھی۔ مگر میں بھی تو انسان تھا۔ گوشت پوست کا انسان۔ مجھے بھی درد تکلیف کا احساس ہوتا تھا۔ تکلیف بےچین کرتی تھی۔ پیر پہلے ہی زخمی تھا۔ اس زخمی پیر سے مسلسل کام لیا تھا۔ ٹانکے کھل گئے تھے۔ خون جاری ہو گیا تھا۔ پیٹھ اور سینے پر استرے کے زخم لگے تھے۔ ان سے بھی خون جاری تھا۔ تکلیف بڑھ رہی تھی پھر بھی ضبط کیے ہوئے تھا۔

ان تینوں سے نمٹ کر میں نے فاتحانہ نظر ادھر ڈالی جدھر عورتیں کھڑی تھیں۔ تماشا ختم ہو چکا تھا مگر اثر باقی تھا۔ تینوں عورتیں سکتے میں تھیں۔ میں ان کے نزدیک پہنچا۔ رشیدہ جو بڑی بہادر بنتی تھی، اس وقت اس کا چہرہ سفید تھا، کسی دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید۔ خوف سے آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا پھر اونچی آواز میں کہا۔

"جو ہونا تھا، ہو گیا، اب تو ہوش میں آ جاؤ۔"

میری آواز پر وہ چونکی، اس کی بہن مسکرائی اور ریکھا ہنس دی۔ ان تینوں میں ریکھا کے اوسان خطا نہ تھے، وہ خود پر قابو رکھے ہوئے تھی اسی لیے جلدی سے بولی۔ "واہ میرے شیر......! کیا ڈھشم ڈھشم مارا، دھرمیندر بھی ایسی فائٹ نہ کر پائے۔ استرا دھرا کا دھرا رہ گیا اور تم نے بھرپور کٹائی لگا دی۔"

میں تمکنت سے مسکرا دیا۔ میری مسکراہٹ نے اس کے حوصلے کو مہمیز کیا، وہ کچھ بولنا چاہ رہی تھی مگر الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ کھلا ہوا دروازہ جو پاٹ کھل گیا، اور اندر ایک ریلا سا آ گیا۔ ایک کے پیچھے ایک تقریباً دس آدمی گھس آئے۔ ان کے حلیے بتا رہے تھے کہ یہ سڑک چھاپ غنڈے نہیں ہیں، پھر ایک اور بات انہیں الگ بتا رہی تھی کہ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول تھا، باقی سب چاقوؤں سے لیس تھے۔ پستول عام غنڈوں کی دسترس میں نہ تھا۔ خاصی قیمت میں ملتا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی پوزیشن لے لی تھی جس سے ظاہر تھا کہ یہ لوگ اس کام کے عادی ہیں۔

میں لمحہ بھر پہلے خود کو بہت اونچی شے سمجھ رہا تھا مگر اتنے سارے ہتھیار بند دیکھ کر پتھرا گیا

تھا۔ ان کے لباس بھی غنڈے موالیوں جیسے نہ تھے۔ کڑک استری، عمدہ پتلون بوشرٹ۔ دو نے ٹائی بھی باندھ رکھی تھی اس لیے ذہن میں ایک نام ابھرا۔ "آئی بی"۔

انٹیلی جنس بیورو والے معمولی غنڈے کو بچانے کے لیے آ جائیں، یہ ناممکن بات تھی، یقیناً ابو میاں کافی اونچی چیز ہے یا پھر میں آئی بی والوں کی نظروں میں آ گیا ہوں۔ یہ لوگ ابو میاں کا سہارا لے کر مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔

لیکن انہوں نے مجھ سے کچھ بھی پوچھا نہیں اور بالٹی میں سے ڈونگا لے کر ابو میاں کے منہ پر چھینٹے مار کر بولا۔ "جلدی نکلو، گاڑی تیار ہے۔"

"ایسے کیسے جائیں گے؟ اس حرام کے پلے کو ختم کر کے جائیں گے۔" ابو میاں کہتا ہوا کھڑا ہوا۔ اس کی ٹانگیں اب بھی لرز رہی تھیں مگر اپنے حمایتیوں کو دیکھ کر وہ شیر بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"نہیں، تم نے بہت زیادہ وقت لے لیا ہے۔ باس نے خبر بھیجی ہے کہ گلفام کے آدمی چل پڑے ہیں۔ اس تک خبر پہنچ گئی ہے کہ ہم تمہاری حمایت میں اس کے علاقے میں داخل ہوئے ہیں۔" اس نے جھڑکنے کے انداز میں کہا۔

"کچھ بھی ہو، میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کہاں ہے میرا استرا......؟" کہہ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"کھینچ کر لے چلو، وقت بہت کم ہے، پولیس بھی آ سکتی ہے۔" دروازے پر کھڑے ٹائی والے نے کہا۔

شاید وہ ان سب کا سربراہ تھا۔ حکم ملتے ہی تین آدمیوں نے ابو میاں کا ہاتھ اور کالر پکڑا اور زبردستی کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ دو نے مردے کو اٹھا لیا اور دو نے بے ہوش شخص کو۔

ان کے باہر جاتے ہی رشیدہ نے پوچھا۔ "یہ صاحب لوگ کون تھے؟"

"خدا کا شکر، کہ تم بولیں۔" گو کہ میرا ذہن بھی الجھا ہوا تھا مگر ان کے ذہنوں کو صاف کرنا تھا، خوف دور کرنا تھا اس لیے پُرمزاح انداز میں، میں نے جملہ کسا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم تینوں پر ان لوگوں نے جادو کی چھڑی گھما دی ہے اور تم لوگ پتھر کی بن گئی ہو۔"

"میں ڈری نہیں تھی اس لیے خاموش تھی کہ تمہاری توجہ نہ بٹے۔" ریکھا نے آگے بڑھ کر کہا۔ "مجھے یقین تھا، میرا اپتی دیو بہت بہادر ہے۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا کہ اب تو یہ بہانگِ دہل مجھے اپنا شوہر بتانے لگی ہے مگر کچھ بولا نہیں۔

"واقعی آپ دھرمیندر ہیں، کیا اچھل اچھل کر فیٹ مارا...... بائی اسکوپ (سینما) کا مزہ آ گیا۔" حمیدہ نے بھی زبان کھولی۔

"مگر یہ صاحب لوگ کون تھے، ابو میاں کسے لے آیا؟" رشیدہ کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"اگر پہلے ہی پوچھ لیتیں تو میں ان سے معلوم کر لیتا۔ اب تو وہ لوگ چلے گئے۔" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا پھر عادل کا کرتہ پہننے کے لیے اٹھا لیا۔ وہیں کھڑے کھڑے شرٹ اتاری اور پینٹ پر کرتہ پہن لیا۔

"تو آؤ، ہم لوگ خوشیاں منائیں، حمیدہ آپا کا کمرا حاضر ہے۔" ریکھا نے پھر بے شرمی کا مظاہرہ کیا۔ اب مجھے یقین آنے لگا کہ یہ لڑکی ذہنی فتور میں مبتلا ہے۔ میں کچھ کہتا کہ دروازہ کھلا اور اقبال داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ عادل بھی تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر آنگن میں پھیلے خون پر پڑی، وہ چیخا۔ "حمیدہ، رشیدہ، تم لوگ ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں، ہم سب ٹھیک ہیں۔ ایسا بہادر جب موجود ہو تو کوئی ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے؟" حمیدہ بولی۔

"تم تو اسٹیشن پر ہو گے، تمہیں کس نے اطلاع دی؟" میں نے پوچھا۔

"محلے کا ایک لڑکا مجھے ڈھونڈتا ہوا پہنچا تھا، اسی نے یہ خبر پہنچائی کہ اس بار ابو میاں اپنے پورے دَل (گروہ) کے ساتھ آیا ہے۔ دَل کا نام سن کر میں ڈر گیا کہ یہ صاحب اکیلے کتنی دیر مقابلہ کریں گے؟ وہ لوگ میری بیوی کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"یہ لو...... لوگ تو خوش ہوتے ہیں کہ چلو، بیوی سے جان چھوٹی۔" میں نے ہنس کر ماحول کے تناؤ کو دور کرنا چاہا۔

"واہ بھائی صاحب، آپ تو الٹی پٹی پڑھا رہے ہیں۔" حمیدہ بولی۔

"اے ہے، بی بیو......! اُلٹی پٹی تو بیویاں پڑھاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ شوہر، ماں کی نہیں، بیویوں کی سنتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے زنانہ لہجے میں کہا۔

حمیدہ جواب میں کچھ کہتی کہ اقبال بولا۔ "بھائی میاں......! دل لگی ہوتی رہے گی، اب

باہر کی بھی سوچو۔ یہ لوگ جو آئے تھے، بہت منظم تھے۔ انہوں نے پوری گلی کو کور کیا تھا، پھر ابو میاں اور اس کے ساتھیوں کو بھیجا تھا، خود باہر کھڑے رہے تھے۔ گلفام کے ایک آدمی نے گلی میں داخل ہونا چاہا تھا۔ انہوں نے اتنی چابک دستی سے اسے بے ہوش کیا تھا کہ پورے گلی والے حیران ہیں۔"

"تمہارے خیال میں یہ کون لوگ ہوں گے؟"

"لگتا ہے، انٹیلی جنس والے تھے، وہی لوگ اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔"

"اگر انٹیلی جینس والے تھے تو سمجھو، ہم ان کی نظروں میں آ چکے ہیں اور اب ہم کسی بھی وقت اٹھا لیے جائیں گے۔" میرے دماغ میں سرگوشی گونجی۔

"یہ تو بہت بری خبر ہے، واقعی یہ لوگ غنڈے موالی نہیں لگ رہے تھے۔" اقبال نے کہا۔

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ عادل نے پوچھا۔ "کون......؟"

"ہم ہیں، بھائی نے بھیجا ہے۔ سب باہر انتظار کر رہے ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ گلفام کے آدمی آ گئے ہیں اس لیے جلدی سے کہا۔ "میں آ رہا ہوں۔" پھر اقبال سے کہا۔ "آؤ، ذرا ان کی بھی سن لیں۔"

باہر گلی میں کرسیاں پڑی تھیں۔ لگتا تھا، لوگوں نے گھروں سے لا لا کر بچھائی ہیں۔ میں حیران رہ گیا کہ خود گلفام بھی موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔ "آؤ، میرے شیر......! واقعی تم بہادر ہو، اکیلے تینوں کو ٹھکانے لگا دیا۔"

یقیناً میرے پہنچنے سے پہلے ہی محلے والوں نے بریفنگ کر دی تھی۔ میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ محلے والے گلفام کی خاطر داری میں لگے ہوئے تھے اور میں سوچ رہا تھا، واقعی خوف انسان سے بہت کچھ کرا دیتا ہے۔ غنڈے موالی بھی پوجے جانے لگتے ہیں۔

"میں نے علاقے میں اپنے آدمیوں کی تعداد بڑھا دی ہے۔ وکٹر نے بہت برا کیا ہے۔" گلفام نے سوڈا واٹر کی بوتل مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ جنگ اب میں خود لڑوں گا۔ آج ہی اس کے علاقے میں جا کر اسے للکاروں گا۔"

"یہ وکٹر کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پارک سرکس ایریا کی چوکی اسی کے پاس ہے۔ وہ اپنی حدود کو بڑھانے کی فکر میں ہے،"

دوغلا کرسٹن ہے، خود کو ڈان کہتا ہے اور انگریزوں کی طرح رہتا ہے۔ اپنے موالیوں کو بھی انگریزوں کی طرح نظر آنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس کے موالی شرٹ، پینٹ پہنتے ہیں اور سرخ ٹائی لگاتے ہیں۔"

اس کی بات سن کر میں نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو، یہ شک تو دور ہوا کہ آئی بی والے تھے۔

گلفام کی وجہ سے بہت سارے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ بڑھتی بھیڑ دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔ ہاں، اس وقت تو میں جا رہا ہوں مگر رات تک لوٹ آؤں گا۔"

اس کے اٹھتے ہی میں بھی کھڑا ہو گیا۔ اقبال اس نوجوان کے ساتھ لوٹ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے نقاہت ٹپک رہی تھی۔ نزدیک آتے ہی بولا۔ "ڈاکٹر صاحب اٹھنے والے ہیں۔ آپ بھی جا کر زخموں پر دوا لگوا لیں۔"

میرے زخموں میں ٹیس اٹھ رہی تھی۔ بنڈس کرانا ضروری تھا۔ ایک نوجوان کے ساتھ میں بھی ڈاکٹر کے ہاں چل دیا۔

گھر لوٹا تو آنگن میں پھیلا ہوا خون صاف کیا جا چکا تھا۔ فرش کی صفائی کے بعد چٹائی بچھا دی گئی تھی۔ حمیدہ، رشیدہ اور ریکھا چٹائی پر بیٹھی تھیں۔ دروازے کے نزدیک ایک اور چٹائی بچھی تھی جس پر اقبال اور عادل بیٹھے تھے۔ عادل کی گود میں اس کی بچی تھی۔ سب اپنا اپنا خیال پیش کر رہے تھے۔ گلفام کی آمد نے ان کے حوصلے کو سوا کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اس آنگن میں جو ڈراما کھیلا گیا تھا، وہ بھی سب بھول چکے تھے۔ ایسے اطمینان میں بیٹھے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اقبال نے کہا۔ "بھائی صاحب! واقعی آپ بہت بہادر ہیں، آپ کی وجہ سے علاقے بھر میں میری دھاک بیٹھ گئی ہے۔ گلفام کی آمد نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ اب راجا بازار کا ہر بندہ مجھ سے دب کر ملے گا۔"

میں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ ریکھا نے حمیدہ سے کہا۔ "بھابی...... یہ تھک گئے ہوں گے، چائے بنا لیں۔"

حمیدہ بغیر پس و پیش کے کھڑی ہو گئی۔ اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر رشیدہ نے کہا۔ "رہنے دیں باجی، میں چائے بنا لاتی ہوں۔"

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ رشیدہ میرے کام خود کرنا چاہتی ہے۔ شاید وہ مجھے پسند کرنے

لگی ہے۔ جسم کی ہنڈیا جوانی کی آگ پر کھدبد ضرور کرتی ہے کہ یہ تقاضائے فطرت ہے۔ جب میرے جیسا آدمی اسے دیکھ کر نشہ محسوس کرنے لگا تھا تو وہ دل کی پکار کیوں نہ سنتی؟ میرا جھکاؤ اس کی طرف اس لیے ہوا تھا کہ اس میں میری بیوی کی جھلک تھی اور وہ میری طرف اس لیے جھک رہی تھی کہ وہ تقاضائے جسمانی سے مجبور تھی۔ جوانی آتی ہے تو آنکھوں میں خواب اترتے ہیں، بانکے اور سجیلے شہزادے کا خواب جو اسے خوشیاں دے سکے، اطمینان بھری زندگی دے سکے، آرام اور آسائش دے سکے۔ اسے مجھ میں یہ تمام خوبیاں نظر آ رہی ہوں گی اسی لیے میری طرف جھک رہی تھی۔ وہ غربت کی گود میں پلی تھی اور میرے پاس نوٹوں کی گڈیاں دیکھ چکی تھی اس لیے اسے راغب ہونا ہی تھا۔ اگر سچ کہوں تو میں بیوی کی مشابہت کی وجہ سے یا پھر جذباتی ابال پر اسے میٹھی نظروں سے ضرور دیکھ رہا تھا مگر حقیقت میں میرے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اسی لیے جیسے ہی اس نے میری طرف دیکھا، میں نے ادھر سے نظریں ہٹا لیں اور اقبال سے بولا۔ "اقبال...... یہ معاملہ کچھ دب جائے تو ہم لوگ یہاں سے چل دیں گے۔"

"ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے کیا؟" عادل نے چونک کر کہا۔

"دراصل ہمیں ایک ضروری کام سے بمبئی جانا ہے۔ کام کچھ ایسا ہے کہ جتنی دیر ہو گی، اتنا ہی نقصان ہوتا رہے گا۔"

"ابھی تو آپ آئے ہیں، کم سے کم ہفتہ بھر رکیں۔"

"اتنی دیر یہاں رکنا مشکل ہے، جیسے ہی گلفام حالات پر قابو پائے گا، ہم چل دیں گے۔" میرے پہلے ہی جملے پر رشیدہ ٹھٹک گئی تھی اور چولہے کی طرف جاتے جاتے رک کر میری طرف شکایتی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ زبان ہلائے بغیر صرف آنکھوں سے کہہ رہی تھی کہ کیا مجھے بھی چھوڑ جاؤ گے؟

عورت، عورت کی نظر کو زیادہ پہچانتی ہے، ریکھا نے بھی اس کی نظروں کو بھانپ لیا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کی جھلک آ گئی تھی۔

"بھائی صاحب...... نہ آپ نے بتایا اور نہ میں نے اقبال سے پوچھا۔ آپ کرتے کیا ہیں؟" عادل نے کہا۔

"میں چائے کی پتی کا کاروبار کرتا ہوں۔ دارجلنگ کے باغات سے چائے کی پتی خریدتا ہوں اور پورے مغربی بنگال و بہار میں سپلائی کرتا ہوں۔ ارادہ ہے کہ بمبئی میں بھی ایک شاخ

قائم کرلوں۔“

”آپ اپنے ساتھ مجھے بھی شامل کرلیں۔ خوانچہ لگانے سے دل بھر گیا ہے۔ دن بھر لوگوں کی باتیں سنو، غنڈہ ٹیکس ادا کرو پھر پولیس والوں کو بھتہ الگ دو، میں تنگ آ گیا ہوں۔“

”میرے کام میں دماغ سوزی بہت ہے، لوگ جلد اکتا جاتے ہیں۔“ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا پھر باورچی خانے کی طرف دیکھا۔ رشیدہ پیالیوں میں چائے ڈال رہی تھی۔ ریکھا فوراً اٹھ گئی۔ شاید وہ اسے مجھے چائے دینے کی کوشش سے بھی محروم کرنا چاہتی تھی۔

”آپ فکر ہی نہ کریں، میں ہر قسم کا کام کرلیتا ہوں۔“

”میں نے تمہارے لیے ایک اور کام سوچا ہے۔ میں یہاں ایک بڑا اسٹور کھولنا چاہتا ہوں۔ اس کی تمام ذمے داریاں تم پر ہوں گی۔ اس طرح تم گھر پر رہو گے۔ میری طرح شہر شہر بھٹکنے سے بچ جاؤ گے۔“

”آپ فکر ہی نہ کریں، میں صبح سے شام تک دکان پر بیٹھ سکتا ہوں۔“ وہ اس طرح بول رہا تھا جیسے میں واقعی دکان کھولنا چاہتا ہوں جبکہ میرا ذہن کہیں اور تھا۔ میں ابومیاں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ پٹ کر گیا تھا۔ اب وہ پھر حملہ ضرور کرے گا۔ اس کا مقابلہ کیا جائے یا اپنے کام سے کام رکھتے ہوئے اس شہر سے نکل جایا جائے، کیونکہ اتنی مار دھاڑ کے بعد یہاں کی پولیس کا چوکنا ہونا ضروری تھا۔ میں ابھی کسی فیصلے پر پہنچ بھی نہیں پایا تھا کہ اقبال کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔ ”بھائی......! یہ ریکھا کیا چیز ہے؟ آپ پر ایسے دعویٰ دکھا رہی ہے جیسے واقعی آپ کی بیوی ہے؟“

”میں خود پریشان ہوں، یہ پیر تسمہ پا بن گئی ہے۔ جان چھوڑنے پر تیار ہی نہیں۔“

ہمیں سرگوشی میں باتیں کرتے دیکھ کر عادل نے سمجھا کہ شاید ہم اس کی وجہ سے دھیمی آواز میں باتیں کررہے ہیں۔ وہ فوراً اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔

”یہ ملی کہاں؟ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے کیا؟“

”یہی تو پریشانی ہے۔ اب اس دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔“

”تب تو یہ ایک گمبھیر مسئلہ ہے۔ کیا اسے بھی ساتھ لے جائیں گے؟“ اس نے حیرت فرو کرنا چاہی۔

”ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اب تک دھکے دے چکا ہوتا مگر یہ سوچ کر صبر کرلیتا ہوں کہ

اس بھری دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔“

”میں ہوں ناں...... اسے مجھے دے دیں، میں بڑے آرام سے اسے رکھوں گا۔“ اقبال نے ہنستے ہوئے کہا۔

”واہ میاں، واہ......! یہاں جان کے لالے پڑے ہیں، کسی بھی وقت یہاں کی انٹیلی جنس ہم پر ہاتھ ڈال سکتی ہے اور تمہیں مسخری سوجھ رہی ہے؟“

”دنیا دو دن کی ہے، سوچنے سے حاصل؟ جب یہاں سے دانہ پانی اٹھے گا، ہم اپنے وطن پہنچ جائیں گے۔“

”اور اگر اس سے پہلے کچھ ہوگیا تو؟“

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اسے دستک نہیں، دھڑ دھڑانا کہیں گے۔ کسی نے زور زور سے دروازہ تھپتھپایا تھا۔ دستک کے انداز پر سب چونک گئے تھے۔ عورتوں کے چہرے فق پڑ گئے تھے۔ شاید ابومیاں آ گیا۔ میرے خیال میں سب نے یہی سوچا ہوگا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور گربہ پا چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

”کون......؟“ میں نے پوچھا۔

باہر سے آواز آئی۔ ”ہم ہیں ہیرو، گلفام بھائی نے بھیجا ہے۔“

جواب سن کر سب کے تنے ہوئے اعصاب نارمل ہوگئے، خود میں نے بھی راحت کی سانس لی اور بلند آواز میں کہا۔ ”اندر آ جاؤ......“

اندر آنے والا بیس بائیس سال کا جوان تھا۔ اس نے چار خانے کی تہمند اور بنیان پہن رکھی تھی۔ دبلا پتلا، گوری رنگت والا۔ اس نے داخل ہوتے ہی سلام کیا پھر بولا۔ ”آپ کو گلفام بھائی نے بلایا ہے، ابھی اور اسی وقت۔“

اس کے انداز میں عجلت تھی۔ چہرے پر بھی گھبراہٹ تھی۔ ضرور کوئی خاص بات ہے، میں نے سوچا اور جانے کے لیے اٹھا پھر ذہن میں آیا کہ میں نے اسے اس سے پہلے کبھی دیکھا نہیں پھر اس نے مجھے پہچان کیسے لیا؟ اپنی تشنگی مٹانے کے لیے میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

”بھائی نے آپ کا حلیہ بتا دیا تھا اسی لیے پہچانا۔“ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی اس لیے جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ جیسے ہی میں دروازے کی طرف بڑھا، اس نے کہا۔ ”نہ، نہ، ادھر سے نہیں، اس دروازے سے چلنا ہے۔“ اس نے گندی گلی والے دروازے کی طرف انگلی سے

اشارہ کیا۔ حیرت تو ہوئی تھی مگر میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے، کسی خاص وجہ سے وہ مجھے لوگوں کی نظروں سے بچانا چاہتا ہو اس لیے میں ادھر ہی بڑھنے لگا۔

گندی گلی میں پہنچ کر اس نے کہا۔ ''آپ کو گلی کے نکڑ پر ایک جیپ ملے گی، اس پر سوار ہو جائیں گے۔ میں سیدھے راستے سے آ جاؤں گا تا کہ لوگ یہی سمجھیں کہ میں اکیلا گیا ہوں۔'' کہہ کر وہ واپس گھر میں چلا گیا اور میں گلی کے آخری سرے کی طرف بڑھنے لگا۔ گلی کے آخری سرے پر جیپ کھڑی تھی، میں اس پر سوار ہو گیا۔

جیسے ہی میں سیٹ پر بیٹھا، ڈرائیور نے جیپ آگے بڑھا دی۔ کچھ دور جانے کے بعد موڑ تھا، موڑ مڑتے ہی اس نے جیپ روک دی۔ جیپ کے رکتے ہی شیرو اندر آیا۔ اس کے ساتھ ایک برقع پوش عورت تھی جو میرے برابر میں آ کر بیٹھ گئی۔ جیپ پھر چلنے لگی۔ میں حیران تھا کہ جیپ میں شیرو کیوں آیا ہے؟ صبح ہی شیرو نے کہا تھا۔ ''مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جو جرائم پیشہ ہوتے ہیں، خاص کر ان سے جو مسلمان ہو کر بھی غنڈہ گردی کرتے ہیں۔'' پھر یہ گلفام کے پاس کیا کرنے جا رہا ہے؟

ابھی میں اسی مسئلے پر غور کر رہا تھا کہ شیرو نے کہا۔ ''یہ جیپ میں نے بھیجی تھی، وہ آدمی بھی میرا تھا۔''

مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس نے ایسا پُراسرار انداز کیوں اختیار کیا؟ حیرت کو فرو کرنے کے لیے میں نے پوچھا۔ ''کیوں؟ اگر سیدھے سیدھے بلاتے تو کیا میں نہیں آتا؟''

''آتے ضرور مگر مجھ تک پہنچ نہیں پاتے۔ اگر تھوڑی دیر اور وہاں رکتے تو آزادی سلب ہو چکی ہوتی۔''

''پہیلیاں نہ بجھواؤ، صاف صاف بولو، ایسی کون سی قیامت ٹوٹی ہے جو تم پُراسرار انداز میں باتیں کر رہے ہو؟''

''حرام کی کھانے والے ہر جگہ ہیں۔ رشوت دے کر کوئی بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ رشوت کے بل پر تمہارے پیچھے پولیس لگا دی گئی ہے۔ وکٹر نے پولیس کی مدد لی ہے۔ آج پولیس والے چھاپہ مارنے آ رہے ہیں۔''

شیرو کے انکشاف نے حیرت کا ایک اور جھٹکا دیا۔ میں نے پوچھا۔

''یہ خبر تم تک کیسے پہنچی؟''

''بھائی میاں! میں کلکتہ میں رہتا ہوں، کسی جنگل بیابان میں نہیں، میں کاروبار سے زیادہ دوستی بنانے پر توجہ دیتا ہوں، اسی کا نتیجہ ہے کہ ایسی باتیں بھی مجھ تک پہنچ جاتی ہیں جو کانفیڈینشل ہوتی ہیں۔ محکمۂ پولیس میں میرے کئی رفقاء ہیں۔ یہاں بھارت میں کسی بھی محکمے میں مسلمان ہوں، وہ تعصب کا شکار رہتے ہیں اسی لیے ان میں اسلامی اخوت آ جاتی ہے۔ مسلمانوں پر زد آتے دیکھ کر وہ اسے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات بھی ایک ایسے ہی مسلمان افسر نے مجھے بتائی۔''

''اگر یہ سچ ہے تو راجا بازار میرے لیے مخدوش ہو چکا ہے۔'' میں نے جواباً کہا۔

''اسی لیے تو میں تمہیں یہاں سے نکال رہا ہوں۔ میں تمہیں بج بج، لے جا رہا ہوں۔ وہ علاقہ مضافاتی ہے پھر وہاں مسلمانوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ وہاں آرام سے رہنا۔ ایک ڈیڑھ ہفتے بعد میں چکر لگاؤں گا۔''

''اگر یہ خبر صحیح ہے تو مجھے نہ پا کر تمہیں اور عادل کو پولیس تنگ کرے گی۔''

''میری تو خیر ہے، ہاں، عادل کو کچھ پریشانی ہو گی۔ میں اس کی مدد کروں گا۔''

''وہاں ریکھا ہو گی، اسے تو پولیس والے چھوڑیں گے نہیں۔ بے چاری مفت میں ماری گئی۔''

''میں حلوہ نہیں ہوں کہ جس نے چاہا، منہ میں رکھ لیا۔'' ریکھا کی آواز سن کر میں نے چونک کر دیکھا۔ برقع کا نقاب الٹا ہوا تھا۔ اسے اپنے برابر بیٹھا دیکھ کر میں نے سر پیٹ لیا۔ واقعی وہ پیر تسمہ پا بن گئی تھی۔

''لگتا ہے ان محترمہ کا دماغ بھی خوب چلتا ہے۔ جیسے ہی آپ گلی میں نکلے، یہ عادل کی بیوی کا برقعہ پہن کر خبر دینے والے لڑکے کے پیچھے لگ گئی۔ میں نے ایک نظر انہیں دیکھا تھا اس لیے پہچان گیا اور جیپ میں بٹھا لیا۔'' شیرو نے کہا۔

''اتنی آسانی سے تمہارا پیچھا بھی نہیں چھوڑوں گی۔'' اس نے میرے گلے میں بازو ڈال کر جھٹکے سے اپنے قریب کر لیا۔

''اے تمیز سے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا اور الگ کھسک گیا۔ ''مگر تمہیں اس لڑکے پر شک کیسے ہوا کہ وہ گلفام کا آدمی نہیں ہے؟''

''سیدھی سی بات ہے۔ ابھی ابھی گلفام گیا ہے پھر اس نے کیوں بلایا، اسی لیے میں تحقیق

کے لیے آئی تھی۔" پھر اس نے رک کر سلسلہ کلام جوڑا۔ "ویسے جمائی دا، آپ میں اتنے گن ہیں، اتنی خوبی ہے، ہمیں پہلے پتا نہیں تھا۔ آپ نے کس انوکھے انداز میں تین تین مسلح افراد کو چت کر دیا۔ آپ تو بہت بہادر ہیں۔"

میں جواب دیتا کہ شیرو نے کہا۔ "اسی لیے تو پولیس انہیں گرفتار کرنے دوڑ پڑی ہے۔"

پھر میری طرف دیکھ کر داہنی آنکھ دبا کر بولا۔ "میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ وکٹر نے پولیس میں رپورٹ لکھا دی ہے۔"

"جمائی دا، مجھے یقین ہے، اگر پولیس والے پہنچ جاتے تو آپ انہیں بھی ہاتھ پیر توڑ کر بھیجتے۔" ریکھا نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپا کر کہا۔ "اس ہاتھ میں بہت قوت ہے۔"

"پولیس والے پکڑ لیتے تو سیدھے پھانسی پر چڑھا دیتے۔ ابو میاں کا ایک ساتھی مر چکا ہے۔"

"اس کی موت تھی، وہ مر گیا۔ اس میں آپ کا کیا قصور؟"

"قانون تمہاری طرح عقل سے پیدل نہیں ہے، وہ قتل کو قتل کہتا ہے اور قتل کی سزا پھانسی ہے۔"

جیپ کا ڈرائیور ہر جانب سے لاتعلق بنا جیپ کو بھگائے لیے جا رہا تھا۔ سڑک کے اطراف کی عمارتوں کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم شہر سے باہر آ چکے ہیں۔ بڑی بڑی عمارتوں کی بجائے چھوٹے چھوٹے مکانات نظر آ رہے تھے۔

"بج بج میں میرا ایک دوست بیجو دے ہے، شاعری کرتا ہے، آپ اسے میرا یہ کارڈ دیں گے۔ وہ اپنے ہاں ٹھہرا لے گا۔" کہہ کر شیرو نے جیب سے اپنا کارڈ نکالا اور اس کی پشت پر کچھ لکھنے لگا پھر اس نے وہ کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کارڈ کو پینٹ کی پچھلی جیب میں رکھ لیا۔

"نام ہی سے شاعر لگ رہا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دل کا بہت اچھا ہے۔ بہت معصوم ہے۔ اس کے ساتھ رہ کر وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلے گا۔"

"ایک بات تو بتاؤ، یہ بات سمجھ نہیں پایا ہوں کہ وکٹر ایک غنڈا ہے۔ اس کے اشارے پر

پولیس کیوں بھاگی آ رہی ہے۔ ایسا تو صرف فلموں میں ہوتا ہے۔"

"فلمیں بھی حقیقی زندگی کا عکس ہوتی ہیں، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم مسلمان ہو، یہاں قدم قدم پر اسلام دشمن ہیں، ان کے لیے ہمارا وجود ایسا ہے جیسے کونین کی گولی۔ ان کا بس نہیں چلتا ورنہ وہ ایک دن میں ہمیں حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتے۔" شیرو کے اندر کا جذبہ بول رہا تھا۔ "جب بھی اپنی سرزمین پر پہنچنا، وہاں والوں سے کہنا، آپ لوگ دارالامان میں ہیں، کبھی ہمارے بارے میں سوچیں۔ ہم جو پیچھے رہ گئے، کس کرب میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمارے لیے کشمیر سے کنیا کماری تک دارالحرب بنا ہوا ہے اس لیے اپنی سرزمین کی حفاظت کریں۔ کہیں کوئی میر جعفر و میر صادق پھر شیخ مجیب الرحمان نہ بن جائے، اس لیے اخوت و اتحاد کا پیغام گھر گھر عام کریں تا کہ وہ ملک اسلام کا قلعہ ثابت ہو اور ہمارے دشمن، اس قلعے کے خوف سے ہم لوگوں پر ظلم کرنے سے باز رہیں۔"

اس کی بات پر ریکھا نے چونک کر اسے دیکھا، ریکھا کی اس حرکت نے مجھے ہوشیار کر دیا اور میں نے شیرو کو کہنی ماری۔ شیرو نے بھی ریکھا کے چونکنے کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "علی پور نزدیک ہے، یہاں سے تمہیں بج بج کے لیے گاڑی مل جائے گی۔ تم مجھے فون مت کرنا، میں اپنے دوست کو فون کر کے تمہاری خیریت لے لوں گا۔"

ابھی ہم علی پور میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے کہ بری طرح چونک گئے۔ کافی آگے پولیس نے بیریئر لگا رکھا تھا اور گاڑیوں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ وہ گاڑیوں کی تلاشی لے رہے تھے۔ اتنی دور سے ہم نے اس لیے دیکھ لیا تھا کہ سڑک گھومتی ہوئی جا رہی تھی۔ آگے ایک موڑ تھا، اس موڑ سے مڑ کر ہمیں واپس اس سڑک کے ذرا نیچے گزرنے والی متوازی سڑک پر آنا تھا۔ گویا ہم جہاں پر تھے، ٹھیک اسی جگہ پہاڑی سے نیچے کی طرف چیکنگ ہو رہی تھی۔ میں نے مڑ کر نیچے کی طرف دیکھا، ٹرک اور بسوں کو وہ ایک نظر دیکھ کر جانے دے رہے تھے مگر کار اور جیپ کی خصوصی چیکنگ کر رہے تھے۔

"لگتا ہے، مخبری ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے، وہ تمہیں ہی ڈھونڈ رہے ہوں۔ موڑ مڑتے ہی میں گاڑی رکوا دوں گا۔ تم اور ریکھا اتر جانا اور سیدھ میں نیچے اترتے جانا۔ پہاڑی کے نیچے جا کر یہی سڑک پھر آ جائے گی۔ میں چیکنگ کرا کر گاڑی وہیں لے آؤں گا۔"

میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا کیونکہ میری چھٹی حس لگاتار خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔

جیسے ہی گاڑی نے موڑ کاٹا، ڈرائیور نے گاڑی روک لی۔ میں نے اترنے کے بعد ریکھا کو سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ بھی نیچے اتر آئی۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ میں نے پہاڑی سے نیچے دیکھا، واقعی سڑک گھوم کر ادھر ہی آ رہی تھی۔

نیچے اترنے کی جگہ تھی۔ میں آہستہ آہستہ ادھر سے اترنے لگا۔ ریکھا کو اترنے میں پریشانی ہو رہی تھی۔ اسے میں نے سہارا دے رکھا تھا۔ تقریباً 20 منٹ میں ہم بے حال، پریشان نیچے اترے۔

سڑک سنسان پڑی تھی۔ جانے والی گاڑی جا رہی تھی مگر چیک پوائنٹ سے کوئی گاڑی آ نہیں رہی تھی۔ جب کافی دیر ہو گئی تو ریکھا نے کہا۔ ”کیوں ناں، ادھر ہی بڑھا جائے؟ ہو سکتا ہے، وہ صاحب رش میں پھنسے ہوں؟“

”وہاں ہمارے لیے تلاشی ہو رہی ہے۔“

”کیوں؟ کیا ہم نے ان کی مرغی چرائی ہے؟“

”وہ قاتل کو ڈھونڈ رہے ہیں اور ہم قتل کر کے بھاگے ہیں۔“

”ہاں، یہ تو ہے، وہ آپ کو ڈھونڈ رہے ہوں گے، میں جاتی ہوں، مجھے عورت سمجھ کر کچھ نہیں کہیں گے۔“

”ارے، گھامڑ دی گریٹ، پولیس والوں کو اطلاع دی گئی ہوگی کہ ایک عورت بھی میرے ساتھ ہے۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“

”ہاں، یہ تو ہے؟“ میں نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔ ”بے وقوف عورت، میرے کان نہ کھاؤ۔ میں ویسے ہی پریشان ہوں۔“

”اچھا بابا......!“ کہہ کر وہ ایک ابھرے ہوئے پتھر پہ بیٹھ گئی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا مگر شیرو کی گاڑی آتی نظر نہیں آ رہی تھی جبکہ ادھر سے کئی ٹرک اور کاریں آ چکی تھیں۔ میرا دل بار بار ایک ہی بات کہے جا رہا تھا کہ انتظار فضول ہے، ہو سکتا ہے، وہ خطرہ دیکھ کر وہیں سے لوٹ گیا ہوگا۔

جب سورج اپنے سفر کے مرکز پر پہنچا تو میرا حوصلہ جواب دے گیا اور میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔۔ ایک ٹرک تیزی سے ادھر ہی آ رہا تھا، میں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے مجھے اور

ریکھا کو دیکھ لیا تھا۔

یہ ایک اونچا اور بھاری بھرکم ٹرک تھا۔ ڈرائیور یا شاید اس کے ساتھی نے جو بھاری چہرے والا ایک ادھیڑ سا آدمی تھا، اُس نے کھڑکی سے سر باہر نکالا اور خشونت بھری آواز میں کچھ کہنے لگا۔ وہ بنگالی زبان میں بات کر رہا تھا۔ یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ ہم سے کیا کہہ رہا ہے۔

”ہماری کار خراب ہو گئی ہے۔ پلیز، آپ ہمیں لفٹ دے دیں گے؟“ میں نے چلا کر کہا۔ وہ شخص الجھن بھری نظروں سے کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا، شاید میری بات پوری طرح اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی، تاہم مجھے یقین تھا کہ لفظ ”لفٹ“ سے جسے میں نے واضح طور پر ادا کیا تھا، وہ میرا مقصد سمجھ گیا ہوگا۔

”مگر تم ہو کون، اور اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ڈرائیور نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔ اس کے لہجے سے اور اس کے چہرے سے شک کا اظہار ہو رہا تھا۔

”ہم ٹورسٹ ہیں اور انگلینڈ سے آئے ہیں۔“ میں نے کسی توقف یا ہچکچاہٹ کے بغیر کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتا، میں نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”باہر بہت سخت سردی ہے، پلیز آپ گاڑی میں سوار ہونے کی اجازت دے دیں۔“

”آ جاؤ۔“ اس شخص نے ہاتھ کے اشارے کے ساتھ کہا اور اگلے ہی لمحے دروازہ کھول دیا۔

میں نے سہارا دے کر پہلے ریکھا کو گاڑی میں سوار کرایا پھر پھرتی سے خود بھی اوپر پہنچ گیا۔

ٹرک کا یہ اگلا حصہ خاصا کشادہ اور گرم تھا۔ اوپر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اس میں دو افراد ہیں، وہ شخص جو ہم سے باتیں کرتا رہا تھا، ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹرک کا ڈرائیور اس شخص کی نسبت کم عمر تھا اور عجیب ہوسناک نگاہوں سے ریکھا کا جائزہ لے رہا تھا۔

اگلی دونوں نشستوں کے پیچھے ایک لمبی کاؤچ نما سیٹ تھی۔ ادھیڑ شخص نے ہمیں اس سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا اور اس کے ساتھ ہی ٹرک دوبارہ حرکت میں آ گیا۔

”اتنی رات گئے تم لوگ اس اجاڑ، غیر آباد جگہ پر کیا لینے آئے تھے؟“ یہ سوال ڈرائیور نے اردو میں پوچھا اور میں نے محسوس کیا کہ اپنے ادھیڑ عمر ساتھی کی نسبت اس کی اردو خاصی بہتر تھی۔

”یہاں ایک بہت قدیم حویلی ہے، سولہویں صدی کی۔“ میں نے فوراً بات بنائی۔ ”ہم

دونوں اس کی سیر کے لیے آئے تھے مگر پھر بارش شروع ہوگئی۔ ہم بہت دیر تک بارش کے رکنے کا انتظار کرتے رہے مگر پھر بالآخر واپسی کے لیے نکلنا پڑا لیکن بدقسمتی سے کچھ ہی دور جا کر ہماری گاڑی کا انجن بند ہوگیا۔"

"ہوں۔" ڈرائیور نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بج بج میں تم دونوں کس جگہ جاؤ گے، میرا مطلب ہے کس سرائے میں ٹھہرے ہو، ہوسکتا ہے ہم اس کے قریب سے گزریں۔"

"ہم چوک جائیں گے۔" میں تیزی سے بولا۔ "مگر آپ ہمیں شہر کے شروع میں کسی ایسی جگہ اتار دیں، جہاں سے ہمیں سواری مل جائے۔"

"ہوں۔" ڈرائیور نے پہلے کی طرح سر ہلاتے ہوئے نیچی آواز میں کہا اور اپنے سامنے لگے ہوئے آئینے میں ایک بار پھر رال ٹپکاتی نظروں سے ریکھا کی جانب دیکھا۔

مجھے اس کی ان ہوسناک نظروں سے اور اس کے سوالوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ میرا شدت سے جی چاہ رہا تھا کہ اس سے کہوں اپنی نگاہیں سامنے سڑک پر مرکوز رکھے اور مزید کوئی سوال نہ پوچھے مگر میں ایسا نہ کرسکا اور نہ ہی میری یہ خواہش پوری ہوسکی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے اگلا سوال کیا۔ "تم دونوں میاں بیوی ہو یا......"

"ہم دونوں منگیتر ہیں۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

اسی وقت بیک ویو مرر سے منعکس ہونے والی روشنی ایک ثانیے کو میرے چہرے پر پڑی تو میں نے بے اختیار اس آئینے کی طرف مڑ کر دیکھا۔

ٹرک کے اس غیر معمولی طور پر لمبوترے سے آئینے میں مجھے پیچھے سے آنے والی کسی گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ یہ روشنیاں اگرچہ کافی دور معلوم ہو رہی تھیں مگر انتہائی تیزی سے وہ ہر لمحہ قریب تر آتی جا رہی تھیں۔

خطرے کی مخصوص سنسنی نے میرے وجود کے اندر سر اٹھایا۔ اسی وقت غالباً ٹرک کے ڈرائیور نے بھی ان روشنیوں کو دیکھ لیا۔ اپنی جانب کے بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے وہ اونچی آواز میں بولا۔

"یہ کون احمق ہے، اس قدر تیز رفتاری سے چلا آ رہا ہے۔ یوں جیسے ہمارے تعاقب میں آ رہا ہو۔"

ڈرائیور کی اس بات نے میری تشویش کو کچھ اور بڑھا دیا۔ "تم رفتار کچھ اور تیز نہیں

کر سکتے؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"کیوں؟" ڈرائیور نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ "کہیں یہ گاڑی تمہارے تعاقب میں تو نہیں آ رہی؟"

"نہیں، ہاں شاید میرا مطلب ہے ممکن ہے ایسا ہی ہو۔" میں ڈرائیور کے اس غیر متوقع سوال پر ذرا دیر کو گڑبڑا سا گیا۔ اسی لمحے بے اختیار میری نظر ایک بار پھر بیک ویو مرر پر پڑی پیچھے آنے والی گاڑی کی روشنیاں اب بہت قریب آ چکی تھیں۔

ڈرائیور نے سامنے لگے آئینے کی طرف رخ کر کے نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کیں اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے ادھیڑ عمر شخص نے اس سے مخاطب ہو کر بنگلہ میں کوئی بات کی۔ جواب میں ڈرائیور نے نیچی آواز میں کچھ کہا جسے سنتے ہی وہ ادھیڑ شخص اونچی آواز میں کچھ بولنے لگا پھر گردن گھما کر اس نے میری طرف دیکھا اور غصے بھری آواز میں نہ جانے کیا کہتا رہا۔

"آپ کے یہ ساتھی کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے ڈرائیور سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"یہ کہہ رہے ہیں کہ تم دونوں فوراً گاڑی سے اتر جاؤ۔ ہم کسی جھگڑے یا کسی مشکل میں گرفتار نہیں ہونا چاہتے۔" ڈرائیور نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھی کا خیال ہے کہ تم دونوں کوئی جرم کر کے بھاگے ہو اور اب پولیس تمہیں گرفتار کرنے کے لیے آ رہی ہے۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "بات اصل میں یہ ہے کہ جس جگہ ہم سیر کے لیے گئے تھے، وہاں چند غنڈوں نے میری منگیتر کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم دونوں بڑی مشکلوں سے ان کے چنگل سے نکل کر بھاگے ہیں۔ مگر ان غنڈوں نے شاید ہمیں آپ کے ٹرک میں سوار ہوتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ کیا آپ اس مصیبت میں ہم دونوں کی مدد نہیں کریں گے؟"

ڈرائیور میری یہ بات سن کر چند ثانیے گومگو کی کیفیت میں رہا، پھر ہچکچاتے ہوئے بنگلہ میں اپنے ادھیڑ ساتھی سے کچھ کہنے لگا لیکن ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ اس کا ساتھی اونچی آواز میں نہ جانے کیا کہنے لگا اور ہاتھوں سے کبھی ہماری طرف اور کبھی باہر کی جانب اشارہ کرنے لگا۔

"آئی ایم سوری، دوستو۔" ڈرائیور نے کندھے اچکائے اور میری طرف رخ کر کے

بولا۔ ''میں تو آپ دونوں کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر میرا ساتھی نہیں مانتا۔ اس کا کہنا ہے کہ پہلے ہی ہم بہت زیادہ لیٹ ہیں، اب ہم مزید ایک منٹ......''

ڈرائیور اپنا جملہ پورا نہ کرسکا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا اور اس کی نظریں سامنے سڑک پر مرکوز تھیں اور خوف اور پریشانی کا تاثر اس کے چہرے پر گویا منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔

میں نے اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر سامنے کی طرف دیکھا تو چند سیکنڈ کے لیے خوف کی ایک لہر میرے وجود میں بھی اترتی چلی گئی۔ ہمارے ٹرک سے تقریباً تیس گز آگے ایک بڑے سائز کی جیپ سڑک کے بیچوں بیچ یوں ترچھی کھڑی تھی کہ ٹرک کا آگے بڑھنا ناممکن ہو چکا تھا۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر ہمارے ٹرک کو رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

میری نظر بے اختیار بیک ویو مرر کی طرف گئی مگر وہ آئینہ تاریک ہو چکا تھا۔ بلاشبہ یہ وہی ہل ڈرائیو جیپ تھی جو چند سیکنڈ پہلے تک ہمارے ٹرک کے پیچھے آ رہی تھی۔ جب ہم باتوں میں منہمک تھے، اس دوران وہ جیپ ہمارے برابر سے نکل کر آگے چلی گئی تھی اور اب وہ ہمارا راستہ روک چکے تھے۔ ایسی جیپیں عام استعمال میں کم ہی نظر آتی تھیں۔ یہ کار کی طرح چار دروازوں والی ہوتی تھیں اور فوج کے استعمال میں رہتی تھیں۔

ٹرک ڈرائیور نے جیپ کو دیکھتے ہی بریک پر پاؤں رکھ دیا تھا پھر بھی ٹرک کچھ دور تک پھسلتا چلا گیا۔ ہیڈ لائٹس میں، میں نے دیکھا کہ سامنے کھڑی ہوئی جیپ کے اگلے اور پچھلے دروازے کھل رہے تھے۔ درمیانے قد کا ایک تنومند شخص اگلے دروازے سے اور ایک طویل قامت شخص جس کے ہاتھ میں جدید طرز کی ایک سیاہ بندوق نظر آ رہی تھی، جیپ کے پچھلے دروازے سے باہر آیا۔

یہ منظر ریکھا بھی دیکھ رہی تھی میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس لمحے میں نے محسوس کیا کہ خوف کی وہ سرد لہر جو چند ثانیے پیشتر میرے وجود میں کپکپائی تھی، اب اس کا کہیں نشان تک نہ تھا۔ اس کی جگہ ایک عجیب سا نومولود جذبہ ایک ولولہ انگیز عزم گویا میرے روئیں روئیں پلتا اور پھوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

یہ انوکھا احساس میرے لیے کچھ ایسا بہت نامانوس بھی نہیں تھا۔ اپنی اس نئی زندگی میں جب بھی مجھے ایسے کسی خطرے کا سامنا کرنا پڑا، ہر بار یہ انوکھا احساس میرے دل و ذہن کو اور

میرے سارے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔ اس کیفیت میں میرا ذہن غیر معمولی طور پر تیزی سے کام کرنے لگتا تھا اور طاقت و توانائی جیسے میرے جسم کے اندر سے اور میرے ہر عضو سے ابلنے لگتی تھی۔

باہر جانے کے ارادے سے میں اپنی سیٹ سے اٹھنے لگا تو اچانک مجھے ایک خیال آیا اور میں ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ٹھیک ہے مسٹر...... میں خود کو ان غنڈوں کے حوالے کر رہا ہوں لیکن مہربانی کر کے ایک احسان مجھ پر کریں کہ میری ساتھی کو شہر پہنچا دیں اور......''

میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ریکھا تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور میرے بازو کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے کر بولی۔ ''نہیں، میں تمہارے بغیر ہرگز کہیں نہیں جاؤں گی، ہم دونوں ساتھ ہی باہر نکلیں گے۔''

میں نے پلٹ کر ریکھا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اور اس کے چہرے پر لرزتے خوف کے سائے اب معدوم ہو چکے تھے اور اس کی حسین آنکھوں میں بھی اب ایک عزم کی چمک تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھپک کر کہا۔ ''بس دل میں دعا کرتی رہنا اور ہمت نہ کھونا۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا۔ وہ سب ہتھیار جو کچھ دیر پہلے میں نے چھینے تھے، میری جیبوں میں موجود تھے۔ گن اور پستول سائز میں بڑے تھے اور انہیں ہاتھ میں لے کر نکلتا تو وہ فوراً نظر آ جاتے تاہم خنجر سائز میں کافی چھوٹا تھا اور بہ آسانی چھپایا جا سکتا تھا۔

میں نے وہ خنجر جیب سے نکالا اور اسے اپنی آستین میں اس طرح اڑس لیا کہ اس کا دستہ میری آستین کے اندر چھپا ہوا تھا جبکہ اس کی نوک میری ہتھیلی پر تھی۔ میں نے اپنی انگلیاں اس نوک پر جمائیں اور دوسرے ہاتھ سے ریکھا کا بازو تھام کر ٹرک کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد میں اور ریکھا اس ٹرک سے چند گز آگے، سڑک کے درمیان سے اس جیپ کی طرف بڑھ رہے تھے جو ہم سے چند گز آگے سڑک کے درمیان کھڑی تھی۔ ''میرا نام پیٹر ہے میرا تعلق وکٹر گروپ سے ہے۔ وہ اب جیپ کے سامنے کھڑا تھا اور اپنے دائیں ہاتھ میں ریوالور تھامے اس کا رخ ہماری طرف کیے ہوئے تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی ابھی تک جیپ کے پچھلے دروازے کے قریب کھڑا تھا مگر اس کے پستول کی نال بھی ہماری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"اپنے ہاتھ سر سے اوپر اٹھاؤ۔" اس نے اونچی درشت آواز میں کہا اور پھر تمسخرانہ انداز میں ہنستے ہوئے قدرے دھیمے انداز میں بولا۔ "تم تو یوں آ رہے ہو جیسے اپنی محبوبہ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی پارک میں چہل قدمی کر رہے ہو۔ تیزی سے قدم بڑھاؤ، ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

میں نے ریکھا کا ہاتھ چھوڑا اور دونوں بازو اس طرح اوپر اٹھائے کہ میری ایک انگلی اب بھی خنجر کی نوک پر جمی ہوئی تھی۔ ریکھا نے بھی اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لیے اور بااعتماد انداز سے چلتے ہوئے ہم دونوں بالآخر اس جیپ کے قریب پہنچ گئے۔

ٹرک کی تیز ہیڈ لائٹس سیدھی پیٹر کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ فاتحانہ ہی نہیں حقارت آمیز بھی تھی۔ طیش کی ایک آتشیں لہر میرے اعصاب کو سلگاتی چلی گئی۔

"بس کرو، کب تک یہ بچکانہ آنکھ مچولی کھیلتے رہو گے۔" پیٹر نے اپنے پستول کی نوک سے میری کنپٹی پر دستک دیتے ہوئے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں تم خود کو ہماری نظروں سے چھپا سکو۔"

"فضول باتیں چھوڑو، اس لڑکی کو جانے دو۔" میں نے اعتماد سے کہا۔

"تمہاری تاکید کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم یقیناً ایسا ہی کریں گے مگر ابھی نہیں، دو تین روز کے بعد۔"

"دو تین روز بعد، کیوں؟" میں نے تیزی سے بولا۔

"ہیں ہماری کچھ مجبوریاں۔" اس نے بے پروائی سے کہا پھر ایک لمحے کو توقف کے بعد معنی خیزی سے مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "مگر تم فکر مت کرو، ان دو تین دنوں کے دوران ہم دونوں کو ایک ہی جگہ پر رکھیں گے۔ دیکھو ہمیں تمہارا کس قدر خیال ہے، اس مہربانی پر تمہیں ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

"مگر مجھے تمہاری اس مہربانی کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے پر ایک بار پھر معنی خیز سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور کچھ کہنے کے ارادے سے اس نے منہ کھولا مگر اسی لمحے ٹرک کے ہارن کی آواز گونجی اور ہم سب پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ادھیڑ شخص ٹرک کی کھڑکی سے سر باہر نکالے زور زور سے ہاتھ ہلا رہا تھا اور اونچی

آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔

"اوکے، اوکے۔" پیٹر نے اپنا بایاں ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے چلا کر کہا اور پھر جیپ کے ڈرائیور کی طرف رخ کر کے بولا۔ "جیپ کو ایک طرف کر لو۔ اس کو بہت جلدی ہے، پہلے اسے گزر جانے دو۔"

"یس سر!" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے مؤدبانہ لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی جیپ حرکت میں آ گئی۔ چند گز ریورس کرنے کے بعد اس نے جیپ سڑک کے کنارے اس طرح لا کھڑی کی کہ میں اور ریکھا اب جیپ کے سامنے نہیں بلکہ اس کے اگلے دروازے کے بالکل پاس کھڑے تھے جبکہ طویل قامت بندوق بردار چند قدم پیچھے ہم پر نشانہ لیے کھڑا تھا۔ جیپ کی اس مختصر سی حرکت کے دوران میں نے دیکھ لیا تھا کہ ڈرائیور کے سوا جیپ کے اندر کوئی اور شخص موجود نہیں تھا۔

جیپ جیسے ہی سڑک کے کنارے آ کر رکی، دیوہیکل ٹرک حرکت میں آیا اور ہمارے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گیا اگرچہ اس دوران بندوق بردار کی توجہ زیادہ تر مجھ پر مرکوز رہی تھی مگر جب ٹرک گرج دار آواز کے ساتھ ہمارے پاس سے گزر کر آگے گیا تو محض چند سیکنڈ کے لیے ان دونوں نے گردن گھما کر اس ٹرک کی طرف دیکھا، میرا ذہن اور میری آنکھیں جو خطرے کے ان لمحات میں غیر معمولی طور پر مستعد اور نگراں تھیں، غفلت کے اسی مختصر ترین وقفے کی منتظر تھیں۔

جیسے ہی دونوں نے اپنا رخ دوسری جانب کیا، ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے اپنی آستین میں چھپا ہوا خنجر مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں تھاما اور اس کے ہاتھ پر وار کیا جس میں اس نے پستول تھام رکھا تھا اور جو میرے چہرے کے بالکل قریب تھا۔

معلوم نہیں یہ میرے اندازے کی غلطی تھی کہ عین وقت پر اس نے اپنے بازو کو خفیف سی حرکت دی تھی۔ میرے خنجر کی نوک اس کی کلائی میں پیوست ہونے کی بجائے اس کی کھال کو چھیلتی چلی گئی۔ اسی لمحے میں نے نہایت سرعت سے اپنے بائیں ہاتھ کو نیچے جھکایا تاکہ پستول اس کے ہاتھ سے چھین سکوں لیکن اس سے پہلے کہ میرا وہ ہاتھ پستول تک پہنچ سکتا، اس نے تکلیف کی شدت سے اپنے ہاتھ کو زور سے جھٹکا اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے نیچے جا گرا۔ "ریکھا، فوراً یہ پستول اٹھا لو۔" میں نے اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہوئے تیزی سے کہا۔

ریکھا جو اس کو یوں اچانک تکلیف سے سسکاریاں بھرتے اور ہاتھ جھٹکتے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے ہکا بکا سا ہو کر رہ گئی تھی، میری آواز سن کر نیچے پڑے ہوئے پستول دیکھا اور اسے اٹھانے کے لیے جھکی مگر اس کا ہاتھ ابھی پستول تک نہیں پہنچا تھا کہ فضا میں فائر کا زوردار دھماکا ہوا اور وہ اچھل کر بے اختیار پیچھے ہٹ گئی۔

فائر اس طویل قامت شخص نے کیا تھا جو بندوق تانے کھڑا تھا۔ بندوق کی گولی ریکھا کے پیروں کے بالکل قریب جا دھنسی تھی اور میں نے دیکھا کہ اس بندوق بردار کی انگلی دوبارہ ٹریگر پر سرسرانے لگی تھی۔ سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے میرے پاس بہت مختصر وقت تھا۔ میں نے خنجر کی نوک فوراً ٹھگنے کی گردن پر رکھ دی جو ابھی تک بری طرح ہاتھ جھٹک رہا تھا اور مغلظات بک رہا تھا۔ وہ میری اس غیر متوقع حرکت پر ایک لمحے کو بوکھلا کر رہ گیا۔ میں نے فوراً ہی پستول نکالا اور پھر وہ ہاتھ اس کی گردن میں گھما کر پستول کی نال اس کی بائیں کنپٹی سے لگا دی۔

"بندوق پھینک دو۔" میں نے طویل قامت شخص کی جانب دیکھتے ہوئے واضح آواز میں کہا۔ "ورنہ اس خنجر کا پھل تمہارے باس کی شہ رگ میں اتر جائے گا اور پستول کی گولی اس کی کنپٹی میں۔"

یہ صورتِ حال اس بندوق بردار کے لیے بھی قطعی غیر متوقع تھی۔ کچھ دیر تک وہ شش و پنج کے عالم میں نال کو تیزی سے دائیں بائیں حرکت دیتا رہا، جیسے فائر کرنے کے لیے کسی موزوں زاویے کی تلاش میں ہو مگر وہ دوبارہ فائر نہ کر سکا۔

"تم نے سنا نہیں۔" میں نے دوبارہ چلا کر کہا۔ "بندوق نیچے ڈال دو فوراً ورنہ اس پستول کی ساری گولیاں ابھی تمہارے اس رنگ لیڈر کے سر میں اتار دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے خنجر کی نوک اس کی گردن میں چبھوئی اور پستول کے ٹریگر پر دانستہ اپنی انگلی کو حرکت دی۔

پیٹر کے حلق سے بے اختیار ایک سسکاری سی بلند ہوئی۔ میں تیسری بار طویل قامت شخص کو وارننگ دینے والا تھا مگر اس سے پہلے ہی اس نے ہچکچاتے ہوئے بندوق پھینک دی۔

"ریکھا، آگے بڑھو، بندوق اٹھا کر اس لمبو کے پیچھے کھڑے ہو جاؤ مگر اس طرح کہ بندوق کی نال اس بدمعاش کی کمر سے لگائے رکھنا اگر کوئی حرکت کرنے کی کوشش کرے تو بے دھڑک فائر کر دینا۔" میں نے اپنی توجہ طویل قامت شخص کی جانب رکھتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

ریکھا آگے بڑھتے ہوئے ہچکچا رہی تھی اور اس کی یہ ہچکچاہٹ کچھ ایسی بے سبب بھی نہیں تھی۔ "آگے بڑھو اور جیسا میں نے کہا ہے، ویسا ہی کرو۔" میں نے ایک بار پھر کہا۔ "یہ ہم دونوں کی زندگیوں کا سوال ہے اگر ہم نے دیر کر دی یا ہمت ہار بیٹھے تو ان بدمعاشوں کے اور ساتھی یہاں پہنچ جائیں گے۔ جلدی کرو شاباش۔"

میری یہ بات سن کر ریکھا تیزی سے آگے بڑھی اور بندوق اٹھا کر اس طویل قامت شخص کے پیچھے چلی گئی۔ میں پوری طرح ریکھا کی جانب متوجہ تھا، اس دوران دو مرتبہ "ٹھک ٹھک" کی نہایت مدھم سی آواز میری کانوں تک پہنچی اور پھر جیسے کسی نے سرسراتی ہوئی آواز میں آہستگی سے کچھ کہا۔

یہ سنتے ہی میں نے فوراً پیٹر کی طرف دیکھا، وہ اپنا پاؤں پیچھے کیے غالباً تیسری بار جیپ کے اگلے حصے پر ٹھوکر لگانے کو تھا اور یہ سرگوشی بھی بلاشبہ اسی نے کی تھی۔ میرے لیے یہ جاننا مشکل نہ تھا کہ وہ کسی کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا میں نے بے اختیار اس تیسرے شخص کی جانب دیکھا جو ابھی تک جیپ کے اندر موجود تھا وہ اپنے باس کا اشارہ سمجھ چکا تھا اور جیپ کا اگلا دروازہ کھول رہا تھا۔

اس نئے خطرے نے چند ثانیوں کے لیے مجھے گڑبڑا کر رکھ دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس تیسرے شخص کو کیسے روکا جائے اگر میں خود آگے بڑھ کر مزاحمت کی کوشش کرتا تو لازمی طور پر میری توجہ پیٹر کی طرف سے ہٹ جاتی اور وہ تو شاید ایسے ہی کسی موقع کی تاک میں تھا وہ بلاشبہ میری اس غفلت سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا اور اگر میں ریکھا کو اس کا نشانہ لینے کی ہدایت کرتا تو طویل قامت شخص ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر ریکھا پر قابو پا لیتا۔

میں نے اپنے ذہن پر زور دیا اور اپنے دماغ سے رجوع کرنے کی کوشش کی میری یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی جیسا کہ پہلے بھی خطرات کے موقع پر کئی بار مجھے تجربہ ہو چکا تھا، نسیان کے اندھیروں میں گم، برسوں پہلے کا کوئی سبق جیسے میرے شعور میں تازہ ہو گیا۔

"جب کبھی ایسا موقع آئے کہ تمہیں بیک وقت دو دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑے تو اس صورتِ حال سے نمٹنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دو اسے جو تمہارے نزدیک تر ہو، فوری طور پر کچھ دیر کے لیے ناکارہ کر دو۔" یہ آواز ماضی کی اندھی گہرائیوں سے آ رہی تھی اور میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرا رہی تھی۔ "اگر تمہارے پاس

کوئی پستول یا بندوق ہو تو اس شخص کے کسی ایسے عضو کو نشانہ بناؤ کہ وہ ہلاک بھی نہ ہو اور کچھ دیر کے لیے ناکارہ ہو جائے۔"

میری تمام تر توجہ اس آواز پر مرتکز تھی مگر میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص جیپ کا دروازہ کھول چکا تھا اور اب باہر نکلنے والا تھا۔

مزید کسی سوچ و بچار کا کوئی موقع نہ تھا، میں نے پیٹر کی جانب دیکھا۔ وہ گردن موڑے اپنے اسی ساتھی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ میں دبے خنجر کی نوک اس کے حلق سے ہٹا کر اس کی گردن کے وسط میں، ایک جھٹکے سے چوتھائی انچ کے قریب گوشت میں پیوست کی اور پھر فوراً ہی اس کے کان کی لو تک جلد کو کاٹتا چلا گیا۔ اس کی گردن سے خون کا فوارہ بلند ہوا اور میرے ہاتھ اور آستین کو بھگوتا چلا گیا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ میری توقع سے کہیں زیادہ کرب ناک اور اونچی تھی۔ وہ تازہ ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح تڑپ کر جیپ کے بونٹ سے ٹکرایا اور پھر نیچے گر گیا۔

میں اسے وہیں چھوڑ کر تیزی سے جیپ کے اگلے دروازے کی جانب لپکا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص اپنا دایاں بازو، جس میں اس نے بندوق تھام رکھی تھی، دروازے سے باہر نکال چکا تھا مگر پیٹر کی دلدوز چیخیں سن کر وہ چند ثانیوں کے لیے ٹھٹک کر رہ گیا تھا اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی پیش قدمی کرتا، میں دروازے کے بالکل سامنے پہنچ گیا۔ داہنے ہاتھ سے دروازے کے ہینڈل کو تھام کر میں نے ذرا سا پیچھے کی طرف کھینچا اور پھر فوراً ہی اتنی طاقت سے اس شخص کے بازو پر دے مارا کہ مجھے یقین تھا اس ضرب سے اس کی کلائی کی دو تین ہڈیاں ضرور چکنا چور ہو گئی ہوں گی۔

اس شخص کے حلق سے بلند ہونے والی چیخ بھی میرے شکار کی چیخوں سے کم دلدوز اور کرب ناک نہ تھی۔ تکلیف کی شدت سے وہ بار بار اپنا سر ہیڈ ریسٹ سے ٹکرا رہا تھا مگر میں نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی اپنا دباؤ کم نہیں ہونے دیا۔ اس کے برعکس میں نے اپنے ہاتھوں کے علاوہ اپنے گھٹنے کو بھی جیپ کے دروازے کے ساتھ لگایا اور پوری طاقت سے اندر کی جانب دھکیلنے لگا۔

اس شخص کی چیخیں پہلے سے بھی زیادہ بلند تھیں اور بندوق اس کی بے اختیار اکڑ جانے والی انگلیوں سے پھسل کر باہر آ گری۔ میں نے دروازے پر اپنا دباؤ بدستور برقرار رکھتے ہوئے

بائیں ہاتھ میں تھاما ہوا پستول جیب میں ڈالا اور پھر اسی ہاتھ سے نیچے پڑی ہوئی بندوق اٹھالی لیکن ابھی میں سیدھا کھڑا نہیں ہو پایا تھا کہ فضا میں ایک تیسری چیخ گونجی۔ یہ ریکھا کی چیخ تھی میں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ طویل قامت شخص اس کے ہاتھ سے بندوق چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے بندوق کی نال کو اپنے بائیں ہاتھ میں مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ ریکھا دونوں ہاتھ بندوق کے دستے پر جمائے اپنی جانب کھینچ رہی تھی مگر طویل قامت شخص نے اس کے بال اپنے دوسرے ہاتھ کی گرفت میں لے رکھے تھے اور انہیں بار بار جھٹکے دے رہا تھا۔ وہی ریکھا جو کچھ وقت پہلے قہر و غضب کا نشان بنی ہوئی تھی اور جوشِ انتقام میں ہرکیولیس جیسی بن گئی تھی، اب صرف بال دشمن کی پکڑ میں آ جانے سے بے بس سی ہو گئی تھی اور خود کو چھڑانے اور بندوق بچانے کی سعی کر رہی تھی۔

شدید طیش کی ایک لہر میرے روئیں روئیں میں دوڑ گئی۔ میں نے بندوق فوراً اپنے دائیں ہاتھ میں منتقل کی اور طویل قامت شخص کی ٹانگوں کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی اس شخص کے داہنے گھٹنے میں لگی۔ ایک غیر انسانی سی کراہ اس شخص کے حلق سے بلند ہوئی اور وہ اُلٹ کر کمر کے بل پیچھے کی طرف جا گرا لیکن اس کے ساتھ ہی ریکھا بھی اس طرح آگے کی طرف گری کہ بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

میری توجہ ریکھا کی جانب مبذول ہوئی تو جیپ کے اندر بیٹھے ہوئے شخص نے پھرتی سے اپنا بازو اندر کھینچ لیا اور پھر دوسرے ہاتھ سے فوراً دروازہ اندر سے لاک کر لیا اضطراب اور تناؤ کی اس کیفیت میں بھی میں اس شخص کی اس بچکانہ حرکت پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے والے کبوتر کی مانند اس شخص نے یہ اضطراری حرکت شاید خود کو محفوظ کرنے کے لیے کی تھی، حالانکہ جیپ کے دوسری جانب کے دونوں دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے جھک کر اس شخص کی طرف دیکھا مگر وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا اس کے چہرے پر شدید اذیت کا تاثر تھا اور وہ دونوں آنکھیں سختی سے بند کیے بار بار اپنے بازو کو حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا جس انداز سے اس کا وہ بازو خفیف سی حرکت کر رہا تھا اسے دیکھ کر میرا یہ اندازہ مزید قوی ہو گیا کہ اس کی کلائی کی کئی ہڈیاں ٹوٹ چکی ہوں گی۔

اس شخص کی طرف سے مطمئن ہو کر میں ریکھا کی جانب لپکا مگر جیسے میں نے اپنا دایاں پاؤں اٹھایا، نیچے سے کسی ہاتھ نے میرے ٹخنے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں نے فوراً سر جھکا

کر نیچے کی طرف دیکھا۔ یہ پیٹر تھا جو بری طرح زخمی ہونے کے باوجود میری ٹانگ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے جکڑے مجھے نیچے گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر فوراً ہی میں نے اپنا پاؤں دوبارہ مضبوطی سے نیچے نہ جما لیا ہوتا تو یقیناً منہ کے بل جا گرتا۔

معلوم نہیں یہ میرے لاشعور میں دبا، برسوں پرانا کوئی انتقام کا جذبہ تھا یا یہ احساس کہ اس شخص نے ریکھا پر تشدد کیا تھا مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون اچانک کھولنے لگا اور میرے اعصاب پر رینگتی اور سلگتی چنگاریاں بھڑک کر شعلوں کی مانند جل اٹھی ہوں۔

میں نے دانت پیستے ہوئے اپنا بایاں پیر اٹھایا اور پوری طاقت سے اس کے جبڑے پر مارا اس کے حلق سے بلند ہونے والی آواز ایسی تھی جیسے کوئی زخمی جانور ڈکرایا ہو اس کی کٹی ہوئی گردن پہلے سے خون میں تر بتر تھی مگر اب خون اس کے منہ سے اور اس کے نتھنوں سے بھی بہنے لگا تھا۔ ٹھگنے نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ میرے ٹخنے سے ہٹائے اور بے اختیار اپنے جبڑے پر رکھ لیے۔ میں نے جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دیکھا کہ اس کے دونوں ہاتھ آن کی آن میں خون میں لتھڑ کر رہ گئے۔

لیکن میرے وجود میں بھڑکتی ہوئی آگ ٹھگنے کی یہ حالت دیکھ کر بھی سرد نہ ہوئی۔ میں اپنے دونوں پیروں سے اس کی پسلیوں پر اس کے پیٹ میں اور ٹانگوں پر پے در پے ضربیں لگاتا رہا۔ اس کے منہ سے ناک سے اور اس کی گردن سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے اور سڑک کو دور دور تک داغ دار کر رہے تھے۔

میں ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکا تو وہ گھٹنے زمین پر ٹکا کر اٹھا اور دونوں ہاتھ بلند کر کے رحم کی التجا کرنے لگا۔ میں نے بندوق کے دستے سے اس کے اٹھے ہوئے ہاتھوں پر ضرب لگائی اور پھر اس کے سینے پر اتنی زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ الٹ کر بہت دور جا گرا۔

میں ایک بار پھر تیزی سے اس کی طرف لپکا مگر جب میں اس کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ چت پڑا ہے اور اس کے جسم کو رہ رہ کر جھٹکے سے لگ رہے ہیں۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے اس پر مزید کسی تشدد کا ارادہ ترک کر دیا مگر میرے لہو میں طیش کا مدوجزر ابھی جاری تھا۔ میں نے پلٹ کر اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا وہ شخص جو جیپ کے اندر تھا، ابھی تک اپنی سیٹ پر دبکا ہوا تھا اور سہمے ہوئے انداز سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سکڑی ہوئی آنکھوں سے اور اس کے ماتھے کی شکنوں سے شدید اذیت کا تاثر عیاں

تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس کی سکڑی ہوئی آنکھیں قدرے پھیل گئیں اور وہ خوف زدہ سا ہو کر کچھ اور نیچے سرک گیا۔

تب میں نے ان کے تیسرے، طویل قامت ساتھی کی طرف نگاہ کی وہ ابھی تک اپنے زخمی گھٹنے کو ایک ہاتھ سے تھامے ہوئے تھا اور دوسرا ہاتھ زمین پر ٹکا کر بار بار اٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے چند منٹ پہلے کا وہ منظر یاد آ گیا جب ریکھا کے بال اپنی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھا اور اس سے بندوق چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے سر پر جا پہنچا اس کے زخمی گھٹنے سے بہنے والا خون اس کے آس پاس کی مٹی کو رنگین کر چکا تھا مگر اسے دیکھ کر بھی میرا غصہ کم نہ ہو سکا۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ بے اختیار پیچھے ہٹ گیا اور اب اپنا ایک ہاتھ اٹھائے مجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا مگر اس کی منت سماجت کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہو سکا۔ میں نے بائیں ہاتھ کی ٹھوکر سے اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو پیچھے ہٹایا اور پھر داہنے پیر سے اس کے سینے پر زوردار ضرب لگائی۔

اس کے حلق سے بلند ہونے والی کراہ بہت بلند تھی اور تکلیف کی شدت سے وہ تڑپنے لگا تھا مگر اس لمحے مجھ پر گویا جنون سا طاری تھا۔ میں اپنے پیروں سے اس کے سینے پر اور اس کے پہلو میں بھی اندھا دھند ٹھوکریں مارتا چلا گیا۔ اگر ریکھا نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھوں سے میری کمر کو اپنی گرفت میں لے کر پیچھے نہ کھینچ لیا ہوتا تو یہ سلسلہ شاید کچھ دیر اور جاری رہتا۔ ''بس کرو ہمیں یہاں سے نکلنا بھی ہے۔''

میں نے پلٹ کر ریکھا کی طرف دیکھا، جس جگہ ہم کھڑے تھے، وہاں روشنی خاصی کم تھی مگر پھر بھی مجھے ایسا لگا جیسے میں ریکھا کے چہرے سے اور اس کی آنکھوں سے عیاں فکرمندی اور تاسف کے تاثر کو دیکھ سکتا ہوں۔ ریکھا کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی غیظ و غضب کی وہ آتشیں لہریں جو میرے وجود کے ہر حصے میں طوفان اٹھائے ہوئے تھیں اچانک نہ جانے کہاں معدوم ہو گئیں جیسے کسی نے غصے کے دہکتے ہوئے انگاروں پر گھڑوں پانی انڈیل دیا ہو۔

مجھے واقعی نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ اچانک میں نے سر جھٹک کر آہستہ سے کہا۔ ''تم صحیح کہہ رہی ہو، ہمیں جلد سے جلد یہاں سے دور جانا ہوگا، مگر کیسے؟ بہت دیر سے کوئی گاڑی بھی یہاں سے نہیں گزری۔''

''گاڑیاں تو ایک نہیں، دو آ رہی ہیں۔'' ریکھا نے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔ ''ایک تو بہت دور ہے ابھی، مگر دوسری گاڑی کافی قریب آ چکی ہے۔''

میں نے رخ پھیر کر اس طرف دیکھا جدھر ریکھا نے اشارہ کیا تھا دائیں طرف سے واقعی دو گاڑیاں آتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک تو اتنی دور تھی کہ اس کی ہیڈ لائٹس دو ننھے ستاروں کی طرح روشن تھیں۔

یہ گاڑیاں بھی اسی طرح غیر معمولی تیز رفتاری سے ہماری جانب آ رہی تھیں جیسے کچھ دیر پہلے اس جانب سے دشمنوں کی گاڑی آئی تھی۔ ''کیا اس میں بھی پیٹر کے ساتھی سوار ہیں؟'' میں نے تشویش سے سوچا۔

آن کی آن میں وہ گاڑی ہمارے بالکل قریب پہنچی، میں نے اونچی آواز میں ریکھا سے کہا۔ ''بندوق اپنے کندھے سے لگا لو اور اس کا رخ آنے والی گاڑی کی طرف رکھو، مجھے لگتا ہے یہ بھی ہمارے دشمنوں کی گاڑی ہے اپنی انگلی مضبوطی سے ٹریگر پر رکھنا اور جیسے ہی فائر کہوں، گولی چلا دینا مگر کوشش کرنا کہ سامنے والے کی ٹانگوں کو یا ہاتھ کو نشانہ بناؤ۔''

میری یہ بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ وہ تیز ہیڈ لائٹس ہم سے چند گز کے فاصلے پر آ کر ساکت ہو گئیں۔ میرے اعصاب تن گئے تھے۔ میں نے ریکھا کی طرف دیکھا وہ میری ہدایت کے مطابق بندوق ان ہیڈ لائٹس کی طرف تانے ہوئے تھی۔ میں نے بھی بندوق کو اپنے کندھے سے لگا لیا مگر اسی وقت تیز ہیڈ لائٹس کے پیچھے سے کسی نے چلا کر کہا۔ ''فائر مت کرنا، یہ ہم ہیں گلفام بھائی کے دوست۔''

یہ جانی پہچانی آواز تھی۔ کچھ دن پہلے رشیدہ کے گھر پر آنے والوں میں سے ایک کی تھی۔

میرے تنے ہوئے اعصاب پر جیسے طمانیت اور آسودگی کی ٹھنڈی پھوار سی پڑ گئی۔ میں نے بندوق کندھے سے ہٹائی اور ریکھا کو ساتھ آنے کا اشارہ کر دیا۔ ہم دونوں کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اندر والے گاڑی سے باہر آ چکے تھے۔

''ہمیں خبر ملنے میں دیر ہوئی۔ ابھی گلفام بھائی کو رپورٹ دے ہی رہے تھے کہ ایک آدمی نے آ کر خبر دی کہ آپ دونوں مغرب کی طرف گئے ہیں۔ ہم اُدھر پہنچنے کے لیے نکلے تھے کہ کچھ لوگوں نے ہمیں روک لیا اور اُن میں سے کچھ لوگ ایک بڑی جیپ میں سوار ہو کر اُدھر والی سڑک پر بھاگ اٹھے۔''

وہ اپنا جملہ پورا نہیں کر پایا تھا کہ اچانک اس کی نظر ہمارے پیچھے سڑک کے کنارے

کھڑی جیپ پر پڑی اور وہ شدید حیرت سے بولا۔ ''یہی...... یہی تو ہے وہ گاڑی مگر جو لوگ اس میں سوار تھے، وہ کہاں گئے اور...... اور یہ آپ دونوں کے پاس بندوقیں کہاں سے آ گئیں؟ یہ سب کیا ہے؟''

''اس گاڑی میں تین افراد سوار تھے۔'' میں نے پلٹ کر جیپ کی طرف دیکھتے ہوئے سکون سے کہا۔ ''ان میں سے ایک جس کا بازو ٹوٹ چکا ہے، جیپ کے اندر کسی چوہے کی طرح دبکا ہوا ہے جبکہ اس کے باقی دو ساتھی شدید زخمی بلکہ نیم مردہ حالت میں باہر پڑے ہیں اور یہ بندوقیں جو تم ہمارے ہاتھوں میں دیکھ رہے ہو، یہ بھی انہی کی ہیں۔''

''اوہ۔'' حیرت اور بے یقینی سے اس کی آنکھوں پھیل گئیں۔ ''لیکن یہ سب ہوا کیسے؟''

''یہ تفصیلات بعد میں پوچھتے رہنا، ابھی تو یہ بتاؤ کہ پروگرام کیا ہے؟'' میں نے اسی پُرسکون دھیمے انداز میں کہا۔

''پروگرام یہ ہے کہ ہمیں آپ سب کو لے کر کلکتہ روانہ ہونا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ گاڑی کے اگلے دروازے کی طرف بڑھا اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ دونوں جلدی سے گاڑی میں سوار ہو جائیں۔ ہمیں اب ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔''

''نہیں، ہمیں بچ جانا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہم پہنچا دیتے ہیں۔''

تبھی میرے دماغ میں شیرو کا کہا جملہ گونجا کہ پولیس ہماری تلاش میں ہے۔ میں نے کہا۔ ''ہم خود چلے جائیں گے۔ بس ہمیں اس سڑک پر اتار دو جہاں سے ٹریفک گزرتی ہے۔''

''آیئے۔ میں پچھلی سڑک پر اتار دیتا ہوں۔''

میں اور ریکھا یہ سنتے ہی تیزی سے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

دو موڑ مڑتے ہی اس نے جیپ روک دی۔ ''اس سڑک پر آپ کو پبلک ٹرانس پورٹ بھی مل جائے گی۔''

''بہت شکریہ!'' کہہ کر میں اتر گیا۔ ریکھا نے بھی تقلید کی۔ جیپ والا مڑ گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے ریکھا سے کہا۔ ''برقعہ پھر سے پہن لو تاکہ شناخت میں دشواری ہو۔ جلدی کوئی پہچان نہ سکے۔''

اس نے مڑے تڑے برقعہ کو پھر سے پہن لیا۔ میری نظریں سامنے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں کہ مجھے سامنے سے آتی ہوئی روشنی نظر آئی۔ وہ بھی ٹرک تھا۔ میں نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔

ریکھا برقع میں تھی، شاید اسی لیے اس نے ٹرک روک لیا تھا۔ اس نے کھڑکی سے گردن باہر نکال کر پوچھا۔ ''کہاں جانا ہے؟''

''بج بج۔'' مجھے یہی نام یاد تھا، اس لیے کہہ دیا۔

''ادھر کا دروازہ کھول کر اندر آ جاؤ۔'' ڈرائیور نے کہا۔

میں ڈرائیور کے برابر بیٹھا، میرے برابر ریکھا بیٹھ گئی، پچھلی طرف ایک اور نوجوان تھا، وہ شاید اس کا اسسٹنٹ تھا۔ ڈرائیور نے ٹرک آگے بڑھایا پھر پوچھا۔

''بج بج میں رہتے ہو مگر بنگالی تو نہیں لگتے؟''

''جی نہیں، میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں۔''

''اتنی رات میں اس ویرانے میں کیا کر رہے تھے؟''

''ٹیکسی خراب ہو گئی تھی۔ ڈرائیور اسے بنوانے لے گیا تو پھر لوٹ کر نہیں آیا۔''

''اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہوگا۔ سالے، ہم مسلمانوں سے نفرت بھی تو بہت کرتے ہیں۔'' اس کی باتوں سے میں نے سمجھ لیا کہ وہ بھی مسلمان ہے۔

''شاید ایسا ہی ہو۔ دو ڈھائی گھنٹے تو ہو ہی گئے ہوں گے۔''

''تمہارے ساتھ عورت ہے اسی لیے اس نے ایسا کیا ہوگا۔ خیر، بج بج سے کہیں آگے جانا ہے کیا؟''

''نہیں، بج بج جانا ہے۔''

''یہ تو اچھا ہوا، میں بھی بج بج جا رہا ہوں۔''

''تو پھر ہمیں لے جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''نہیں، نہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ ساتھ میں عورت ہے۔ ہر طرف دشمن ہیں۔ یہ ہندو کبھی کسی کے نہیں ہوتے۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' میں نے ریکھا کا جملہ دہرایا۔

''اب یہی دیکھ لو، دوسری سڑک پر خوامخواہ چیک پوسٹ بنائی ہے۔ ایک بے چارہ

مسلمان پھنس گیا۔ اسے پاکستانی ایجنٹ کہہ کر پکڑ لیا۔''

''اچھا، کیسا تھا وہ؟ کیا پیدل تھا؟''

''نہیں، مہندرا جیپ تھی اس کے پاس۔ ایک ڈرائیور بھی تھا۔ وہ ہندو تھا اس لیے اسے کچھ نہیں کہا اور اس بے چارے کی جم کر پٹائی کرنے لگے۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ شیرو ہوگا۔ اس نے ایسا کچھ کہہ دیا ہوگا جس کی وجہ سے وہ لوگ بپھر اٹھے۔ مجھے اس کی مدد کرنا چاہیے تھی مگر مجبور تھا اس لیے خاموش رہ گیا۔ راستہ طے ہوتا رہا۔ مجھے شیرو کی فکر کھائے جا رہی تھی کہ بے چارہ نہ جانے کس حال میں ہوگا؟ تبھی ڈرائیور نے ٹرک روک دیا۔

ٹرک رکنے سے میں پریشان ہوا تھا۔ ڈرائیور جلدی سے بولا۔ ''یہاں کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے۔ پی کر چلتے ہیں۔ کچھ آرام بھی مل جائے گا۔''

میں بھی نیچے اتر آیا۔ وہ ڈھابا تھا، کئی ٹرک کھڑے تھے۔ لوگ چائے پی رہے تھے۔ کچھ روٹی کھا رہے تھے۔ اونچی آواز میں گراموفون بج رہا تھا۔

چائے پی کر پھر سے سفر شروع ہو گیا۔ چکنی و ہموار سڑک پر ٹرک دوڑتا رہا۔

دو گھنٹے کا سفر طے کر کے ہم بج بج میں داخل ہوئے۔ اس نے ہمیں چوک میں اتار دیا۔ سامنے بہت سارے لوگ جا رہے تھے۔ میں نے جیب سے شیرو کا کارڈ نکالا اور اس پر لکھے پتے کے بارے میں ایک شخص سے پوچھا۔ اس نے کہا۔ ''شری مان، یہ علاقہ تو بہت دور ہے، آپ رکشا کر لیں۔''

سامنے ہی سائیکل رکشے کی قطار تھی۔ میں نے ایک رکشے والے سے پتا پوچھا۔ اس نے کرایہ دو روپیا مانگا۔ ہم رکشے میں سوار ہو گئے۔

مطلوبہ علاقے میں پہنچ کر مذکورہ گھر تلاش کیا۔ جس شخص کا شیرو نے نام دیا، وہ گھر پر ہی تھا۔ کارڈ دیکھ کر بولا۔ ''زہے نصیب کہ اس غربت کدہ کو آپ نے شرف قبولیت بخشا مگر شومئی قسمت کہ یہ ہیچ مدان سرِ دست لاچار ہے کہ اس گھر میں خوش دامن صاحبہ مع اپنی تین نورِ نظر تشریف فرما ہیں۔''

اتنی گاڑھی اُردو، مفہوم سمجھنے میں مجھے دانتوں پسینہ آ گیا۔ میں نے سمجھ تو لیا تھا پھر بھی استفسار کیا کہ کیا آپ کے سسرالی عزیز آئے ہوئے ہیں؟

"اجی جناب، کیسے عزیز، کہاں کے عزیز، سب کے سب میری بچت کو قرطاسِ ابیض بنانے آئے ہیں۔ اجی جناب، میری تنخواہ مبلغ بارہ صدروپے سکہ رائج الوقت اور یہ سب ہر روز دوصد کھائے جارہے ہیں۔ اب تو ان چشمِ اشک بار کی نمی بھی خشک ہو چکی ہے۔"

"مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔" میں نے ہنسی دبا کر کہا۔

"اگر ہمدردی ہے تو براہِ کرم نزدیک میں ایک عدد ہوٹل ہے جہاں صرف تین دن قیام و طعام کرلیں پھر میں خواہش کا اظہار کروں گا کہ میرے گھر میں قدم رنجہ فرمائیں۔"

دل میں آئی کہ میں اسے موٹی سی گالی دوں مگر اس کی معصومیت، بے چارگی پر ترس آ گیا اور میں نے پوچھا۔ "یہ ہوٹل ہے کہاں؟"

"سڑک پر قدم رکھیں گے کہ سمتِ مغرب بڑا سا نوشتہ ہوٹل نظر نواز ہو جائے گا۔"

"اچھا، اچھا۔" کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ریکھا کو بھی کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ ہونق بنی ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ باہر نکلتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ "کیا کوڈ ورڈ میں باتیں کررہے تھے؟"

"لگتا ہے، بگڑا شاعر ہے۔" میری آواز اس نے بھی سن لی تھی۔ جلدی سے بولا۔ "اجی جناب، خوب پہچانا، حقیر باتقصیر کو بیخود جلال پوری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شام میں آ کر آپ کو اپنے مرصع اشعار سناؤں گا۔"

"ارے، باپ رے، یہ سزا......" میں نے بڑبڑاتے ہوئے قدم تیز کر دیئے۔ سامنے ہی ڈیلکس ہوٹل کا بورڈ تھا۔ ہم ادھر ہی بڑھتے چلے گئے۔ بڑی آسانی سے کمرا مل گیا۔ میں نے اپنا نام آنند لکھایا اور ریکھا کو بیوی ظاہر کیا کہ یہ میری مجبوری تھی۔

کمرے میں پہنچتے ہی وہ امربیل بن گئی۔ خوشی سے لہک کر بولی۔ "ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں، اور چابی کھو جائے۔ بالآخر میرا یہ خواب پورا ہوا۔ اب ہم تم ہوں گے اور یہ کمرا ہوگا۔ آ...... کتنا مزہ آئے گا، کسی کا ڈر نہیں، کوئی خوف نہیں۔"

مگر میرے اندر تو خوف تھا، دشمنوں کا خوف، کلکتہ اور بج بج میں فاصلہ ہی کتنا ہے اسی لیے میں نے اسے جھٹکے سے الگ کیا مگر ابھی اصل مسئلہ باقی تھا۔ رات بھی تو آنی تھی۔

اس سے الگ ہو کر میں نے اس سے کہا۔ "جاؤ، جا کر نہالو۔"

وہ نہانے کے لیے واش روم میں داخل ہو گئی تب میں نے سامان پر نظر ڈالی کہ کہیں

کاؤنٹر پر نہ چھوڑ آئی ہو۔ ریکھا کا بھروسا نہ تھا، وہ سامان کو چھوڑ کر آ سکتی تھی۔

مگر سامان کے نام پر میرے پاس تھا ہی کیا، صرف ایک ہینڈ بیگ جو شیروا اپنے ساتھ لایا تھا۔ جسے میں نے لڑائی بھڑائی کے وقت بھی کندھے سے لٹکائے رکھا تھا۔ وہ بیگ میں نے بیخود کے گھر کے سامنے ریکھا کو تھمایا تھا۔ اسی میں روپے تھے۔ سنڈیکٹ والوں سے چھینے ہوئے روپے، بیگ مل جانے کی وجہ سے میں مطمئن تھا کہ اب کئی مہینے اس سے گزار سکتا تھا۔ میں نے اس میں ایک گڈی نکال لی مگر ریکھا کی نظر بچا کے، وہ کیسی طبیعت کی مالک ہے، میں جانتا تھا اسی لیے اس سے چھپا رہا تھا۔

ریکھا باتھ روم سے نہا کر آئی تو میں نہانے کے لیے داخل ہو گیا۔ پیر کا زخم مندمل نہیں ہوا تھا۔ اس میں پانی لگنا خطرناک تھا اس لیے بڑی احتیاط سے غسل کیا۔

نہا کر نکلا تو حیرت کا جھٹکا لگا۔ بیڈ پر نیا پینٹ اور شرٹ رکھا تھا۔ "یہ کہاں سے آیا؟"

"بھگوان اگر خوش ہو تو چھپر پھاڑ کر بھی دے سکتا ہے۔ یہی سمجھو کہ آسمان سے آیا۔ فی الحال تو اسے پہن لو۔"

"یار، بتا بھی دو۔" میں نے لگاوٹ بھرے انداز میں کہا۔

"سامنے ہی تو ریڈی میڈ گارمنٹس شاپ ہے۔ تم باتھ روم میں گئے اور میں باہر۔ اب تم پوچھو گے پیسے کہاں سے آئے؟ تو وہ میں نے تمہاری جیب سے نکالے۔ اپنے لیے یہ کانجی ورم ساڑی لی ہے۔ پورے تین سو کی ہے۔ ابھی پہنوں گی تو دیکھنا کیسی سجتی ہے۔"

آگ بھڑکنے سے پہلے دور ہٹ جانا عقل مندی ہے۔ میں ریکھا کی فطرت سمجھ چکا تھا۔ وہ مجھے فتح کرنے کے لیے میرے سامنے ہی ساڑی پہننا شروع کردے گی، اسی ڈر سے میں جلدی سے باتھ روم میں گھس گیا اور کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ کپڑے بدل کر باہر آیا تو ریکھا نے بھی ساڑی بدل لی تھی۔ واقعی سنہرے بارڈر اور بمو کلر کی ساڑی میں وہ قتالہ دکھ رہی تھی۔ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے تعریف کردی۔ بس یہی ایک غلطی ہو گئی تھی۔ وہ آپے سے باہر ہونے لگی۔ سرخ دھبے میرے گالوں پر بنتے کہ میں جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔

"جمائی دا! یہ آپ اتنے پارسا کیوں بن رہے ہیں؟ کہاں تو میرے بغیر ایک پل بھی آپ کو کاٹنا دشوار لگتا تھا، اور کہاں یہ حالت ہے کہ مجھ سے ایسے بھاگ رہے ہیں جیسے مجھے کوڑھ ہے؟" وہ جھلا کر بولی۔

"پیار جتانے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ تم خوامخواہ شام خراب کر رہی ہو۔"

"اچھا، اچھا، رات کو...... ہاں، یہ بہتر ہے۔"

میں ابھی باہر نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اجنبی شہر، دشمنوں کی سرزمین اس پر طرہ کہ ساتھ میں ایک چلتی پھرتی "دھماکہ" میں بری طرح چونک گیا۔

"یہ کون مرنے آ گیا؟" ریکھا نے ناگوار لہجے میں کہا۔

کہیں پولیس نہ ہو، عام طور سے مجرم سمجھتا ہے کہ اس نے پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک دی مگر یہ غلط ہے۔ پولیس کو دھوکا دینا آسان نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے، کوئی مخبر پیچھے آ گیا ہو، اسی خیال نے پریشان کر دیا تھا۔ کیا کروں، ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ دوبارہ دستک ہوئی۔

ریکھا نے بلند آواز میں پوچھا۔ "کون......؟"

"اجی جناب، سائل کو بیخود کہتے ہیں۔"

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اندر آتے ہی وہ بولا۔ "حضرت کی خدمت میں سَلام! احقر نے خیال کو مہمیز کیا تو ندائے غیبی کا اشارہ ہوا، آپ تھکے ہوئے ہوں گے، سومع کلامِ بے بدل حاضرِ خدمت ہوا۔ یقیناً تفنن کی خاطر آپ محظوظ ہوں گے۔"

جلِ جلال تُو، آئی بلا کو ٹال تُو صاحبِ کمال تُو کا وِرد کرنے لگا کہ اب اس کے اشعار بھی ہضم کرنے ہوں گے پھر بھی اخلاقاً کہنا پڑا۔ "ضرور، ضرور۔"

اتنا کہنا ہی کافی تھا۔ وہ کمرے کے اکلوتے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ریکھا ہونق بنی اسے دیکھ رہی تھی مگر اسے تو کسی طرف دیکھنے کا خیال ہی نہ تھا۔ کرتے کی جیب سے اس نے کاغذ نکالا اور بولا۔ "یہ جو ابھی ابھی ایک بائس کوپ آئی ہے، اسی کے ایک شعر کو تضمین کیا ہے۔" پھر لہک لہک کر پڑھنے نہیں، گانے لگا۔

"کپڑے بھی پہناتا ہوں، اور پہناتا ہوں گہنا
قبضے میں کسی طرح سے آتی نہیں مینا
اس پر یہ ہر روز ہے میری بیوی کا کہنا
میں میکے چلی جاؤں گی، تم دیکھتے رہنا"

"واہ جناب، بہت خوب، کیا کہنا ہے۔"

اس نے فرشی سَلام کیا پھر پرانے راگ پر آ گیا۔

"اس بار جو کلکتے سے رس گلہ نہ لائے
کر دوں گی تمہیں پتلا، خالی ہاتھ جو آئے
فرقت کا الم تم کو اکیلے ہی ہے سہنا
میں میکے چلی جاؤں گی، تم دیکھتے رہنا"

مجبوری میں مجھے پھر کہنا پڑا۔ "واہ، کیا خوب کہا۔" میرا اتنا کہنا ہی غضب ہو گیا۔ ایک کے بعد ایک ہزل سناتا چلا گیا۔ چھٹی، ساتویں، ہزل پر میں نے کہا۔ "تھوڑا سا رکیں، اسی بحر میں، میں نے بھی کچھ اشعار کہے ہیں۔ ملاحظہ کریں۔"

اس نے فوراً کاغذ جیب میں رکھا پھر بولا۔ "اجی جناب، مجھے عارضۂ نسیان ہے، پل دو پل میں بھول جاتا ہوں۔ بیگم کا ارشاد تھا، جانبِ بازار مراجعت کرو اور قراقلی گوبھی و شملہ مرچ خرید کر سیدھے گھر آؤ۔"

"محترم بیخود، آپ پر بے خودی چھا رہی ہے۔ آپ کافی حظ اٹھائیں گے۔ عشق سے بھرپور مرصع غزل ہے۔"

"عشق تم کیا جانو، یہ وہ راہِ پُرخار ہے کہ آبلہ پائی نکتۂ ضروری ہے۔"

"شاید آپ اس راہ سے گزر چکے ہیں؟"

"میاں بھائی، میں نے اسی لیے تو شاعری شروع کی۔" وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا اور وہ مصنوعی لہجہ بھی غائب ہو گیا۔ عام سے انداز میں کہنے لگا۔ "یہ تب کی بات ہے جبکہ عاشق جوان ہوا کرتا تھا۔ ان دنوں میں کلاس ٹینتھ میں پڑھ رہا تھا۔ ہم لوگ زکریا اسٹریٹ کی چونا گلی میں رہا کرتے تھے۔ اسی گلی میں میرے گھر کے بالکل سامنے ایک حسینۂ دلنواز رہا کرتی تھی۔ میرا دل اس پر آ گیا، دل لگا تو راہ پیدا کرنے کی چاہ پیدا کی۔ اس سے ملنے کی راہ عجب ڈھونڈی۔ آپ نے چونا گلی کی گلیوں کو دیکھا ہوگا، پتلی پتلی گلیاں، اونچے اونچے مکانات۔ اپنے گھر کی کھڑکی سے سیدھے محبوبۂ دلنواز کے کمرے میں پہنچنے کے لیے دو دس ہاتھ کا رسہ خریدا اور اسے اپنی کھڑکی سے اس کی کھڑکی تک آنکسی کے ذریعہ پھنسا دیتا۔ اس رسے پر سرکس کے مداری کی طرح اوپر والے رسے کو پکڑ کر نیچے والے رسے پر چلتا ہوا اس کے کمرے تک پہنچ جاتا۔ یہ سلسلہ فقط ایک ہفتے چلا۔ فجر کے ذرا پہلے اٹھتا۔ اپنی کھڑکی سے اس کی کھڑکی تک پہنچتا۔ اسے بیدار کرتا اور پھر ہم ہوتے، جھومتا موسم ہوتا مگر ایک دن حرامی وقت ہمارا رقیب بن گیا۔ جیسے ہی

اذان کی آواز گونجی، میں اس کی کھڑکی سے اپنی کھڑکی میں آنے کے لیے رسے پر چڑھا۔ قسمت کی خرابی، رسہ ہلا اور میں اپنے ہونے والے سسر کے سر پر جا گرا۔ وہ مسجد جانے کی بجائے اسپتال پہنچ گئے۔ ان کی دوا اور میری ایک پسلی مع داہنی ٹانگ ٹوٹی۔ اسپتال سے لوٹا تو محبوبہ کے بھائیوں نے مزید ایک پسلی توڑ کر حساب برابر کر دیا۔ انہوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر محلہ نہ چھوڑا تو مجھے دنیا چھوڑنا پڑے گی۔ بس جناب، میں وہاں سے خالی کاسۂ محبت ہاتھ میں تھامے پارک سرکس آ گیا۔ دو سال تک وہاں رہا اور کوشش جاری رکھی۔ نتیجتاً آج میری محبوبہ دلنواز میرے چھ بچوں کی اماں ہے۔"

"واہ جناب، گویا آپ شہسوارِ میدانِ عشق ٹھہرے۔ واہ......" میں نے تعریف کی تو وہ فرشی سلام بجا لائے۔ ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ کمرے کے بند دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے پوچھا "کون......؟"

"پولیس......" باہر سے آواز آئی۔

دستک کی آواز پر ہم تینوں چونک گئے۔ لفظ 'پولیس' اچھے اچھوں کے اوسان خطا کرنے کو کافی ہے۔ ہم تو یوں بھی مجرم تھے، یہاں کے قانون کے مجرم، فارن ایکٹ کے مجرم، غیر قانونی طور پر دراندازی کے مجرم پھر ابو میاں کے ایک ساتھی کے قاتل بھی بن چکے تھے اسی لیے کچھ زیادہ ہی گھبرا گئے۔ ریکھا کا ملیح چہرہ ایک پل میں کمہلا گیا۔ بیخود کی رنگت بھی زرد پڑ گئی۔ کسی میں حوصلہ نہ تھا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھتا، آگے بڑھ کر دروازہ کھولتا کہ پھر ایک بار دستک ہوئی۔ اس بار کی دستک میں غصہ بھی شامل تھا۔ باہر سے دروازہ پیٹا گیا تھا۔ اتنی زور سے دروازہ بجا تھا جیسے لات پڑی ہو۔ اندازہ ہو گیا کہ اب بھی دروازہ نہ کھلا تو وہ توڑ دیں گے اسی لیے میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے تین کانسٹیبل اور ایک ایس آئی کھڑا تھا۔ رعونت جو پولیس والوں کا خاصہ ہے، وہ ان سب کے چہروں سے چھلک رہی تھی۔ ایسے موقع پر برصغیر کے لوگوں کی دکھتی رگ دبائی جاتی ہے اس لیے میں نے اردو کی بجائے انگریزی کا سہارا لیا کیونکہ انگریز چلے گئے، ہندو پاک آزاد ہو گیا مگر ذہنیت ہنوز غلام ہے۔ انگریزی کا استعمال جادو اثر ثابت ہوتا ہے۔ میں نے کانونٹ اسٹائل میں کہا۔ "Yes Officer, Can I help you?"

انگریزوں کے انداز میں انگریزی سنتے ہی ایس آئی کا تنا ہوا چہرہ مرجھا گیا۔ اس نے

مسکرانے کی ناکام کوشش کی اور وہ ایسی انگریزی میں بولا کہ شیکسپیئر سے ورڈزورتھ تک کی روحیں پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنس رہی ہوں گی۔

اس نے کہا تھا۔

"No Sir, we listen that some ...... stey here. Thanks!

اس کی نظریں ریکھا پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "I am from Jalpaigori. she is my wife Rekha!" پھر بیخود کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "Mr.Bekhod, my best pal, a.....person."

ایس آئی نے بیخود کی طرف دیکھا پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر بولا۔ "Sorry Sir!" اور دروازے سے ہی دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے دروازہ بند کیا اور مڑا۔ بیخود خاموش بیٹھا تھا مگر دروازہ بند ہوتے ہی اس پر پھر پرانی کیفیت عود کر آئی، گویا تھیلی سے باہر آ گیا۔ لگا ہانکنے۔ "اجی جناب، میں منتظر پیش قدمی تھا۔ بندہ بے دام کی رفاقت حاملِ منصبِ اعلیٰ عہدہ داران سے ہے۔ گرچہ لہجہ شستہ و عمل شرفاء ایسا مگر تھے تو محکمۂ پولیس کے۔ ان کی قسمت کہ قدم افزائی نہ کی ورنہ ہیچمدان عرضی افسرانِ بالا عرض گزاشت ہو جاتا کہ یہ کیا ہے؟ بغیر تفتیش کیوں آ گئے؟"

"بس، بس جناب، رہنے دیں، غریب ہیں، چند روپلی کی نوکری کرتے ہیں۔ آپ کی مداخلت انہیں نوکری سے فارغ کرا دیتی۔" میں نے مسکراہٹ دبا کر کہا۔

"آپ کی گزارش ملحوظِ خاطر ورنہ خاکسار عرضی بحضور افسرانِ بالا پیش کر چکا ہوتا۔"

"جی ہاں، جی ہاں۔" میں نے اس طرح سر ہلا کر کہا جیسے واقعی اس کی لاف وگزاف پر یقین ہو۔

"آپ گرچہ فہم و دانش کے پیکر ہیں لیکن قسمت کا کیا کہیے، کبھی ضرورت محسوس کریں تو بلا جھجک......"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔" میں نے دل رکھنے کو کہا۔

"ویسے جنابِ من......! زبانِ ولایتی میں خوب دسترس ہے۔ تعلیم کا عالم کیا ہے؟ کہاں تک حاصل کی؟"

"بس واجبی سی تعلیم حاصل کی۔ دوستوں کی صحبت کا اثر ہے کہ انگریزی بولنے لگا۔"

"بھئی، یہ دوست بھی افلاکِ جہاں کے اختر ہیں۔ میرے دادا کے ایک دوست بچپن میں لندن کوچ کر گئے۔ نامِ نامی شیخ پیر تھا۔ گوری چمڑی کا اثر، صحبت کا باز بچہ، اچھے لوگوں سے مل بیٹھیں، وہ ان کے اتنا قریب ہوئے کہ فرنگی بھی انہیں انگریز کہنے لگے۔ ولایتیوں کی تو زبان میں زخم ہے، اینٹھی ہوئی زبان ہے۔ وہ شیخ پیر کو شیکسپیئر، کہنے لگے اور شیخ پیر ادب میں نام پیدا کرتا چلا گیا۔ اب تو اس نام کی شہرت کا یہ عالم ہے کہ ہم بھی شیخ پیر کو شیکسپیئر، کہتے ہیں۔"

"جی ہاں، جی ہاں۔" میں نے سر ہلا کر کہا۔ "انگریز نام کا عجب حال کرتے ہیں۔ میری نانی کی ایک سہیلی تھیں عالیہ زیب۔ لندن گئیں تو ان کی خوب صورتی پر وہاں کا بادشاہ مر مٹا۔ اس نے شادی کا پیغام دیا اور زبردستی شادی بھی کر لی۔ وہ ٹھہرا انگریز، اس کے منہ سے عالیہ زیب خاک نکلتا، بس اس نے ایلی زیب اِتھ کہنا شروع کر دیا اور وہ یوں ایلزبتھ مشہور ہو گئیں۔ بڑی معرکتہ آلاراء خاتون تھیں۔ شاید آپ نے بھی یہ نام سنا ہو گا؟"

"ارے واہ، تو گویا ایلزبتھ بھی اپنی ہندوستانی ہے۔"

"جی ہاں، جی ہاں۔" میں نے سنجیدہ انداز میں جھوٹ بولا، پہاڑ جتنا بڑا جھوٹ۔

"اجی جناب......! خاکسار تو آپ کا خاکِ پا ٹھہرا۔"

بیخود کی سنجیدگی میں رتی بھر فرق نہ آیا۔

اس بحث کے دوران میں نے غور کیا تھا کہ ریکھا اکتائی اکتائی سی تھی۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ اب تب میں پھٹ پڑے گی۔ کہیں وہ بےخود کی بےعزتی نہ کر دے، اس خیال سے میں نے کہا۔ "بیخود صاحب، میں ذرا ٹہلنے کے لیے نکلنے کی سوچ رہا ہوں۔"

"اجی جناب، لعنت صد ہزار...... یہ بج بج بھی کوئی ٹہلنے کی جگہ ہے، باتوں کا لطف لیں کہ یہی ہے زیست کا حاصل۔"

"نہیں جناب، میری بیگم کے چہرے پر اکتاہٹ آنے والی ہے۔"

بیخود نے ریکھا کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ غصے کو پی رہی تھی۔

بیخود کے چہرے پر بھی ناپسندیدگی کے آثار آ گئے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی میں نے کہا۔ "چلو، باہر کا ایک چکر لگا آئیں۔"

"باہر جائے میری جوتی، پورے دو گھنٹے کھا گیا حرام خور...... میں نے تو سوچا تھا، ہم تم ہوں گے، کمرا ہو گا، رقص میں سارا بستر ہو گا مگر یہ چھوکن پتا نہیں کہاں سے آ گیا؟"

اس کے انداز پر میں اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ میرے مسکرانے پر اس کا غصہ مزید تیز ہو گیا۔ وہ تیز لہجے میں بولا۔ "وہ چمرچٹا چٹ نہیں گیا تھا۔" پھر وہ منہ ٹیڑھا کر کے بولی۔ "شیکسپیئر تو یہیں کا تھا، پھینکو کہیں کا۔"

"میں تمہارے لہجے پر ہنسا۔ ایسے ایسے الفاظ بول رہی تھیں کہ ڈکشنری میں ڈھونڈ کر نہ ملے۔ یہ چھوکن، چمرچٹا کیا ہوتا ہے؟"

"چھوکن اور چمرچٹا اس پسو کو کہتے ہیں جو کتے کی گردن سے چمٹا ہوتا ہے۔" وہ جھلاہٹ بھرے لہجے میں بولی۔

"جیسے تم......" میں نے دھیرے سے کہا۔

"کیا بولے؟" وہ کھڑی ہو گئی۔

"میں اس عجوبے لفظ کو یاد کر رہا تھا۔ خیر، چھوڑو، یہ بتاؤ، تم جو میرے اتنے قریب آ رہی ہو، یہ شولیکھا سے غداری نہیں ہے؟"

"ہنہ...... غداری...... یاد ہے، بچی کے وقت جب ڈیڈی اسپتال میں تھی تو تم ہی نے کہا تھا کہ کاش میں تمہیں پہلے دیکھ لیتا تو ڈیڈی کو ریجیکٹ کر کے تمہیں دلہن بنا لاتا۔ اب ڈیڈی رہی نہیں، گویا تمہاری دعا قبول ہوئی اور میں تمہاری دسترس میں آ گئی۔ لو، بھگتو۔" کہہ کر وہ مجھ پر لد جانے کے لیے آگے بڑھی تھی کہ میں پیچھے ہٹ گیا۔

"اے ہے، معصوم ابن معصوم، یہ بھول گئے کہ تم میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد ہو اور لڑکی اسے کبھی نہیں بھولتی جس نے اسے عورت کے درجے پر پہنچایا ہو۔"

میں نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی۔ شکل کے ساتھ آنند کے کالے کرتوت کے الزامات بھی میرے حصے میں آ رہے تھے۔ اس پر ریکھا کی بےحیائی جو مجھے پانی پانی کیے دے رہی تھی۔ عورت کا زیور اس کی حیا ہے اور بغیر زیور کے عورت بغیر روپ کی لگتی ہے۔ نظریں ادھر جانے پر تیار ہی نہیں ہوتیں۔ اس بےحیا سے پیچھا چھڑاؤں تو کیسے؟ میں اسی پر غور کر رہا تھا۔ یوں بھی عورت مجسم خطرہ ہوتی ہے۔ یہ تو باہری خطرے کے ساتھ میرے کردار کے لیے بھی خطرہ ہے۔ اس خطرے سے منہ چھپانے کے لیے میں باہر کی جانب بڑھا۔

"اے، کہاں چلے؟ ٹھہرو، میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ بھیڑ بھرے بازار میں تمہارے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلنا مجھے بہت اچھا لگے گا۔"

"کچھ دیر اور آرام کرلو، رات میں ٹہلنے نکلیں گے۔ ابھی تو میں ذرا بیجنود کے گھر تک جارہا ہوں۔ اسے ایک بات بتانا بھول گیا تھا۔"

"چلو، میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں دیکھتے ہی اس پر رومانیت طاری ہو جائے اور وہ باقی کی غزلیں سنانے بیٹھ جائے۔"

"او بابا، رے بابا، یہ خطرہ تو ہے، واقعی وہ شعر سنانے لگا تو میں کیا کروں گی، یہ سزا اتنی آسان نہیں ہے۔ حکومت ہند کو چاہیے کہ ہر مجرم کے سامنے ایک شاعر کو بٹھا دے جو اسے دن بھر شعر سناتا رہے۔ مجھے یقین ہے، لوگ جرم کرنا بھول جائیں گے۔"

"اس سزا سے بچنے کا ایک آسان طریقہ ہے، ہوٹل والوں نے کمرے میں ٹی وی کی سہولت دی ہے۔ تم اس سے استفادہ کرو۔ صرف دس پندرہ منٹ کی بات ہے، اتنی دیر میں، میں آ جاؤں گا پھر ہم تم ہوں گے، کمرا ہوگا، رقص میں سارے ارماں ہوں گے" کہتا ہوا میں باہر نکل گیا۔

ابھی میں کاریڈور میں تھا کہ سامنے سے آتا ہوا ایک نوجوان نظر آیا۔ بیس بائیس سال کی عمر ہوگی۔ اس نے نیلی پینٹ اور سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ جب وہ میرے قریب پہنچا تو ایسے ٹھٹک گیا جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں، کچھ دیر تک میرا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی نظریں مجھے آر پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ کہتے ہیں، چور کی داڑھی میں تنکا۔ پولیس کے خوف سے بھاگ رہا تھا۔ اگر پولیس کے ہتھے چڑھتا تو اگلے پچھلے تمام ریکارڈ سامنے آ جاتے، تمام ایجنسیاں حساب لینے آ جاتیں کیونکہ میرے نام کے ساتھ ابو میاں کے ساتھی کا قتل بھی جڑا ہوا تھا۔ گویا میرے لیے قدم قدم پر خطرہ تھا اسی لیے دل کی دھڑکن بھی بڑھ گئی تھی۔ کہیں یہ میرے تعاقب میں تو نہیں آیا؟ ابھی میں کچھ بولتا کہ وہ بولا۔ "دادا، آپ وہی ہیں ناں جس نے شیام بازار میں گنیش کی پٹائی کی تھی؟"

"میں نے تمہیں پہچانا نہیں؟" جواب دینے کی بجائے میں نے سوال کر دیا۔

"اوہو، تو آپ وہی ہیں، واہ، واہ، ہماری قسمت۔ میں تو کب سے آپ کو کھوج رہا ہوں۔ بابا رے، بابا، کیسا اچھل اچھل کر لاتھی (لات) مارتا تھا۔ گنیش کو لاتھی مارا، او ہو ہو......"

اس کی بات پر کچھ اطمینان ہوا۔ گپت کے پروردہ غنڈے گنیش کی پٹائی میں نے بھرے

بازار میں کی تھی۔ پچاسوں افراد نے دیکھی تھی۔ انہی میں یہ بھی ہوگا۔ بہادر کی بہادری تسلیم کرنا ہر کمزور کی فطرت ہے اسی لیے میرے دل کی دھڑکن معمول پر آ گئی تھی۔ میں نے ہنس کر کہا۔

"گویا آپ وہاں پر موجود تھے؟"

"جی ہاں، آمی (میں) موجود تھا۔ آپ بہوت (بہت) طاکوت (طاقت) والا ہے۔ ہم کو بھی کچھ سکھاؤ ناں؟"

"لیکن میں تو یہاں ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ کام ہوتے ہی لوٹ جاؤں گا۔"

"آمی بھی آج رات لوٹے گا۔ کولکتہ جائے گا۔"

"کیا آپ یہاں کے نہیں ہیں؟" میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ ٹریننگ کے دوران انسٹرکٹر نے کہا تھا۔ "یاد رکھنا، اگر دشمن کے علاقے میں ہو تو معمولی سے پتھر کو بھی دشمن سمجھو۔ ہو سکتا ہے، وہ پتھر بارودی سرنگ ثابت ہو۔ یہ نوجوان میرے لیے اجنبی تھا اور زبردستی جان پہچان پیدا کر رہا تھا اور یہاں کا بھی نہیں تھا۔

"او بابا، امی تو آپنار (آپ کا) نام پوچھائیں؟ کا نام ہے؟ آمار نام راکیش بشواس ہے۔ آمی ہمالیہ ڈرگ کمپنی کا سیلز ایجنٹ ہے۔"

میں نے اپنی شخصیت سے پردہ اٹھانا مناسب نہیں سمجھا اس لیے بولا۔ "میرا نام آنند ہے، میں چائے کا تھوک بیوپاری ہوں۔ سلی گوڑی سے آیا ہوں۔"

"آچھا، آچھا، یہ میرا کارڈ ہے۔ اس پر فون نمبر ہے۔ آپ کولکتہ آؤ تو ہم سے ملو۔" اس نے کارڈ دیا پھر بولا۔ "دادا بابو، ہم سے ملاقات جرور کورو۔" کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

پتا نہیں کیوں وہ مجھے مشتبہ لگا تھا، شاید اس لیے کہ اس نے زبردستی جان پہچان پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ خیر، جو ہوگا، دیکھا جائے گا، کہہ کر میں نے ذہن سے سوچ کی یلغار کو جھٹک دیا اور واپس کمرے کی جانب چل پڑا۔ باہر جانے کا خیال میں نے ترک کر دیا تھا۔ کمرے میں ریکھا نامی بارود کا ڈھیر تھی، وہ ذہن کو بھٹکائے رکھتی پھر بھی میں نے سوچ لیا تھا کہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش رہنے کی تاکید کر دوں گا۔ میں یہاں آیا تھا شیرو کے کہنے پر اور اب وہ خود مصیبت میں تھا اس لیے یہاں ٹھہرنا فضول تھا۔ ابھی اتنے پیسے تھے کہ میں آگے کہیں جا سکتا تھا جہاں سے مجھے وطن لوٹنے کا راستہ مل جاتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شیرو کی وجہ سے میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں۔ پولیس والے جب کسی کو گھیرتے ہیں تو اپنی طرف سے بھی بہت سے کیس لاد دیتے ہیں۔ معمولی

جیب کترے پر شہر بھر میں ہوئی ڈکیتی، رہزنی، اغوا، قتل سب تھوپ دیتے ہیں تاکہ افسران اور عوام کی نظروں میں سرخرو ہو سکیں۔ پولیس تشدد کی ماہر ہوتی ہے، مار مار کر بکری سے قبول کرا لیتی ہے کہ وہ شیر ہے اور بکری قبول بھی کر لیتی ہے اس لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی ہونے سے پہلے مجھے یہاں سے نکل لینا چاہیے۔ میں یہی کچھ سوچتا ہوا کمرے کے دروازے پر پہنچا، دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی تو وہ کھل گیا۔ ریکھا شاید سونے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ اس کے گال پر تکیے کا نشان تھا۔ خوب گورے چہرے پر نشان جلدی نظر آ جاتا ہے۔

"کیا ہوا، بڑی جلدی لوٹ آئے؟ میں تو سمجھ رہی تھی، گھنٹے، دو گھنٹے میں لوٹو گے اسی لیے سونے کے لیے لیٹ گئی کیونکہ رات میں تو تم سونے نہیں دو گے۔"

"تیری سوچ پر لعنت...... میں نے دل ہی دل میں کہا پھر واش روم میں چلا گیا۔ مجھے اس بات کی بھی فکر تھی کہ رات میں یہ ضرور کوئی گل کھلائے گی۔

میرا اندازہ غلط نہیں تھا، جیسے ہی میں واش روم سے نکلا، وہ حد سے زیادہ خطرناک انداز میں میرے قریب آ گئی۔ اس سے پہلے بھی وہ میرے قریب آئی تھی، اتنے قریب کہ میں خوف سے پیچھے ہٹ گیا تھا مگر اس بار وہ ایسے انداز میں تھی کہ میں ہل کر رہ گیا۔ اس کے بدن کی مہکار پاگل بنانے کو کافی تھی کہ اس انداز نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور میں نے گھبرا کر پیچھے ہٹتے ہوئے اس کے ہاتھ کو تھام لیا اور جلدی سے بولا۔ "ابھی تو شام بھی گہری نہیں ہوئی ہے۔ پلیز، مجھے دو ایک کام کر لینے دو۔"

اس کے ارمانوں پر اوس ضرور پڑ گئی مگر کچھ مطمئن بھی نظر آئی اور خود ہی تولیہ لے کر واش روم کے کھلے دروازے میں داخل ہو گئی۔ میں ٹہلتے ہوئے کھڑکی کی طرف بڑھ گیا تاکہ تازہ ہوا میں سانس درست کر سکوں۔

باہر زندگی جواں تھی۔ سڑک پر گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ لوگوں کا اژدھام تھا۔

ریکھا ایک قصبہ نما شہر کی تھی مگر مطالعے کے شوق نے اس کی ذہنی سطح بلند کر دی تھی۔ کپڑوں کے انتخاب، محفل میں شمولیت، گفتگو کا انداز سب میں انفرادیت تھی۔ صرف ایک نکتے پر آ کر اوچھا پن ظاہر ہو جاتا تھا مگر میں اسے بے شرمی کا نام نہیں دے سکتا۔ سنسکرت کی قدیم کتابوں میں عورت کی چار اقسام کا ذکر ہے۔ پدمنی، سنکھنی، اشونی، ہستنی۔ سب سے بہترین کردار میں اعلیٰ پدمنی کو قرار دیا گیا ہے جبکہ ہستنی انتہائی نچلے درجے کی قرار پائی ہے۔ مجھے لگنے لگا

تھا کہ ریکھا بھی ہستنی ہے۔ اس کا کردار بھی چیخ چیخ کر یہی کہہ رہا تھا۔ ہمارے جیسے شخص کے لیے وہ چیلنج تھی اس لیے اس سے دور رہنا ہمارے حق میں بہتر تھا مگر کیا کریں کہ وہ پیر تسمہ پا بن چکی تھی۔ اس دنیا میں اس کا کوئی بچا نہیں کہ وہاں چھوڑ آئیں۔ اس کا کیا کریں، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے، نہ بیٹھتے ہو اور نہ کچھ بولتے ہو، کس خیال میں ڈوبے ہو؟" ریکھا کی آواز پر میں چونک گیا۔

وہ نہا کر نکلی تھی۔ کھلے بالوں کو اس نے تولیے میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس عالم میں بھی وہ جذبات میں تلاطم پیدا کر رہی تھی۔ میں نے نظریں چرا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیسی ہے یہ زندگی، کسی پل چین لینے نہیں دیتی۔"

"انسان جب تک زندہ ہے، الجھنیں اس کی ساتھی رہیں گی۔" ریکھا نے کسی فلاسفر کی طرح اظہار خیال کیا۔

میں نے جواب دینے سے گریز کیا اور ٹہلتے ہوئے عقبی کھڑکی تک پہنچا۔ سڑک پر گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ میں اس طرف کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ لوگ دکانوں کے آگے کھڑے ہوئے بھی تھے مگر میری نظر ایک نوجوان پر ٹھہر گئی۔ وہ اسی کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس سے کچھ دیر پہلے ہوٹل کے کاریڈور میں ملاقات ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں کھڑکی سے ہٹ گیا۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ہر موقع پر قسمت ان کا ساتھ دیتی ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ میرے ساتھ تھا۔ میں خطرے میں پور پور ڈوب جاتا تھا اور قسمت مجھے نکال لیتی تھی۔ ایسے انداز میں مدد مل جاتی تھی جس کی امید بھی نہ ہوتی تھی۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ میں ٹہلتے ہوئے کھڑکی تک آیا تھا اور میری نظر اس نوجوان پر پڑ گئی تھی۔ اس کے دیکھنے کا انداز مشکوک تھا اسی لیے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی کہ یقیناً وہ نگرانی کر رہا ہے۔ گویا میں پہچان لیا گیا ہوں۔ اب سوال یہ تھا کہ نوجوان کا تعلق کس سے ہے؟ پولیس سے یا وکٹر کے گروہ سے؟ اس وقت تو یہی دونوں میری تاک میں ہیں۔ ابھی میں اس پر غور ہی کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔ "کون؟"

"بیرا سر، چائے لایا ہوں۔"

چائے کی طلب مجھے بھی تھی، یقیناً ریکھا کو بھی، اسی لیے اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے بیرا نہ تھا، دونو جوان تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول تھا۔

وہ دونوں تیزی سے اندر آئے تھے۔ اندر آتے ہی خالی ہاتھ والے نے دروازہ بند کیا تھا۔ پستول والے نے میرا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اے، دونوں ہاتھ اوپر، کوئی چالاکی نہیں۔ چالاکی دکھائی تو ساری گولیاں کھوپڑی میں اتر جائیں گی۔''

میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔ میری نظریں اس کے پستول پر ٹکی تھیں اور میں موقع کا منتظر تھا۔ اگر چاقو ہوتا تو میں بے دریغ چھلانگ لگا دیتا مگر پستول کے سامنے ہاتھ پیر چلانا بے وقوفی تھی۔

''آپ...... آپ کون ہو؟'' ریکھا نے سہمی سہمی آواز میں پوچھا۔

''ہم یم دوت (ملک الموت) ہیں۔ تمہارا پتی بڑا بہادر بنتا ہے ناں، اب دیکھنا ہے، ہم سے بھاگ کر کہاں جاتا ہے؟''

''آپ...... آپ کی ان سے کیا دشمنی ہے؟'' ریکھا نے پھر سوال کیا۔

''یہاں نہیں، باہر چل کر بتاؤں گا کہ اس سے ہماری کیا دشمنی ہے۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ کمرا بند کر کے سو جانا۔'' پھر وہ قدم بہ قدم چلتا ہوا میرے قریب آیا پھر وہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ میں کچھ سمجھ ہی نہ سکا۔ وہ دو تین میرا کیا بگاڑ لیں گے، میں نے یہی سوچا تھا۔ میری یہی سوچ دغا دے گئی تھی اور کامیابی نے اس کے قدم چوم لیے تھے۔ اس نے باتوں کے درمیان بایاں ہاتھ جیب میں ڈال لیا تھا پھر اس نے نہایت پھرتی سے ہاتھ جیب سے باہر نکالا تھا۔ اس ہاتھ میں لہراتا رومال نظر آیا تھا۔ اس نے وہ رومال میری ناک پر جما دیا تھا۔ میں نے سانس روکنے کی کوشش کی تھی مگر رومال میں لگی دوا سریع الاثر تھی۔ میرا ذہن سن ہو کر رہ گیا تھا۔ پل بھر میں ہوش نے ساتھ چھوڑ دیا تھا اور میں لہراتا ہوا اس کے ہاتھوں پر جھول گیا تھا۔ بعد میں پتا چلا تھا کہ اس کے دو ساتھی کمرے سے باہر تھے۔ وہ اسٹریچر لے آئے تھے اور مجھے اسٹریچر پر لٹا کر ہوٹل سے باہر لائے تھے۔ باہر ایمبولینس کھڑی تھی۔ اس میں ڈال کر لے گئے تھے۔

☆======☆======☆

مجھے ہوش آیا تو فوری طور پر مجھے احساس ہی نہ ہوا کہ میں کہاں ہوں؟ چند لمحے خالی خالی آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھتا رہا پھر میں سوچنے لگا کہ مجھ پر کیا گزری ہے؟ مجھے یاد آیا کہ میں ہوٹل کے کمرے میں تھا اور کلوروفام ٹائپ کی کوئی چیز سنگھا کر مجھے اغوا کیا گیا ہے۔ میں نے آہستہ سے سر اٹھایا تو یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ میں ایک بڑے جھولے میں موجود ہوں جو چھت میں لگے کنڈوں سے رسی کے ذریعے لٹکا ہوا ہے۔ رسی کنڈوں پر سے ہوتی ہوئی دائیں طرف موجود دیوار کے سوراخوں میں غائب ہو رہی تھی۔

حیران نظروں سے اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے میں اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ نیچے کمرے کے فرش پر کئی درجن سانپ موجود تھے جن میں سے کئی اپنا پھن اٹھائے پھنکار رہے تھے، کچھ رینگ رہے تھے تو کچھ بے حس و حرکت پڑے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہر سانپ میری جانب نگراں ہے۔

''یا خدایا! میں کہاں پھنس گیا؟'' میں دل ہی دل میں بولا تبھی ایک بھاری آواز کمرے میں گونجی۔ ''امید ہے، آپ خیریت سے ہوں گے۔'' یہ آواز چاروں طرف سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

''کون ہو تم؟ سامنے کیوں نہیں آتے؟'' میں نے چیخ کر کہا۔

''آرام سے مسٹر آنند، آرام سے۔'' آواز دوبارہ کمرے میں گونجی۔ ''ہم یقین دلاتے ہیں کہ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ بس کچھ دن ہمیں میزبانی کا شرف بخشنا ہوگا۔''

''اگر بہادر ہے تو سامنے آ پھر دیکھ، میں کیسے تیری چٹنی بناتا ہوں۔'' دراصل آنند کے نام سے مخاطب کرتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی غنڈہ پارٹی ہے۔ ابو میاں کی ہمدرد کیونکہ میرا نام

آنند ہے۔ یہ میں نے اس نوجوان کو بتایا تھا پھر راجا بازار کے لوگ۔ صرف شیرو اور عادل میرا اصل نام جانتے تھے۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے دماغ میں غصے والا خانہ خالی ہے اس لیے فضول باتیں کر کے خود کو ہلکان نہ کریں۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟ کیوں مجھے قید کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ان سوالات کا جواب دیا جائے گا، فی الحال آپ آرام کریں۔ آپ کو کھانا پانی ملتا رہے گا۔"

"کچھ تو پتا چلے کہ میں کن لوگوں کی قید میں ہوں؟ مجھے کس جرم میں قید کیا گیا ہے؟"

"اس کا جواب بھی وقت آنے پر ملے گا۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ مجھے نفسیاتی دباؤ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اتنے انوکھے انداز کا قید خانہ، ایسا سائنٹیفک نظام، یہ معمولی لوگ نہیں ہیں، میں ابھی اسی پر غور کر رہا تھا کہ دائیں طرف کی دیوار میں ایک خلا پیدا ہوا اور ایک تختہ آہستہ آہستہ جھولے کی طرف آنے لگا۔ تختے پر کھانے کی ٹرے موجود تھی۔

"مہربانی کر کے کھانا کھا لیں، اب صبح ملاقات ہوگی۔" ایک دوسری آواز نے مخاطب کیا۔ قید کرنے والے انتہائی مہذب نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسے شائستہ انداز میں گفتگو کہ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ میں کسی غنڈا پارٹی کی قید میں ہوں۔

اس کی بات پر میں نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ میں جانتا تھا کہ رونے پیٹنے، چیخنے چلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے مگر میں یہ ضرور سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے کیونکہ جونہی نظریں نیچے جاتیں، خوف کی تیز لہر دوڑتی محسوس ہوتی۔ مجھے اس جھولے پر پہنچایا کیسے گیا ہے، یہ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کیونکہ فرش سے چھت تک کمرا سپاٹ تھا۔ جس طرح کھانا پہنچانے کے لیے دیوار میں دراڑ پیدا ہوئی تھی، ایسا ہی کوئی خفیہ دروازہ کھلا ہوگا، اسی سے مجھے جھولے میں پہنچایا گیا ہوگا، یہ سوچ کر میں مطمئن ہو گیا۔

کھانا کھا کر میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔

ابھی میں جائزہ لے ہی رہا تھا کہ مجھے اپنا سر بھاری ہوتا محسوس ہوا پھر میں نیند کی وادی میں اترتا چلا گیا۔ شاید کھانے میں خواب آور دوا شامل تھی۔

پتا نہیں میں کتنی دیر سویا تھا؟ دوبارہ آنکھ کھلی تو میں ایک خالی کمرے کے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ کوئی دوسرا کمرا تھا اور کمرے کا اکلوتا دروازہ بند تھا۔ میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ کمرے میں صرف بیڈ ہی تھا اور کوئی چیز نہیں تھی البتہ ساتھ ہی واش روم تھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو ذہن پر اندھیروں نے دوبارہ یلغار کر دی۔ بڑی مشکل سے میں اٹھا اور واش روم تک پہنچا۔ نہانے سے ذہن پر پڑی دھند صاف ہو گئی اور میں خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگا۔

جب کمرے میں داخل ہوا تو بھاپ اڑاتی چائے کی پیالی اور ناشتے کے لوازمات بیڈ پر رکھے ہوئے تھے۔ یقیناً کسی خفیہ کیمرے سے میری نقل و حرکت پر نظر رکھی جا رہی تھی۔ اسی لیے میں جیسے ہی باتھ روم میں گیا، کوئی کمرے میں ناشتے کے لوازمات رکھ گیا۔

بھاپ اڑاتی پیالی دیکھ کر اشتہا تیز ہو گئی اور میں یہ بھی بھول گیا کہ چائے میں بھی نشہ آور اشیاء ڈالی ہوئی ہوگی۔

چائے پی کر میں نے ماحول پر غور کرنا شروع کر دیا۔ کمرے میں بلب روشن تھا جس کے معنی یہ تھے کہ رات ابھی باقی ہے۔ سانپ والے عجیب و غریب کمرے سے تو نجات مل گئی تھی مگر اب اس کمرے سے کیسے نکلوں، اس پر غور کر رہا تھا کہ ایسا لگا جیسے باہر پٹاخے پھوٹے ہوں۔ دوبارہ آواز آئی تو میں نے آواز پہچان لی۔ یہ سو فیصد پستول کا فائر تھا پھر ہلکا سا شور سنائی دیا جیسے دو تین افراد ایک ساتھ چیخ چیخ کر حکم دے رہے ہوں۔ یہ کون لوگ ہیں، میں اسی پر غور کر رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور سامنے پستول تھامے جو شخص نظر آیا، اسے دیکھتے ہی میں خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ وہ اور کوئی نہیں، اقبال تھا۔ اس کے پیچھے بھی دو تین آدمی اندر آئے مگر ان سب کے ہاتھ میں رام پوری چاقو تھے پھر جو شخص اندر داخل ہوا، اس کی آمد بھی متوقع نہیں تھی۔ وہ گلفام تھا۔ صرف میرے لیے کلکتہ سے اتنی دور آیا تھا، یہ بات میرے لیے فخر کا باعث تھی۔

اس نے مجھے گلے سے لگا کر کہا۔ "میرا شیر ان گیدڑوں میں کیسے پھنس گیا؟"

"تیراک ہمیشہ کم پانی میں ڈوبتے ہیں، میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تفصیل بعد میں بتاؤں گا، پہلے یہ بتائیں کہ آپ یہاں تک پہنچے کیسے؟"

"فی الحال تو یہاں سے نکلو، باہر چل کر بتاتا ہوں، اس لیے کہ باہر دو لاشیں پڑی ہیں۔ گولیوں کی آوازیں دور تک سنی گئی ہوں گی۔ پولیس آتی ہی ہوگی۔"

ہم سب وہاں سے باہر نکلے۔ باہر دو جیپ کھڑی تھیں۔ میں گلفام کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس جیپ میں کل چھ بندے اور تھے۔ دوسری جیپ میں بھی اتنے ہی بندے تھے۔ گویا گلفام پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔

جیپ اندھیرے کا سینہ چیرتی ہوئی آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی کہ میں نے پوچھا۔

”اب بتا بھی دیں کہ آپ سیدھے وہاں کیسے پہنچے؟“

”بھئی، سیدھی سی بات ہے، مجھے میرے آدمیوں نے اطلاع دی کہ تمہارا دوست شیرو پولیس کسٹڈی میں ہے۔ میں اس سے ملنے پہنچ گیا۔ اسے سخت پہرے میں رکھا گیا تھا۔ آئی بی کی تحویل میں دیئے جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ یہ تو قسمت اچھی تھی کہ میں بروقت پہنچ گیا ورنہ اسے آئی بی والے لے جاتے۔ آئی بی والوں کے ہتھے چڑھتے ہی اس سے ہاتھ دھونا پڑ جاتا۔ ایف آئی آر کٹ چکی ہے۔ بج بج تھانے سے اسے کلکتہ منتقل کیا گیا ہے ورنہ میں اسے آزاد کرا لیتا۔“ اس نے پوری تقریر کر دی۔

”آپ نے پوری کتھا سنا دی مگر یہ نہیں بتایا کہ شیرو کا ہوا کیا؟“

”آئی بی یعنی انٹیلی جنس بیورو، بھارت کا سب سے اہم محکمہ۔ اس کے ہتھے چڑھنے والا زندہ آزاد نہیں ہو پاتا۔ اسی لیے میں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے کہ اس پر لگے الزامات کو غلط ثابت کر دوں ورنہ آئی بی والے اسے لے جائیں گے۔ وہ بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ پولیس والوں نے اسے ایس آئی ایم کا رکن ظاہر کیا ہے۔“

”یہ ایس آئی ایم کیا ہے؟“

”اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ“ طلباء کی ایک تنظیم۔ اس تنظیم کے طلباء کشمیر کی آزادی کے خواہش مند ہیں۔ بھارتی حکومت انہیں دبانے کے لیے قید و بند کی صعوبت سے گزارتی ہے۔ ان کی نظروں میں یہ بھارت کے دشمن ہیں کیونکہ اپنا حق مانگنے کی غلطی جو کر رہے ہیں۔“

”تب تو اس کا رہا ہونا مشکل ہے کیونکہ وہ کشمیری جو ہے۔“

”کیس کمزور کرنے کے لیے میں نے اپنے دوست افسران کو کہہ دیا ہے۔ انہی لوگوں نے میری ملاقات شیرو سے کرائی تھی۔ شیرو نے ہی تمہارا پتا دیا اور کہا کہ تمہاری حفاظت کی جائے پھر میرے ان آدمیوں نے جنہیں میں نے وکٹر پر نظر رکھنے کی ڈیوٹی لگائی تھی، انہوں نے اطلاع دی کہ وکٹر بج بج جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ اس کے ساتھی بھی ہیں۔ تم سے ملنا ہی تھا بس

میں چل پڑا۔ کچھ گھنٹے کے فرق سے ہم پہنچے، اسی فرق کا اس نے فائدہ اٹھایا۔“

”مگر اس نے جہاں مجھے قید کیا تھا، وہ جگہ تو خصوصی طور پر تیار کردہ تھی۔“

”بج بج اور کلکتہ میں فرق ہی کیا ہے، میرے اڈے تو بردوان، بہرام پور، مدنا پور تک میں ہیں۔ اس نے بھی یہاں اڈہ بنا رکھا تھا جہاں وہ کلکتہ سے تاوان کے لیے اغوا شدہ افراد کو رکھتا ہو گا۔“

”گویا، اس وکٹر کا قصہ ختم ہوا؟“

”میرے بھائی، وکٹر میری ٹکر کا دادا ہے۔ اس کو خبر ہو گئی ہو گی کہ میں بج بج آ گیا ہوں اسی لیے وہ دُم دبا کر فرار ہو گیا مگر یہ نہ بھولنا کہ اس نے تمہیں بھلا دیا ہے۔ وہ سخت کینہ پرور ہے، اس سے بچائے رکھنے کے لیے مجھے تم پر مسلسل نظر رکھنا ہو گی۔ وہ اپنی شکست کا بدلہ تم سے ضرور لے گا پھر پولیس بھی تمہاری تلاش میں ہے۔“

”بھاڑ میں جائے وکٹر اور چولہے میں جائے یہاں کی پولیس۔“ میں نے دل ہی دل میں موٹی سی گالی نکالی۔ ’میں تو موقع پاتے ہی خاموشی سے دِلّی نکل لوں گا پھر وہاں سے امرتسر اور امرتسر سے لاہور۔ میں نے دل ہی دل میں کہا پھر گلفام سے پوچھا۔“ ہم لوگ جا کہاں رہے ہیں؟“

”واپس کلکتہ۔ علی پور میں میرے دوست کا بنگلہ ہے۔ وہاں تم چھپے رہ سکتے ہو۔ تمہاری ساتھی کو وہاں پہنچا دیا گیا ہے۔“

میں نے سر پیٹ لیا۔ ریکھا تو گویا میری ہم زاد بن گئی ہے۔ میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں اور قسمت اسے پھر سے مسلط کر دیتی ہے۔

رات کا یہ آخری پہر تھا پھر بھی اکا دکا گاڑیاں آتی جاتی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے سوال جواب کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا۔ ریکھا کا سن کر ہی میرے لب پر تالے لگ گئے تھے۔ ذہن الجھ گیا تھا۔ میں سڑک کنارے قطار در قطار پیچھے بھاگتے بجلی کے کھمبوں کو دیکھنے لگا تھا، تبھی آگے جا رہی جیپ نے انڈیکیٹر دیا پھر رک گئی۔ اس جیپ سے کوئی کود کر نیچے اترا تھا اور اب ہماری جیپ کی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔ نزدیک پہنچنے پر میں نے اسے پہچان لیا، وہ اقبال تھا۔ اس نے نزدیک آ کر کہا۔“ مجھے یہاں سے ٹرام مل جائے گی۔ پہلی ٹرام کا وقت ہو چلا ہے۔ میں شام تک بنگلے پر پہنچ جاؤں گا۔“

"تم نے بنگلہ دیکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، آتے وقت یہاں رکے تھے۔ گلفام صاحب صفائی وغیرہ کا جائزہ لینے آئے تھے۔"

"ٹھیک ہے، جاؤ بلکہ ان سے کہو کہ وہ لوگ بھی گھر جائیں۔ یہ راستے میں تمہیں اتار دیں گے۔" میری بجائے گلفام نے کہا۔

اور جیپ بڑھانے کا اشارہ کیا۔ جیپ پھر سے دوڑنے لگی۔ میں نے سڑک پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "گلفام بھائی......!"

"آں......! گلفام......!"

"ریکھا نے آپ کو دیکھا نہیں پھر وہ اتنے آرام سے آپ کو لینے آ گئی؟"

"یہ صحیح ہے کہ جب میں راجا بازار گیا تھا وہ گھر میں تھی۔ مجھے دیکھ نہیں پائی تھی مگر میرا نام سنتے ہی جان گئی کہ میں دوست ہوں۔ جب میں نے یہ کہا کہ ہم نے تمہیں آزاد کرا کر علی پور پہنچا دیا ہے تو اس نے یقین کر لیا اور میرے آدمیوں کے ساتھ چلی گئی۔ وہاں تمہیں نہ پا کر اس نے شور شرابہ کیا تھا مگر پلاننگ کے مطابق میں نے وہاں فون کر کے کہا کہ تم میرے ساتھ ہو۔ ہمیں آنے میں دو گھنٹے لگیں گے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے ہر جانب سے لاتعلق ہو گئے تھے۔ سکھ ڈرائیور تو گونگا، بہرہ بنا ہوا تھا، صرف اسٹیئرنگ گھمائے جا رہا تھا کہ یکا یک اس نے بریک دبا دیا۔ تیزی سے دوڑتی ہوئی جیپ رکی تھی اس لیے ہمیں بھرپور جھٹکا لگا تھا اور ہمارے سر ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے۔

"اوئے سردار دے پتر، کی ہویا اے؟" گلفام نے غصیلے لہجے میں سکھ ڈرائیور سے کہا۔

"بادشاہو، اننے آرام آرام سے چلا رہا تھا کہ ٹائر پنکچر ہو گیا۔"

"اوئے کھوتے دا پتر، اب ہم آگے کیسے جائیں گے؟"

"ابھی ہو جاتا ہے۔" کہہ کر وہ ڈگی سے اوزار نکالنے لگا۔

گلفام نے سیٹ اٹھا کر اس کے نیچے سے وائرلیس سیٹ نکالا۔ گو کہ وہ فوجی انداز کا وائرلیس سیٹ تھا مگر سائز میں اس کا آدھا بھی نہ ہوگا۔ اس نے وائرلیس سے کسی کو میسج دیا کہ گاڑی لے کر آؤ۔

"بادشاہو، اگر کہو تو واپس پیچھے کی طرف چلتے ہیں۔ راستے میں ایک ٹائر پنکچر کی دکان

دیکھی تھی۔"

"چلو چلتے ہیں۔" پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو، گاڑی آئے تو پیچھے لے آنا۔"

میں انتظار کی نیت سے کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں تیز تیز قدموں سے مخالف سمت میں بڑھ رہے تھے پھر آہستہ آہستہ وہ ایک ہیولہ بنتے گئے اور کچھ دیر بعد غائب ہو گئے۔ اب میں نے ادھر سے نظریں ہٹا لیں اور مخالف سمت میں دیکھنے لگا تبھی دور دو روشن نقطے نظر آئے جو تیزی سے نزدیک آ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا، گلفام نے جو گاڑی منگوائی تھی، وہ قریب آتی جا رہی ہے پھر وہ گاڑی قریب آ گئی۔

وہ مہندرا جیپ تھی۔ اس کے اندر اندھیرا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ میں مجھے اندر بیٹھا شخص صحیح طور پر نظر نہیں آیا کیونکہ اس نے ہیٹ لگا رکھا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا پھر مجھے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "سیدھے چلو، گلفام صاحب ادھر ہی گئے ہیں۔"

ڈرائیور نے ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھایا اور گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ ابھی ہم بمشکل ڈھائی تین فرلانگ گئے ہوں گے کہ ایک عجیب سی بات ہوئی۔ ایک سفید کلر کی ایمبیسیڈر کار داہنی سڑک سے نمودار ہوئی۔ اس کی رفتار طوفانی تھی۔ وہ ہمارے قریب سے گزرتی ہوئی پیچھے نکل گئی۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا، وہ خالی کھڑی گلفام کی جیپ کے پاس رکی تھی اور اس میں سے ایک آدمی اتر کر جیپ تک گیا تھا اور فوراً واپس کار میں بیٹھ گیا تھا پھر کار نے تیزی سے رخ بدلا اور ہماری جیپ کی طرف لپکی۔ میرے اندر کا جوان یک دم جاگ اٹھا۔

کار ہماری طرف بڑھی، اس بھوکے تیندوے کی طرح جس نے شکار دیکھ لیا ہو۔ میں نے سوچا، کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے، کوئی غلطی ہوگئی ہے لیکن کیسی گڑبڑ اور کیسی غلطی، میں ابھی اس بارے میں کچھ سوچ نہ سکا تھا کہ ٹھنڈے لوہے کی نال میری گردن سے آ لگی، تب مجھے احساس ہوا کہ میں غلط گاڑی میں بیٹھ گیا ہوں۔ غلطی کا احساس ہوتے ہی میں سکتے میں آ گیا۔

"مسٹر آنند......!" عقب سے سفاک لہجے میں کہا گیا۔ "ہیرو بننے کی کوشش مت کرنا ورنہ گولی بھیجے میں اتر جائے گی۔"

آواز کی کرختگی بتا رہی تھی کہ اس نے جو کچھ کہا ہے، وہ اس پر عمل بھی کر بیٹھے گا۔

مجھ پر حیرت کی برف گر رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں؟ یہ کون لوگ ہیں؟ انہیں کیسے بروقت اطلاع ملی کہ ہم یہاں کھڑے ہیں؟

ابھی میں غور ہی کر رہا تھا کہ عقب میں بیٹھا شخص چیخا۔ ''ڈی سوزا......! ہوشیار......!''

مگر اس کا جملہ پورا نہ ہو سکا۔ دھماکے کے ساتھ جیپ کو زوردار جھٹکا لگا تھا۔ کار نے ٹکر ماری تھی۔ ہم اپنا توازن کھو بیٹھے۔

پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر میری گود میں گرا پھر اچھل کر ڈرائیور کے پیروں میں چلا گیا۔

غفلت کا یہ لمحہ گو مختصر تھا مگر میرے لیے کافی تھا۔ میں اسے گنوا دیتا تو یہ میری حماقت کہلاتی۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے میں نے جیپ سے چھلانگ لگا دی۔

میرے کودتے ہی مجھ پر ایک ساتھ کئی فائر ہوئے۔ میں نشیب میں گرا تھا۔ گرتے ہی میں لڑھکتا چلا گیا تھا۔ کافی دور آنے کے بعد میرا جسم ایک پیڑ سے ٹکرا کر رکا تھا۔ رکتے ہی میں نے خود کو جھاڑیوں میں دبکا لیا۔ تقریباً 20 منٹ کے بعد وہ آتا ہوا نظر آیا۔ اس وقت مجھے ریوالور کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے ہی وہ قریب آیا تو اس کے خدوخال واضح ہوتے گئے۔

جب اُس کے اور میرے درمیان فاصلہ بہت کم رہ گیا تو میں اپنی کمین گاہ سے نکلا اور اُس کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اس طرح بڑے سکون واطمینان کے انداز سے چلا آ رہا تھا جیسے اُس کے سوا اور کوئی یہاں نہیں ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔ میں اُس کی جانب لپکا۔ اس نے پستول کا دستہ میرے منہ پر دے مارا۔ میں ایک سرعت سے نہ ہٹتا تو میرے چہرے کا جغرافیہ بدل جاتا۔ پھر بھی دستہ میرے شانے سے ٹکرا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے اس پر تیندوے کی طرح چھلانگ لگا دی اور اُس سے بری طرح ٹکرا گیا۔ اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر جھاڑیوں میں جا گرا۔

وہ مجھ سے ٹکراتے ہی گر گیا تھا لیکن برق سرعت سے اُٹھ کر کھڑا ہوا اور پھر ہم دونوں کے درمیان زندگی اور موت کی جنگ شروع ہو گئی۔ اب ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی زندہ رہ سکتا تھا۔ میں نے پھر اُس پر چھلانگ لگائی۔ اُس نے کمال ہوشیاری سے خود کو بچایا اور ایک طرف ہو کر میرے جبڑے پر اتنی زور سے مکا مارا کہ میری ریڑھ کی ہڈی تک میں آگ بھر گئی۔ میں اس کے حملے سے سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ اس کے مضبوط ہاتھوں کا ایک بھرپور وار میرے گلے

سے نیچے پڑا۔ میں درد سے کراہ اُٹھا۔

وہ بھی لڑائی میں ماہر تھا۔ وہ مجھ پر بھاری پڑ چکا تھا۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ وہ اپنے فن سے کام لینے کے بجائے اپنے ریوالور سے کام لینا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے جو نیم جان سا دیکھا تو اپنی جیب سے دوسرا ریوالور نکالنے لگا۔ اس وقت وہ میرے قریب تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے مجھ پر گھونسا تانا مگر میں اُس پر سبقت لے گیا۔ میں نے اس کے سر پر ایک زوردار ہاتھ دے مارا جس سے وہ بری طرح ڈگمگا گیا۔ لیکن اس نے اس کے باوجود میری پسلی پر ایک مکا رسید کر دیا۔ میں مدافعت کرنے لگا۔ اس کے گھونسوں میں بڑی طاقت تھی جس کی میں تاب نہیں لا رہا تھا۔ وہ مجھ پر مسلسل مکوں کی بارش کرتا تو شاید میں بچ نہ پاتا۔ اس نے جو دوبارہ ریوالور نکالنے کی کوشش کی، وہ اُسے مہنگی پڑی۔ میں نے پھر اُس پر ایک اور جست لگا دی اور ہم دونوں زمین پر آ رہے۔ وہ میرے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں نے بغیر کسی تاخیر کے اس کے منہ، سینے اور نازک مقامات پر جنونی انداز سے مکے برسانا شروع کر دیئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس خبیث نے دم توڑ دیا۔ سفاک، وحشی اور ظالم جس کے نامۂ اعمال کی فہرست میں نجانے کتنے بے گناہوں کا خون شامل تھا، پرندوں کی تعفن آمیز گندگی کے درمیان پڑا تھا۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے اُسے کمزور سمجھ لیا تھا۔ میرے دل کو خوشی ہو رہی تھی کہ میں نے انتقام لے لیا۔

اب میں نے اوپر کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ تبھی میری نظر سڑک پر گئی۔ وہاں کار رکی ہوئی تھی۔ ادھر جاؤں یا نہ جاؤں، ابھی اسی مغالطے میں تھا کہ کار سے کسی نے چیخ کر کہا۔ ''او بھائی......! اب باہر بھی آ جاؤ، دھماکے کی آواز دور تک سنی گئی ہوگی۔''

نشیب سے نکل کر میں سڑک پر آ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی کار کا دروازہ کھل گیا۔ میں تیز قدموں سے ادھر بڑھ رہا تھا کہ میری نظر جیپ کے نزدیک پڑے آدمی پر پڑی اور میں چکرا گیا۔ وہ شاید وہی تھا جس نے میری گردن سے پستول کی نال لگائی تھی۔ وہ زمین پر چت پڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر پولیس کی وردی تھی۔ کیا یہ لوگ پولیس والے تھے، میں یہی سوچتا ہوا کار تک پہنچ گیا۔

ابھی میں نے بیٹھ کر دروازہ بند ہی کیا تھا کہ ایک شخص بولا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ آپ بخیریت ہیں۔ ہم بروقت پہنچ گئے۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' اس کی صاف اور شُستہ اُردو سن کر میں خوش ہو گیا تھا کہ یہ بھی مسلمان

ہے۔

"انہوں نے کوئی زیادتی تو نہیں کی ناں؟"

"نہیں۔" پھر میں نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام سربجیت سنگھ مان ہے، میں منڈا پنجابی ہوں۔"

"مگر تمہاری اُردو تو بڑی اچھی ہے؟"

"میں لکھنؤ میں رہتا ہوں۔ صرف دو سال قبل کلکتہ آیا ہوں۔"

ہم نجی قسم کی باتیں کرتے رہے، سفر کٹتا رہا پھر وہ کار ایک وسیع بنگلے میں داخل ہوگئی۔ اس بنگلے کے ایک کمرے میں پہنچا کر سربجیت نے کہا۔ "یہاں آپ آرام کریں۔ صبح ملاقات ہوگی۔" میں تو پہلے ہی تھکا ہوا تھا، بستر پر لیٹتے ہی نیند نے تھپکی دی، تھکن نے لوریاں سنائیں اور میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

میں بے خبر سو رہا تھا کہ یکا یک میری آنکھ کھل گئی۔ شاید کھٹکا ہوا تھا۔ یہ بات میری سرشت میں شامل تھی کہ میں کتنی ہی گہری نیند میں کیوں نہ ہوں، ہلکی سی آواز پر بھی میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں بیدار ہوگیا تھا۔ میں نے چاروں جانب نگاہ گھمائی۔ کھڑکی کے ذریعے ایک نقاب پوش اندر آرہا تھا۔ اس کا لباس بھی سیاہ تھا جو اس کے بدن سے چپکا ہوا تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کے بلب کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک ریوالور تھا۔ ریوالور پر سائلنسر بھی چڑھا ہوا تھا۔ میں اس سے پہلے کہ ہوشیار ہوتا کہ وہ یک دم آگے بڑھ آیا اور اس نے ریوالور کی نال کو میری پیشانی پر رکھ دیا۔

موت کو خود سے اتنے قریب پا کر میرے مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا اور خون کنپٹیوں میں ٹھوکر مارنے لگا۔ میں کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

جب ریوالور کی سرد نال آدمی کی پیشانی کو بوسہ دے رہی ہو تو ایسے میں کیا کیا جاسکتا ہے؟ میں نے پھرتی سے کروٹ بدل کر بستر سے نیچے گرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ میرے جسم کا ہر عضو جیسے شل ہوکر رہ گیا تھا۔

اب مجھے گولی چلنے کا انتظار تھا۔ اس گولی کا جو میری پیشانی پر تیسری آنکھ بنانے کے لیے چلائی جانے والی تھی۔ مجھے اپنا ہر سانس آخری سانس لگ رہی تھی۔ رات کے اس پہر یوں اچانک کھڑکی کے راستے خواب گاہ میں گھس آنے اور ریوالور پیشانی پر رکھ دینے والے کو

دوست تو نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ وہ فرشتۂ اَجل بن کر آیا تھا اور یقیناً مجھے ہلاک کرنے کے بعد ہی وہ اس کمرے سے نکلتا۔

میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن نقاب کی وجہ سے میں اسے پہچان نہیں پا رہا تھا اور نہ چہرے کے تاثرات دیکھ سکتا تھا۔ دل کی ہر دھڑکن میرے لیے کانوں میں ڈھول کی آواز بن کر گونج رہی تھی۔

آنکھوں کی جگہ اس کے نقاب میں دو سوراخ تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، وہ بے جان اور پتھرائی ہوئی تھیں۔ موت کا سایہ لہرا رہا تھا۔ لیٹے لیٹے میں نے آخری کوشش کی۔ بجلی کی سی پھرتی سے پیر گھمایا اور پیر کے انگوٹھے سے اس کی گردن پر وار کیا۔ یہ وار اچانک ہوا تھا۔ وہ جھٹکا کھا کر مجھ پر آگرا۔ یہ ایک خطرناک کوشش تھی۔ اس کی انگلی ٹرائیگر پر دب سکتی تھی، گولی چل سکتی تھی۔

اس کے گرتے ہی میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی کلائی کو اس طرح پکڑا کہ نال کا رخ مڑ جائے پھر داہنے ہاتھ کا گھونسا پیشانی پر مارا۔ دو متضاد جھٹکے، اس کا ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا۔ موقع گنوانا بے وقوفی تھی۔ تابڑ توڑ دو گھونسے چلائے۔ وہ الٹ کر زمین پر گرا۔ میں بھی اچھل کر بستر سے نیچے آگیا۔ اتنی دیر میں وہ پھر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے جھک کر پنڈلی پر بندھا خنجر نکال لیا۔

میں اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا ورنہ اس کا وار سیدھے میرے سینے پر تھا۔ خنجر کا چمکدار پھل مجھ سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گیا۔ اپنا وار ناکام جاتے دیکھ کر اس نے ایک مرتبہ پھر جھپٹ کر مجھ پر حملہ کیا۔ وہ خنجر کی نوک سے میرا حلقوم ادھیڑ دینا چاہتا تھا لیکن میں جھکائی دے کر خود کو بچا گیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اب مجھے اسے قتل کرنا ہی پڑے گا۔ دوسری صورت میں وہ مجھے ختم کر دے گا۔

تیسری مرتبہ خنجر میرے چہرے سے صرف ایک انچ کے فاصلے سے گزرا تو میں تیار تھا۔ میرا بایاں ہاتھ اس کے خنجر والے ہاتھ پر پڑا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلایا اور لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا، تاہم خنجر اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور موت کی آنکھ بن کر مجھے گھور رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا، میں نے دائیں ہاتھ سے کراٹے کی ایک بھرپور ضرب اس کی گردن پر لگا دی۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی اور اس کی گردن ایک جانب لٹک گئی۔ وہ لہراتا

ہواز مین پر گر گیا۔

میں کچھ دیر تک اس کی لاش کو تکتا رہا پھر دروازے کی سمت بڑھا۔ مجھے حیرت بھی تھی کہ کمرے میں اتنی اٹھا پٹخ ہوئی اور کسی نے آ کر پوچھا بھی نہیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے؟

میں دھیرے دھیرے دروازے تک پہنچا اور ہینڈل گھمایا مگر یہ کیا؟ دروازہ لاک تھا۔ میں نے دوبارہ کوشش کی مگر دروازہ نہ کھلا۔ کیا میں قید میں ہوں؟ مجھے یہ سوال دہلانے لگا۔

میں نے دو تین بار پھر کوشش کی مگر جب نتیجہ بارآور نہ ہوا تو میں پلٹ آیا۔ لاش پر نظر ڈالی اور کھلی ہوئی کھڑکی تک پہنچا۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ لان میں صرف ایک بلب روشن تھا جو صرف گیٹ کے نزدیک کے اندھیرے کو دور کر رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں پر وزن ڈالا اور کھڑکی پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گیا۔

کھڑکی زمین سے بہ مشکل پانچ فٹ اوپر تھی اس لیے نیچے کودنے پر صرف ہلکی سی دھمک گونجی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ گلفام نے مجھے یہاں لا کر قید کر دیا ہے۔ پتا نہیں، اس عمارت میں کتنے آدمی ہیں، اس سے بھی بے خبر تھا اس لیے نہایت احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔ برآمدے کی طرف نظر ڈالی، وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ بظاہر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں کوئی نہیں ہے مگر میں احتیاط کا دامن چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے نپے تلے قدم اٹھا رہا تھا۔ گیٹ سے متصل چوکیدار کا کمرا تھا۔ کمرے کے اندر روشنی ہو رہی تھی اس لیے بھی میں گربہ پا چل رہا تھا۔

آہستہ آہستہ میں اس کمرے کے نزدیک پہنچ گیا، تبھی مجھے اندر سے آتی آواز سنائی دی اور میں مزید ہوشیار ہو گیا۔ میں نے رخ بدل دیا۔ اب میں اس کمرے کے دروازے کی بجائے عقبی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔

کھڑکی کے نزدیک پہنچ کر میں نے احتیاط کے ساتھ اندر جھانکا۔ اندر دو گارڈز بیٹھے تھے اور دونوں کی کمر سے ''گوکھری'' لٹک رہی تھی۔ یہ وزنی چاقو نیپالیوں کا پسندیدہ ہتھیار ہے، اس کا علم مجھے تھا۔

وہ دونوں چائے کا تھرماس سامنے رکھے بیٹھے تھے، شاید چائے پینے کے لیے اندر آئے ہوں گے۔ دونوں میں ایک نیپالی تھا، دوسرا مقامی۔ وہ باتیں اُردو میں کر رہے تھے۔ ایک بولا۔

''لگتا ہے، قیدی بہت اہم ہے اسی لیے اتنی احتیاط کی گئی ہے۔ وکٹر صاحب کا حکم ہے، لاش کو

کنویں میں ڈال کر اچھی طرح مٹی ڈالی جائے۔''

اس کی بات سن کر میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا مگر توجہ ان کی باتوں پر رہی۔

''ہاں، مجھے بھی بندہ بہت اہم لگتا ہے ورنہ قتل کرنے میں اتنی دیر نہ لگائی جاتی۔ اس سے پہلے تو آناً فاناً کام کر دیا جاتا تھا۔''

پہلے والے نے جواب میں کہا۔ ''اتنی احتیاط کی جائے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ بندہ بہت اہم ہے۔''

''اب باری اس اہم بندے کی ہے۔'' میں نے زیر لب کہا اور گھوم کر دروازے پر پہنچا پھر ایک ہی جمپ میں ان کے سر پر پہنچ گیا۔ میں نے ایک ساتھ دونوں ہاتھوں کو استعمال کیا تھا۔ داہنے ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی نیپالی کی گردن پر پڑی تھی اور بائیں ہاتھ سے دوسرے والے شخص کے کالر کو کھینچا تھا۔ وہ جھٹکے کی وجہ سے میرے سینے سے ٹکرایا تھا اور میں نے اس کے گلے میں بازو حمائل کر دیے تھے۔

نیپالی گردن پر ہاتھ رکھے رکھے ڈھے گیا تھا مگر سخت جان تھا کہ مغلظات کا سلسلہ جاری کیے تھا۔ ادھر میرے بازو میں دبا شخص چھٹپٹا رہا تھا۔ وہ اپنی گردن چھڑانے کی سعی میں مصروف تھا مگر اس کا ہر جھٹکا اسی کے لیے تکلیف کا باعث بن رہا تھا۔ میں نے اسے زیادہ موقع دینا مناسب نہیں سمجھا اور پہلے ایک ٹھوکر گرے ہوئے نیپالی کے چہرے پر لگائی پھر داہنے ہاتھ کی مٹھی کو اس کے سر پر لگایا جسے میں بازو میں جکڑے ہوئے تھا۔ وہ چاہ کر بھی اپنی چیخ روک نہ سکا۔ اس کے ساتھ میں نے نیپالی کو ایک اور ٹھوکر ماری۔ میں اکیلا ان دونوں کی مزاج پُرسی کیے جا رہا تھا۔ میرے دل سے یہ ڈر بھی نکل گیا تھا کہ کوئی اور بھی آ سکتا ہے کیونکہ بنگلے کے خالی ہونے کا اندازہ قوی ہو چکا تھا۔

میرے ہاتھ اور پیر دونوں یکساں رفتار سے چل رہے تھے اور وہ دونوں صرف اپنا بچاؤ کرنے میں منہمک تھے کہ میرے بازو میں پھنسے کالیے کی گردن ڈھلک گئی۔ وہ پورے قد سے جھول گیا تھا۔ اسے تھامے رکھنا بے وقوفی تھی اس لیے اسے نیچے چھوڑ دیا۔ وہ دھب سے گرا تھا کہ میں نیپالی کی طرف لپکا تبھی گیٹ کے باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ انجن کی آواز پر میں چوکنا ہو گیا تھا۔ میری نگاہ نیپالی پر تھی جو ادھ مرا ہو چکا تھا۔ اب بس اسے مرگھٹ تک پہنچانا تھا۔ وقت بالکل نہیں تھا۔ گیٹ پر پہنچنے والے اب تب میں دروازہ بجانے والے تھے تا کہ چوکیدار

جان کر گیٹ کھول سکے۔ ایک چوکیدار موت کی گود میں سو چکا تھا۔ اب دوسرے کو بھی اس کی رفاقت کے لیے بھیجنا تھا۔ میں نے ایک لات اور ماری، وہ لڑھک کر زمین پر لیٹ گیا۔ میں اپنی جگہ سے اچھلا اور پوری قوت سے اس کے گلے پر پیر سے ضرب لگائی پھر دباؤ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ صرف چند لمحے درکار تھے جن کا میں نے بھرپور فائدہ اٹھالیا تھا۔ نیپالی کی زبان منہ سے باہر لٹک آئی تھی۔ وہ چیخ بھی نہ پایا تھا۔ خاموشی سے موت کی بانہوں میں چلا گیا تھا۔

ان دونوں سے نمٹ کر میں دروازے تک آیا اور اس طرح سے آڑ میں کھڑا ہو گیا کہ اندر آنے والے کی سیدھی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ میری زندگی میں ایسے کئی مواقع آ چکے تھے کہ دشمن میری تلاش میں اس کمرے تک پہنچ گئے جہاں میں چھپا ہوا تھا اور میں نے اپنی عقل سے انہیں چت کر دیا۔ اب پھر سے ویسا ہی موقع آیا تھا۔ مجھے اسی عیاری سے آنے والوں کو گھیرنا تھا۔ گھیر کر ان کی اوقات بتانی تھی۔

میں نے دروازے کی اوٹ سے باہر جھانکا اور حیرت زدہ رہ گیا۔ آنے والے نے سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ دوست ہمیشہ سیدھے راستے سے آتے ہیں۔ آنے کے لیے دروازہ استعمال کرتے ہیں مگر وہ دروازے سے نہیں، دروازے پر سے آ رہا تھا۔ گیٹ پر چڑھ کر اندر کودا تھا۔ ایسے آنے والا دوست ہو ہی نہیں سکتا، پھر کون ہے، یہ سمجھنے کے لیے میں اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا کہ اس نے گیٹ کھول دیا۔ ایک اور شخص اندر داخل ہوا۔ گیٹ پر بلب روشن تھا اس لیے ان دونوں کے چہرے مجھے صاف دکھائی دیئے تھے اور میں خوش ہو اٹھا تھا۔ میری رگ رگ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی کیونکہ بعد میں آنے والا اقبال تھا، میرا پرانا واقف کار جسے میری طرح قسمت نے بے وطنی کا دکھ دیا تھا۔ وہ شکاری کی طرح چوکنا انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ میں نے دروازے پر آ کر کہا۔ ''بندہ حاضر ہے اور اندر کوئی دشمن بھی نہیں ہے۔ ہاں، دونوں چوکیدار ضرور لاش بنے اندر کمرے میں پڑے ہیں۔''

''آپ واقعی انسان نہیں، جن ہیں جسے کوئی بھی قید نہیں کر سکتا۔ ہر بار قید ہوتے ہیں اور خود ہی آزاد ہو جاتے ہیں، واہ بھئی، واہ......!'' اقبال نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''یہ وقت قہقہہ لگانے کا نہیں ہے، نکلنے کی سوچو۔ کہیں وکٹر کے آدمی پھر نہ آ جائیں؟''

''باہر ہمارے آدمی بھی موجود ہیں۔ ایک دو نہیں، پورے بائیس آدمی ہیں۔''

''میرا خیال ہے، چلے چلو کیونکہ یہاں اور کوئی نہیں ہے۔'' کہہ کر میں خود آگے بڑھا۔

اقبال نے کمرے میں جھانکنے پر اکتفا کیا اور باہر آ گیا۔

گیٹ کے باہر تین جیپ کھڑی تھیں۔ کچھ لوگ اس پر بیٹھے تھے اور کچھ نیچے اتر کر ٹہل رہے تھے۔ میں نے ان سب پر نظر ڈالی اور جیپ کی اگلی سیٹ پر سوار ہو گیا۔ اقبال بھی اسی جیپ میں آ گیا۔

جیپ آگے بڑھی تو میں نے پوچھا۔ ''بھئی اقبال، تم لوگوں کو پتا کیسے چلا کہ میں یہاں پر ہوں؟''

''گلفام بھائی کے سورس بہت ہیں۔ انہوں نے وکٹر کے آدمیوں میں بھی اپنے آدمی رکھ چھوڑے ہیں۔ انہی نے خبر دی کہ آپ کو اس نے اپنے مخصوص انداز میں گرفتار کر لیا ہے۔ اس کا انداز الگ سا ہے۔ وہ اغوا کے لیے دو گاڑی بھیجتا ہے۔ ایک دشمن دوسرے دوست بن کر مغوی کو اڑا لے آتے ہیں۔ آپ کے اغوا کا سنتے ہی بھائی نے یہ گروپ ترتیب دے دیا۔ اس گروپ میں سب کے سب ماہر چاقو زن ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں جم کر مدافعت ہو گی مگر لگتا ہے، وکٹر خود پر بہت زیادہ اعتماد کرنے والا ہے۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہو گا کہ ہم اس جگہ کو ڈھونڈ لیں گے۔''

''پتا نہیں، اس کم بخت کو مجھ سے ایسی کیا دشمنی ہو گئی ہے کہ وہ میرا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ ہی نہیں؟''

''گلفام بھائی نے بتایا تو تھا کہ وہ سخت کینہ پرور ہے۔ اس نے ابو میاں کو اپنے گروہ میں شامل کیا اور اس کی مدد کی۔ آپ نے اس کے آدمیوں کو اوقات بتائی۔ بس وہ آپ کا دشمن بن گیا۔''

میں نے انگلش میں سرگوشی کی۔ ''لعنت بھیجو اور آگے نکل چلو۔ ہماری منزل یہ مار دھاڑ نہیں۔''

''ہاں، میرا خیال بھی یہی ہے۔'' اس نے بھی تائید کر دی۔ باتوں کے درمیان راستہ کٹ گیا اور ہم ایک بنگلے میں داخل ہو گئے۔

اندر پہنچتے ہی میری ''چھوکن'' نے زبردست انداز میں میرا خیر مقدم کیا۔ ایسے کھل پڑی جیسے ہم برسوں کے بچھڑے، آج ملے ہوں۔ اس کی بے تابی دیکھ کر اقبال بھی مسکراتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ باقی افراد تو پہلے ہی باہر والے کمرے میں رک گئے تھے۔ رات کا

آخری پہر تھا۔ پو پھٹنے ہی والی تھی۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا اسی لیے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''پلیز ریکھا، میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ دشمنوں کی قید سے آ رہا ہوں اس لیے کچھ دیر سو لینے دو۔''

''ٹھیک ہے، تم سو جاؤ۔ میں تمہارا بدن دبا دے رہی ہوں۔''

یہ پیشکش بھی خطرناک تھی۔ میں اندر تک لرز گیا اس لیے گھبرا کر بولا۔ ''نہیں، مجھے نیند کی سخت ضرورت ہے۔ تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔'' پھر سرتاپا چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔

ریکھا شاید دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ آواز بالکل نہیں آ رہی تھی۔ مجھے نیند بھی ستا رہی تھی اس لیے سونے کے لیے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا اور عادت کے مطابق گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اس طرح ذہن سے خیالات کا اثر بالکل ختم ہو جاتا ہے اور دماغ ہلکا ہو کر نیند کو آوازیں دینے لگتا ہے۔

ابھی آنکھوں میں نیند نہیں اتری تھی۔ کوشش کامیاب نہیں ہو پائی تھی کہ اقبال نے آ کر مجھے جھنجوڑ دیا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اقبال کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ وہ حد درجہ گھبرایا ہوا تھا۔ بے ربط لہجے میں بولا۔ ''وکٹر کے آدمیوں نے عادل کو مار دیا۔ اس کی بیوی اور بچے بھی مارے گئے۔ صرف رشیدہ بچی ہے۔ پڑوس کے گھر میں شادی تھی، وہ ان کے ہاں ڈھولک بجا رہی تھی۔''

میں سوچ میں گم ہو گیا۔ پتا نہیں یہ میرے ستارے کی نحوست ہے یا کیا ہے کہ میں جس کے گھر بھی ٹھہرتا ہوں، وہ تباہی کا شکار ہو جاتا ہے؟ ریکھا کے ہاں ٹھہرا تو وہ خاندان تباہ ہو گیا۔ شیرو کے پاس رکا تو وہ مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ عادل کے ہاں گیا تو اس کا خاندان تباہ ہو گیا۔

''کیا سوچنے لگے؟ فوراً چلیں، گلفام بھائی نے آدمی بھیجا ہے، وہ وہیں ہیں۔''

خبر سنتے ہی میرے دل میں درد کا طوفان کھڑا ہو گیا تھا۔ بے چارہ عادل مفت میں مارا گیا، نہ صرف وہ بلکہ اس کے بیوی بچے بھی مارے گئے۔ یہ ایک ایسی خبر تھی جسے سن کر میں گھر میں رک نہیں سکتا تھا، فوراً تیار ہو گیا۔ خبر لانے والا پریشانی کی حالت میں کھڑا تھا۔ اس نے بتایا کہ پتا نہیں کیوں گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے۔ اس بات نے مجھے تپا دیا۔ میں نے اقبال کا ہاتھ تھاما اور باہر نکل آیا۔ باہر زندگی جواں تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ خوب گہما گہمی تھی۔ ٹیکسی

کے ہارن، رکشے کی ٹن ٹن اور خوانچہ فروشوں کی آوازوں سے علاقہ گونج رہا تھا۔ ہم اس علاقے سے باہر نکل آئے کیونکہ ایک بھی خالی ٹیکسی ملی نہیں تھی اور رکشے پر سوار ہونا حماقت تھی۔ یوں بھی کوئی رکشے والا راجا بازار تک جانے کے لیے تیار نہ ہوتا کیونکہ راجا بازار اور علی پور میں بہت فاصلہ تھا۔ یہاں کا رکشا انجن سے تو چلتا نہیں تھا۔ ہاتھ سے کھینچ کر چلتا تھا۔

کافی آگے جانے کے بعد ایک ٹیکسی نظر آئی۔ اقبال نے ہاتھ سے اشارہ دیا تو وہ رک گئی۔ اقبال ہی نے سکھ ڈرائیور سے کہا۔ ''سردار جی، راجا بازار چلنا ہے۔''

''او جی، بیٹھو جی، جہاں کہو گے، اتار دیں گے۔'' اس نے میٹر ڈاؤن کرتے ہوئے جواب دیا۔

ٹیکسی بھاگنے لگی تھی۔ میں نے سیٹ کی پشت سے پیٹھ لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ بند آنکھوں میں عادل اور اس کی بیوی کا چہرہ نظر آنے لگا تھا۔ اس غریب کی موت کا مجھے بہت دکھ تھا۔ اب رشیدہ کا کیا ہو گا، یہ فکر بھی ستانے لگی تھی کہ وہ کس کے ساتھ رہے گی، کہاں جائے گی؟

ابھی ہم سینٹرل ایونیو تک پہنچے تھے کہ ٹریفک جام نظر آیا۔ عام طور پر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ جب سے یہاں آیا تھا، پہلی بار ٹریفک جام سے پالا پڑا تھا۔ یوں تو یہ شہر سیاست کا اکھاڑہ نظر آیا تھا۔ آئے دن جلسے جلوس نظر آتے تھے۔ جس سڑک پر بھی نکل جاؤ، کوئی نہ کوئی جلوس سرخ پرچم اٹھائے، نعرہ بازی کرتا ضرور نظر آ جاتا تھا مگر یہ جلوس فٹ پاتھ سے ہوتا ہوا گزرتا۔ ٹریفک میں خلل ڈالنے سے گریز کرتا۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ کوئی جلوس سڑک پر آ کر خلل ڈالتا۔ شاید کوئی بڑی پارٹی جھنڈے اٹھا کر آ گئی ہو، میں یہی سوچ رہا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نیچے اتر گیا پھر کچھ دیر بعد ہنستا ہوا لوٹا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے سردار جی، ٹریفک کیوں رکی ہوئی ہے؟''

''او جی، سانڈ جی مہاراج کو غصہ آ گیا ہے، اسی نے ٹریفک روک دی ہے۔'' وہ ہنسی روکتے ہوئے بولا۔

''سانڈ نے؟ میں سمجھا نہیں۔'' میرے لہجے میں حیرت تھی۔

''او جی، آپ تو جانتے ہو، یہ مارواڑی سیٹھ غریبوں کا خون چوس چوس کر بھی دھرم کھاتا کھولے رکھتے ہیں۔ پُن (ثواب) کے لیے سانڈ کو آزاد کرتے ہیں اسی لیے وہ اِدھر اُدھر اینٹھتا پھرتا ہے۔''

"تو کیا کسی گاڑی کے نیچے آ گیا؟"

"ارے بادشاہو، یہ گاڑی کے نیچے کب آتے ہیں، ہاں، گاڑی الٹ ضرور دیتے ہیں۔ ہوا یہ کہ ایک سانڈ ادھر سے جا رہا تھا اور دوسرا سانڈ اُدھر سے آ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بپھر گئے۔ گھمسان کا رن پڑا ہے۔ گاڑیاں چھوڑ چھوڑ کر لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ کسی میں ہمت نہیں ہے کہ انہیں روکے اسی لیے سب فائر بریگیڈ والوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہیں صرف پانی کی دھار مار کر الگ کیا جا سکتا ہے۔"

اس اطلاع پر مجھے عادل کی کہی بات یاد آ گئی۔ اس نے سانڈ دیکھ کر کہا تھا۔ "یہ مارواڑی لوگ غریبوں کا خون چوس کر پُن کمانے کے لیے سانڈ کو کھلاتے ہیں اور جب یہ سانڈ کسی مسلم محلے میں گھس آئے تو ہم اسے کھا جاتے ہیں۔"

تقریباً آدھا گھنٹے میں دمکل والوں پانی کی دھار مار کر لڑائی ختم کرائی اور ٹریفک رَواں دَواں ہوئی۔ ٹریفک جام میں پھنسی ہماری ٹیکسی آگے بڑھی۔ سیالدہ اسٹیشن کے سامنے سے گزرتی ہوئی راجا بازار پہنچی۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی وہاں گہما گہمی عروج پر تھی۔ اقبال نے ٹیکسی والے کو داہنی جانب مڑنے کو کہا۔ کچھ آگے جا کر ٹیکسی رک گئی۔

نیچے اتر کر میں نے میٹر دیکھا اور کرایہ ادا کرنے کے لیے پرس نکالنے لگا۔

اقبال رکا نہیں تھا، اترتے ہی سیدھا اس گلی میں داخل ہو گیا تھا جس گلی میں عادل کا گھر تھا۔ اس گلی کے سامنے پولیس کی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کئی پر افسران کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی، گویا بڑے بڑے افسر آئے ہوئے تھے۔ میں نے چھٹا واپس لے کر جیب میں رکھا اور ابھی گلی میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ گلفام کا دستِ راست کالا چان آتا نظر آیا۔ اس کی چال میں تیزی تھی۔ وہ دوڑنے کی حد تک تیز چل رہا تھا پھر وہ جیسے ہی میرے نزدیک پہنچا، سرگوشی میں بولا۔

"آگے نہ جائیں، فوراً مڑ جائیں۔"

اس کے انداز اور لہجے نے مجھے ہوشیار کر دیا اور میں فوراً ہی مڑ گیا۔ واپس سڑک پر پہنچا۔ اتنی دیر میں کالا چان ایک ٹیکسی روک چکا تھا۔ اس نے پچھلا دروازہ کھولا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر خود بھی اندر آ گیا۔

اس کے بیٹھتے ہی ٹیکسی چل پڑی۔ کچھ دور جانے کے بعد کالا چان بولا۔ "پولیس کا بڑا افسر آیا ہے۔ وہ سب بول رہا تھا کہ آپ کو پیش کیا جائے۔"

"تو انہیں کیا کہہ کر مطمئن کیا گیا؟"

"بھائی بولے کہ آپ کل سے لوٹے نہیں، کہاں ہیں، کسی کو بتایا نہیں؟"

"مجھے کس جرم میں ملوث کیا گیا ہے؟"

"یہ بھائی بتائیں گے۔ میرے لیے صرف اتنا حکم تھا کہ میں آپ کو علی پور پہنچا دوں۔"

"مگر پولیس والے تو عادل کے گھر قتل کے بارے میں تحقیق کرنے آئے ہوں گے؟"

"ہاں، وہ اسی لیے آئے تھے۔"

"تو کیا وہ قتل میرے حساب میں ڈال رہے ہیں؟"

"نہیں، اُن کو آپ پر شک ہے، وہی شک جو یہاں کے تمام مسلمانوں پر کیا جاتا ہے یعنی پاکستانی ایجنٹ......" اس کے لہجے سے نفرت ہویدا تھی۔ اس کا درد میں سمجھ رہا تھا، صرف ہندو تنظیمیں ہی نہیں، عام ہندو بھی مسلمانوں سے کھل کر نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ صاف صاف کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنا حصہ مانگا، انہیں دے دیا۔ اب اُن کا یہاں کیا کام؟ اس کے علاوہ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مسلمانوں کو معاشی طور پر کمزور رکھا جاتا ہے۔ جس شہر کے بھی مسلمان تھوڑی سی ترقی کرتے ہیں، وہاں ہندو مسلم فساد کرا دیا جاتا ہے اور فساد کی آڑ میں گھروں کے گھر لوٹ لیے جاتے ہیں۔ فساد کے خوف سے مسلمان اپنے علاقے سے باہر نہیں نکلتے۔ نتیجتاً ترقی کی دوڑ میں پیچھے چھوٹتے جا رہے ہیں۔ تپلی تپلی گلیوں میں بڑے بڑے مسلمان عہدے دار رہنے پر مجبور ہیں۔ معاشی قتل کا شکار مسلمان غریب سے غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔"

"کس سوچ میں ہیں؟" کالا چان نے پوچھا تو میں چونک گیا۔ خیالات کے تانے بانے بکھر گئے۔

"میں سوچ رہا ہوں، بیٹھے بٹھائے یہ کیسی مصیبت آ پڑی؟"

"بھائی! یہ تو ہم مسلمانوں کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔ وہ دِلی والا سید شہاب الدین صحیح کہتا ہے، ایک دم فسٹ کلاس نیتا (لیڈر) ہے۔ وہ کہتا ہے، مسلمانوں کو جبردستی (زبردستی) ستایا جاتا ہے۔ پر اُین سالا مسلمان لوگ پھر بھی جاگنے کو تیار نہیں۔"

"جاگ کر بھی کیا کر لیں گے؟ عنانِ حکومت تو انہی لوگوں کے پاس ہے۔"

"اپنا حک (حق) تو مانگ سکتے ہیں۔ اپنا کلیم الدین شمس بھی یہی کہتا ہے۔ اپنا حک مانگو

مگر اُپن لوگ کھالی (خالی) آپس میں لڑے گا۔ کسی کو کچھ نہیں بولے گا۔ دشمن کو بھی دوس (دوست) سمجھے گا۔"

ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اندر سے جلا بھنا بیٹھا ہے۔ کاش، میرے ہاتھ وسیع ہوتے...... اس آگ کو میں جوالہ مکھی بنا سکتا مگر اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے؟ میں تو خود پناہ کی تلاش میں بھٹک رہا تھا اس لیے خاموشی سے ٹیکسی کی سیٹ سے سر ٹکائے خیالوں میں ڈوبتا ابھرتا رہا۔

ٹیکسی سفر طے کرتی ہوئی علی پور پہنچ گئی۔ مجھے علی پور کے اس بنگلے میں پہنچا کر کالا چان لوٹ گیا۔ اس کے جاتے ہی ریکھا سر پر سوار ہوگئی کہ وہاں یہ سب کیسے ہوا، جلدی بتائیں۔

میں نے کہا۔ "اس وقت مجھے آرام کی ضرورت ہے، مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

"تم مرد ہو کر ٹوٹ رہے ہو جبکہ وہ لوگ تمہارے رشتے دار بھی نہ تھے۔ میری طرف دیکھو، میں نے اپنے بھرے پُرے گھر کو قتل ہوتے دیکھا اور ماضی کی قبر میں سب کو دفن کر دیا۔ بھگوان نے اسی لیے تو یادداشت کا خانہ چھوٹا رکھا ہے کہ لوگ واقعے کو جلد بھلا دیں، ہر غم کو بھلا دینا ہی عقل مندی ہے۔"

"میں دوسرے رخ پر سوچ رہا ہوں۔ عادل سے کسی کی کیا دشمنی تھی، وہ بے چارہ میری وجہ سے مارا گیا۔" میں نے دکھی دل سے جواب دیا۔

"غلط، بالکل غلط۔ ابو میاں کی اس سے پرانی دشمنی تھی۔ وہ تو اس کی بیوی کو بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔ تم نے تو اس کی لڑائی لڑی ہے اس لیے اپنے ضمیر پر بوجھ مت ڈالو، اِدھر اُدھر کی باتیں کرو تا کہ عادل کا واقعہ بھول سکو۔"

"چلو، تمہاری باتیں مان لیتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ہم جس جگہ کھڑے ہوئے ہیں، اس کا نام مسلمانوں کے نام پر کیوں ہے جبکہ اس علاقے میں مسلمانوں کی کوئی بستی بھی نہیں ہے؟"

"ہمارے سلیبس میں تھا کہ کلکتے کا پرانا نام علی پور ہے، نواب سراج الدولہ کے باپ علی وردی خان کے نام پر۔ اُس وقت شہر بس یہیں تک محدود تھا۔ جب انگریزوں نے علی پور پر قبضہ کیا تو شہر کے باہر نئی بستی بسائی اور اس بستی کا نام 'کلکتہ' رکھا۔"

"واہ، تم تو تاریخ پر خوب دسترس رکھتی ہو۔"

"مگر تم پر دسترس پانے کی اتنی کوششوں کے بعد بھی کامیاب نہ ہو سکی۔" اس کی آواز میں حسرت تھی۔

"نہ ہم بھاگے جا رہے ہیں اور نہ تم پھر اتنی جلدی کیا ہے؟"

"کہیں تمہارے دل میں کوئی اور نہ آ بیٹھے، یہی خیال مجھے بھٹکا رہا ہے۔"

"بے فکر رہو، اب کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔ جو آئے گا، بے نیل و مرام واپس جائے گا۔"

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر گیٹ پر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ آواز سنتے ہی میں کھڑکی پر آ گیا۔ باہر جھانک کر دیکھا، ایمبیسیڈر کار کھڑی تھی۔ اس کار میں کون آیا ہے، یہ میں دیکھ نہیں پایا تھا کیونکہ کار خالی تھی۔ اس میں آنے والے اتر کر برآمدے پہ پہنچ چکے تھے اور برآمدہ کھڑکی سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں لوٹ کر ریکھا کے پاس آ بیٹھا، تبھی دروازے پر دستک ہوئی، میں نے کہا۔ "آ جائیں۔"

دروازہ کھلا، سامنے اقبال کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے غم و اندوہ کی تصویر بنی رشیدہ کھڑی تھی۔ میں نے دروازے سے ہٹ کر انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ جب وہ لوگ اندر آ گئے تو میں نے پوچھا۔ "یہ سب ہوا کیسے؟ گلفام کے آدمی مدد کو نہیں آئے؟"

"قاتل تعداد میں چھ تھے۔ وہ لوگ عقبی دروازے سے آئے اور بغیر ایک لمحہ بھی ضائع کیے، انہوں نے باجی اور عادل بھائی کے گلے پر چھری پھیر دی۔ شاید بچی نے شور مچایا تھا اسی لیے اسے بھی ختم کر دیا۔ اگر میں گھر میں موجود رہتی تو میرا بھی یہی حشر ہوتا۔" رشیدہ نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔

"لگتا ہے، اب یہاں سے دانہ پانی اٹھ چکا ہے۔" اقبال بولا۔ "میرا تو خیال ہے کہ یہاں سے چل دینا چاہیے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ گلفام آ جائے تو آگے کی سوچتے ہیں۔"

"آگے کی کیا سوچنا ہے، یہاں سے دِلّی چلتے ہیں، وہاں سے امرتسر پھر وہاں سے لاہور۔ یہی روٹ ہمارے لیے سودمند ہے۔"

"شیرو کو میری حقیقت کا پتا ہے۔ اگر وہ آزاد ہوتا تو کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ وہ نہ صرف روٹ بتاتا بلکہ ہمیں بارڈر تک پہنچانے بھی جاتا۔"

ریکھا ہماری باتیں بغور سن رہی تھی، یقیناً سوچ بھی رہی ہوگی کہ ہم لاہور جانے کا پلان کیوں بنا رہے ہیں؟ وہ تو مجھے آنند کی حیثیت سے جانتی تھی، اپنا بہنوئی سمجھتی تھی اور آنند جلپائی

گوڑی کا تھا۔ اسے لاہور سے کیا مطلب؟"

میرا قیاس غلط نہیں تھا، سو فیصد صحیح اندازہ تھا۔ ریکھا خاموش نہ رہ سکی، اس نے پوچھ لیا۔

"یہ تم لاہور جانے کا پلان کیوں بنا رہے ہو؟ لاہور تو پاکستان میں ہے اور پاکستان محمڈن کا دیش ہے۔"

میں چاہتا تو ایک جملے میں اسے خاموش کر دیتا مگر کچھ سوچ کر میں نے جلد بازی نہیں کی، دھیرے سے بولا۔ "اگر میں یہ کہوں کہ میں مسلمان ہوں تو پھر؟"

"تم مسلمان ہو؟ ہاہاہا آنند بابو، آپ اچھا مذاق کر لیتے ہیں۔ آپ میرے جیجا ہو کر مسلمان کیسے ہو گئے؟"

"جیسے بھی مگر مسلمان ہوں۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ تم واپس چلی جاؤ۔"

"اب یہ ناممکن ہے، سنڈیکیٹ والے مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"تب پھر میرے ساتھ چلو۔"

"تم تو مسلمان ہو گئے ہو۔ تمہارے ساتھ چلنے سے دھرم نشٹ ہو جائے گا۔"

"پھر جہنم میں جاؤ۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"راستہ بتا دو۔" اقبال نے لقمہ دیا تو رشیدہ کے ہونٹوں پر بھی پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ خود اقبال بھی ہنسنے لگا تھا مگر میرے اندر فکر نے پنجے گاڑ دیئے تھے۔ ریکھا کا کیا کروں، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

☆======☆======☆

رشیدہ ہمہ وقت مغموم نظر آتی۔ بہن بہنوئی کی موت نے اس پر خاصا اثر ڈالا تھا۔ میری دلی تمنا تھی کہ وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے اس لیے شگفتہ جملوں سے اسے بہلانے کی کوشش کرتا مگر وہ ہنسنا تو کجا، مسکرانے پر بھی تیار نہیں تھی۔ اس کا یہ مغموم حسن میرے لیے سوہانِ روح بنتا جا رہا تھا۔ میں چاہ کر بھی اس سے کترا نہیں پا رہا تھا جبکہ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے میری بیوی یاد آ جاتی تھی۔ وہ بھی اسی طرح مغموم ہو گی۔ اس بے چاری کو تو یہ بھی پتا نہ ہو گا کہ میں زندہ بھی ہوں کہ مر گیا؟ اس نے اعلیٰ افسران سے رابطہ کیا ہو گا اور انہوں نے کہا ہو گا کہ تمہارا شوہر وطن کی خاطر قربان ہو گیا۔ اس نے چوڑیاں بھی توڑ لی ہوں گی۔ رنڈاپے کی دوشالہ اوڑھ لی ہو گی۔ بیوہ بن کر ایامِ زیست کاٹ رہی ہو گی اور یہاں میں...... میں وقت کاٹ رہا

ہوں۔ دو دو ٹکے کے سڑک چھاپ غنڈوں سے ٹکرا رہا ہوں۔

رات کا سایہ اتر آیا تھا مگر گلفام نہیں پہنچا تھا۔ مجھے فکر کھائے جا رہی تھی کہ اب کیا ہو گا؟ پولیس افسران نے کہیں اسے بھی گرفتار نہ کر لیا ہو۔ ریکھا نے مجھے فکر مند دیکھ کر کہا۔ "چلو، باہر ہوا خوری کر آئیں۔"

ریکھا کی التماس پر میں نے مغموم چہرے والی رشیدہ کی طرف دیکھا پھر بولا۔ "اے، باہر چلو گی؟ تم بھی ہوا خوری کر آؤ۔" میں نے اس کی دل بستگی کا سامان کرنا چاہا۔

"باہر جا کر کیا کروں گی؟" اس نے مرجھائے لہجے میں جواب دیا۔

"بس یوں ہی، آج میرا دل کر رہا ہے کہ تمہارے ساتھ کچھ دیر پارک میں بیٹھ لوں۔ حالات جس ڈگر پر بڑھ رہے ہیں، اس میں پھر ایسا موقع ملے یا نہ ملے۔"

وہ کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اپنی ساڑی کے پلو کو مسلتی رہی۔

"کیا سوچ رہی ہو، چلو، ایک راؤنڈ لگا آتے ہیں۔" کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔ بادلِ ناخواستہ وہ بھی تیار ہو کر آ گئی۔ مجھے اس کے ساتھ جاتے دیکھ ریکھا کی تیوری پر بل آ گئے۔ اس نے کوشش کی کہ وہ بھی ساتھ ہو لے مگر میں نے اسے جھڑک دیا تھا کہ وہ گھر میں رہے۔

اسے گرم لہجے میں جواب دیتے دیکھ رشیدہ کے چہرے پر چمک آ گئی تھی۔ ایک انار، دو بیمار والی کیفیت تھی۔ دونوں میں سرد جنگ کی کیفیت تھی۔ ایک دوسرے کو دھکیل کر میرے قریب آنے کی کوشش جاری تھی۔

رشیدہ ایک بڑے سانحے سے گزری تھی اس لیے کچھ دبی دبی سی تھی مگر مجھ سے دستبردار نہیں ہوئی تھی اسی لیے تو ریکھا کو ڈانٹتے دیکھ کر خوش ہو گئی تھی حالانکہ مجھے وہ منظر بھی یاد تھا جب اس نے جم کر ریکھا کی کھنچائی کی تھی۔ دونوں میں دھواں دھار تو تکار ہوئی تھی اور مجھے مداخلت کرنا پڑی تھی۔ اس دن مجھے تسلیم کرنا پڑا تھا کہ واقعی کسی نے سچ کہا ہے کہ عورت کی زبان غسلِ آخر تک چلتی رہتی ہے۔ اس دن بھی دونوں کی زبان چلی تھی۔ اس وقت بھی رشیدہ کے چہرے پر ایسی ہی چمک آ گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ ریکھا کو نیچا دکھانے کے لیے ہی میرے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئی تھی۔

اپنے غم کو بھلا کر رشیدہ نے چادر لی تھی۔ سیاہ چادر میں اس کا گورا مکھڑا دمک رہا تھا۔ آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا۔ اسے ساتھ لے کر میں باہر نکلا۔ باہر خوب چہل پہل تھی۔ بازار کی

رونق عروج پر تھی۔ اس ہنگامہ پرور زندگی کا حصہ بننے کے لیے ہم بھی اس بھیڑ میں شامل ہوگئے۔ رشیدہ نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ اسی شہر کی تھی۔ اس میٹروپولیٹن شہر کی مگر اس میں بے حیائی کا عنصر نہ تھا اس لیے میرے دل میں گھر کرتی جا رہی تھی۔ یوں بھی وہی لڑکیاں ہم جیسے مردوں کو بھاتی ہیں جن میں حیا ہو۔

رشیدہ مسلمان تھی۔ اس میں حیا تھی۔ حیا جو عورت کا اصل زیور ہے، جو اس کی قدرومنزلت بڑھاتی ہے اسی لیے میں اسے ریکھا پر ترجیح دے رہا تھا۔ چلتے چلتے میں نے پوچھا۔ ”رشیدہ، چاٹ کھاؤ گی؟“

”کھلا دیں۔“ اس نے ایسے کہا جیسے میرا دل رکھنے کو زبردستی تیار ہوئی ہے، یوں بھی وہ ایک غریب گھر کی تھی جہاں دو وقت کی روٹی مشکل سے ملتی ہے، چاٹ کھانا تو عیاشی تھی۔ میں اسے ساتھ لے کر چاٹ کی دکان پر پہنچا۔ وہاں اور بھی عورتیں تھیں جو سوکھے پتوں سے بنے دونہ (پیالے) میں چاٹ لے کر کھا رہی تھیں۔ ہم بھی ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ چاٹ پہنچانے والے لڑکے نے آ کر پوچھا۔ ”ٹوکن لیا؟ اگر نہیں لیا ہے تو کاؤنٹر سے لے لیں۔“

میں نے کاؤنٹر پر پہنچ کر رقم ادا کی اور ٹوکن لے کر رشیدہ کے برابر میں کھڑا ہوگیا۔ وہی لڑکا پھر آیا اور ٹوکن لے کر چلا گیا۔

چاٹ کھاتے ہوئے میں نے غور کیا کہ ایک نوجوان بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ اس کا یوں دیکھنا خالی از علت نہ تھا۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا کہ کہیں اور بھی لوگ تو نہیں ہیں جو مجھے گھیرنا چاہتے ہوں؟ مگر کوئی دوسرا مشتبہ نظر نہ آیا۔ برابر میں کھڑا دہرے بدن کا آدمی لاتعلق نظر آرہا تھا۔ یہ شہر میرے لیے پھندا بنتا جا رہا تھا۔ ایک جھمیلے سے نکلتا تھا کہ دوسرا سامنے آجاتا تھا۔ باریک بینی سے جائزہ لینے کے باوجود کوئی اور نظر نہ آیا اور میں کچھ حد تک مطمئن ہوگیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر اس نے پہل کی تو میں بھی کرارا جواب دوں گا۔ رشیدہ نے جیسے ہی چاٹ ختم کی، میں نے بھی کھانے کی رفتار تیز کر دی۔ چاٹ ختم کر کے دونہ پھینکا اور آگے بڑھ گیا۔ جب سے کلکتہ آیا تھا، صرف ایک بار ٹرام میں سفر کیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے، ادھر ہم ٹرام ڈپو کی طرف بڑھے، اور ادھر ٹرام آ کر کھڑی ہوگئی۔

”چلو، ٹرام کا مزہ لیتے ہیں۔“ میں نے رشیدہ سے کہا۔

وہ تو منہ میں گھنگھنیاں ڈالے خاموش تھی، جواب دینے کی بجائے میرے ہاتھ کو پکڑ لیا۔

اس کے ہاتھ کا دباؤ بتا رہا تھا کہ وہ میرے خیال سے مطمئن ہے۔ میں نے ٹرام میں قدم رکھ دیا۔ سامنے ہی دو سیٹیں خالی تھیں۔ یہاں کا رواج ہی کچھ اور تھا۔ عورتوں کے لیے ایک بھی مخصوص سیٹ نہ تھی۔ عورت، مرد کو اکٹھا بیٹھنا پڑتا تھا۔ میرے برابر میں اسے بیٹھنا پڑا۔ وہ بدن چرا کر بیٹھی تھی۔ اس طرح کہ اس کا جسم مجھ سے نہ ٹکرا جائے۔ ایسے وقت میں ریکھا یاد آگئی۔ رشیدہ کی جگہ وہ ہوتی تو مجھ پر لد سی جاتی۔ اس کا یوں بیٹھنا مجھے اچھا لگا جبکہ ریکھا کا لد جانا مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ میں نے عادتاً نظریں گھمائیں اور چونک گیا۔ وہی لڑکا گیٹ سے قریب کھڑا تھا۔ اس کی نظریں مجھی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ یہ کون ہے؟ کیا ارادہ رکھتا ہے؟ اسی پر غور کرنے لگا، تبھی میری نظر دو سیٹ آگے بیٹھے شخص پر پڑی۔ اس پر وہی آدمی بیٹھا تھا جو چاٹ والے کی دکان پر میرے ہی برابر میں کھڑا تھا۔ اب مجھے لگا کہ یہ دونوں مل کر مجھے گھیر رہے ہیں۔ میں نے آگے کا سفر مؤخر کر دینا چاہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

ہمارے خیال سے دنیا کی سب سے سُست سواری کا نام ٹرام ہے۔ اتنے دھیرے دھیرے چلتی ہے کہ آدمی باآسانی اتر جائے، چڑھ جائے۔ ٹرام سے اترنے کے لیے میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے تھے کہ دہری جسامت والا شخص بھی اپنی سیٹ سے کھڑا ہوگیا۔ رشیدہ بھی میرے ساتھ ساتھ تھی۔ جیسے ہی ٹرام رکی، میں نے رشیدہ کو اترنے کا کہا اور نیچے اتر گیا۔ رشیدہ نیچے اتری، اس کے بعد وہ موٹا اترا۔ گیٹ پر کھڑا نوجوان بھی نیچے اتر گیا تھا۔

ٹرام سے اتر کر میں نے رشیدہ سے پوچھا۔ ”یہ کون سا علاقہ ہے، کیا تم پہچانتی ہو؟“

”ہاں، یہ ٹالی گنج ہے۔“ رشیدہ نے جواب دیا۔ کافی آگے جانے کے بعد ایک پارک نظر آیا جو ایک خوب صورت باغیچے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ جگہ جگہ اونچی اونچی جھاڑیوں کی باڑھ تھی۔ باڑھ لگانے والے نے بہت محنت کی تھی۔ دو فٹ چوڑی اور بارہ، پندرہ فٹ لمبی باڑھ پھر اس کو کراس کرتی اتنی ہی لمبی چوڑی دوسری باڑھ۔ عجیب سی بھول بھلیاں بنی ہوئی تھیں۔ درمیان میں پتھریلی سڑک، ایسی سڑک کہ اس پر گزرنے والا نظر بھی آئے اور چھپا بھی رہے۔

رشیدہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ ہم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ٹہلنے کے انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ باڑھ اسی مقصد کے لیے بنائی گئی تھی کہ لوگ ٹہلنے کا شوق پورا کریں۔ ہم آگے بڑھتے بڑھتے داہنی جانب مڑ گئے تاکہ پھر ایک چکر لگا لیں مگر مڑتے ہی ٹھٹک گئے۔ یکایک ہی وہ سامنے آگیا، وہی نوجوان جو تمام راستے ہمارے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ شاید وہ باڑھ

کی وجہ سے مجھے دیکھ نہیں پایا تھا اسی لیے سامنے آ گیا تھا مگر جس تیزی سے وہ سامنے آیا تھا، اسی تیزی سے مڑا بھی تھا اور بائیں جانب کی جھاڑیوں میں گم ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی رفتار بڑھادی تھی اور اسی طرف مڑ گیا تھا۔

ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ اکا دکا جوڑے اِدھر اُدھر بیٹھے نظر آئے، وہ بھی اس طرح کہ ایک نظر میں دکھائی نہ دیں۔ ان کا جائزہ لیتا ہوا میں جیسے ہی مڑا، میرے سامنے وہ موٹا آ گیا جسے میں نے چاٹ کی دکان پر اور ٹرام میں بھی دیکھا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور پھرتی سے مڑ گیا تھا۔ جن دونوں پر تعاقب کا شبہہ تھا، وہ دونوں ہی مجھ سے کترا رہے تھے، گویا مجھے گھیرنے کے لیے انہیں کچھ اور آدمیوں کا انتظار تھا۔ کچھ اور لوگ آئیں، اس سے پہلے مجھے یہاں سے فرار ہو جانا چاہیے، میرے دل نے مشورہ دیا اور میں نے پارک سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا لیکن فیصلے پر عمل درآمد کا موقع نہیں ملا۔

اچانک ہی میرے عقب میں آہٹ ابھری تھی اور میں پھرتی سے مڑا تھا۔ میرے عقب میں دو افراد بڑھے آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو وہی نوجوان تھا جبکہ دوسرا پہلی بار دکھائی دیا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں استرے تھے۔ نوجوان نے مجھے مڑتے دیکھ تیز آواز میں بولا۔

''اگر تم واقعی سمجھ دار آدمی ہو تو ہماری ہدایت پر عمل کرو۔ سب سے پہلے جیب میں جو اسلحہ ہے، اسے پھینک دو۔''

میں نہتا تھا، اس کا اظہار الفاظ میں کر دیا جسے سن کر وہ بولا۔ ''کوئی بھی چالاکی تمہارے لیے بے مقصد ثابت ہوگی۔ اپنے ہاتھ بلند کرو......'' اس بار اس کی آواز میں بے پناہ سختی تھی۔ دوسرا شخص لمبے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا اور خاصا خطرناک معلوم ہوتا تھا۔

میں ایک لمحے تک سوچتا رہا اور اس کے بعد ہاتھ بلند کر دیئے۔ اب صورتِ حال سے سمجھوتہ کرنے کے علاوہ کوئی طریقۂ کار نہیں تھا۔

''اچھے بچے ہو، اب یوں کرو کہ پارک سے نکل کر ایمپیسیڈر کی طرف مڑو اور چلتے رہو لیکن خبردار، ابھی ہم نے تمہاری تلاشی نہیں لی ہے۔ اگر تمہاری جیب میں کوئی ہتھیار ہے تو اسے نکالنے کی کوشش مت کرنا۔'' یہ لمبے قد والے کا حکم تھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور باہر کی سمت بڑھنے لگا۔ یوں بھی رشیدہ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے میں فوراً کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ لمحات میرے لیے سوچنے کے لمحات تھے۔

اپنے آپ کو ان کی تحویل میں دے دوں یا پھر ان کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کروں، دونوں میں سے کون سی راہ بہتر ہوگی؟ تبھی دماغ نے مشورہ دیا، کسی کے چنگل میں پھنس جانا مناسب نہیں ہے مگر کیسے پیچھا چھوٹے گا؟ ذہن الجھ سا گیا اور فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا۔

وہ لوگ میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے اور شاید اس دوران میرے بارے میں یہ اندازہ لگانے لگے تھے کہ میں ایک بزدل آدمی ہوں اور خاموشی سے ان کے احکامات پر عمل کروں گا۔ یہ بہتر موقع تھا کہ میں انہیں ڈاج دے دوں، چنانچہ میں نے ایک لمحے کے لیے حالات کا تجزیہ کیا۔ وہ لوگ آہستہ آہستہ اپنا فاصلہ کم کر رہے تھے اور اب مجھ سے اتنے پیچھے تھے کہ اگر میں ایک الٹی چھلانگ لگاتا تو ان تک پہنچ جاتا۔ ان کے ہاتھوں میں دبے ہوئے استرے بھی بے پروائی کے انداز میں پکڑے ہوئے تھے اور وہ باآسانی مار کھا سکتے تھے۔ اب پارک کا گیٹ قریب تھا کہ اچانک میں نے اپنے بدن کو تولا اور الٹی چھلانگ لگا دی۔ میں اس شخص پر جا پڑا جو نسبتاً آگے تھا، نوجوان اس سے پیچھے تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں اس کے شانے پر رکا اور دوسرے لمحے میں نے ایک زوردار لات اس کے دائیں ہاتھ پر لگائی جس میں استرا تھا۔

چونکہ میرا یہ عمل غیر متوقع اور انتہائی سخت تھا اس لیے وہ کچھ نہ سمجھ سکا اور نہ صرف میری لات بلکہ میرے بقیہ وزن کو بھی برداشت نہ کر سکا اور پتھریلی زمین پر بری طرح گرا۔ میرے پورے بدن کا بوجھ اس وقت اس کی گردن پر تھا۔ چنانچہ اس کا سر اس قوت سے زمین سے ٹکرایا کہ خاصی زوردار آواز ہوئی۔ پیچھے موجود نوجوان جو اس صورتِ حال کو سمجھ نہیں پایا تھا، ہوشیار ہو کر مجھ پر لپکا۔ میں تو کروٹ بدل کر ایک طرف ہو گیا لیکن اس بدبخت کی شامت ہی آ گئی جو اب میری بجائے اپنے ساتھی کے بوجھ تلے دب گیا تھا۔ چونکہ نیچے پتھریلی سڑک تھی جس کے نوکیلے پتھر بھی اسے چبھ رہے ہوں گے، اوپر دو افراد کا بوجھ، نیچے نوک دار پتھر، اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ دوسری چیخ نوجوان کی تھی جس کے سر پر میں نے اٹھتے ہی ٹھوکر ماری تھی۔ پتا نہیں رشیدہ کو کیا سوجھی کہ وہ بھی اس لڑائی میں کود پڑی، اس نے وہیں پڑی ایک اینٹ اٹھائی اور پہلے اس نے اسے ہاتھوں پر تولا پھر اسے اس نوجوان کے سر پر دے ماری۔

سر پر اینٹ پڑے اور سر سلامت رہ جائے، یہ ناممکن سی بات تھی۔ نوجوان کا سر پھٹ گیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ اٹھ بھی نہ سکا۔ بے ہوشی کی بانہوں میں سو گیا۔ یہ صرف چند منٹوں کی کہانی تھی، جس تیزی سے شروع ہوئی تھی، اسی تیزی سے ختم ہوئی تھی۔

دونوں بے ہوش ہو کر زمین پر سیدھے سیدھے پڑے تھے کہ وہی موٹا سامنے آ گیا۔

اسے دیکھ کر میں پھر ہوشیار ہو گیا۔ خود کو تیار کر لیا تھا کہ جیسے ہی وہ حملہ کرے گا، میں اسے بھی ٹکڑی مار کر گرا دوں گا مگر ایسا موقع نہیں آیا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قریب آیا، قریب پہنچتے ہی بولا۔

''جتنی جلدی ہو سکے، یہاں سے نکلو، پارک میں بھگدڑ مچ گئی ہے۔ چوکیدار نے پولیس کو فون کر دیا ہو گا۔ وہ اب پہنچنے ہی والی ہو گی۔''

''مگر تم کون ہو؟ ان کے ساتھی نہیں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، یہ دونوں مجھے گھیر رہے تھے، شاید مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ اپنا تعارف راستے میں کرا دوں گا۔ تمہارے ساتھ لڑکی ہے، اس لیے جلدی باہر نکلو۔''

میں نے اس کا کہا مان لیا اور بھاگنے کی رفتار سے باہر نکل آیا۔ رشیدہ نے میری تقلید کی تھی۔ موٹا مجھ سے پہلے باہر نکلا تھا۔ اس نے ایک ٹیکسی روک لی تھی۔ دروازہ کھول کر اندر بیٹھ چکا تھا اور اب مجھے اندر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے رسک لینے کا تہیہ کر لیا اور اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ راشدہ بھی اندر آ گئی تھی۔

ہمارے بیٹھتے ہی ٹیکسی چل پڑی۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے کہا۔ ''اب بتاؤ، تم کون ہو اور ان سے کیوں بھڑ گئے تھے؟''

''ابتدا انہوں نے کی تھی، ہم لوگ تو سیر کرنے نکلے تھے۔ راستے میں رک کر چاٹ کھانے لگے، تبھی میری نظر اس نوجوان پر پڑی جو مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ رہزن ہے اور مجھے لوٹنا چاہتا ہے اسی لیے سامنے سے آتی ٹرام میں چڑھ گیا۔ وہ اس میں بھی آ گیا پھر میں ٹالی گنج میں اترا تو وہ بھی اتر گیا پھر جب پارک میں پہنچا تو وہاں بھی وہ پہنچ گیا۔''

میری بات ختم ہوتے ہی اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور ٹیکسی والے کو رکنے کا اشارہ دیا۔ ٹیکسی رکتے ہی وہ نیچے اتر گیا پھر کرایہ دیتے ہوئے بولا۔ ''دوست، آؤ جدا ہونے سے پہلے ہم ایک ایک کپ چائے پی لیں۔ وہاں کیبن میں جا کر اپنا حلیہ بھی درست کر لینا۔ بال بکھرے ہوئے اور شرٹ مسلی ہوئی ہے۔ پینٹ پر بھی دھبے نظر آ رہے ہیں۔''

میں نے اس کی پیشکش قبول کر لی اور اس کے ساتھ سامنے والے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ وہ ہمیں ساتھ لے کر ایک فیملی کیبن میں پہنچا۔ ٹیبل کی دوسری طرف میں اور رشیدہ بیٹھ گئے۔

اس نے ہپ پاکٹ سے کنگھی نکال کر دی۔ میں نے جلدی جلدی بال سیدھے کیے پھر شرٹ کی کریز درست کر لیں۔ اتنی دیر میں بیرا چائے اور کچھ اسنیکس لے آیا تھا۔ چائے کا سپ لیتے ہوئے وہ بولا۔ ''کہاں سے آئے ہو؟ کیونکہ بول چال سے یہاں کے نہیں لگتے۔''

''لکھنؤ سے آیا ہوں، محمد حسین نام ہے۔''

''اچھا...... تو محمڈن ہو۔ میرا نام مکل ڈیسائی ہے، سی آئی ڈی افسر ہوں۔ وہ لڑکا جسے تم نے بے ہوش کیا ہے، پلوی کا آدمی ہے۔ پلوی کے بارے میں تحقیق چل رہی ہے۔ ہمیں شک ہے کہ وہ نقلی نوٹ چھاپتا ہے۔ میں اس پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ تم بیچ میں آ گئے۔ تمہارے ساتھ لڑکی تھی اس لیے جلدی نظروں میں آ گئے۔ اسے اتفاق کہوں گا کہ وہ چاٹ والے کی دکان پر پہنچا تو تم وہاں آ گئے۔ جب وہ ٹرام میں چڑھا تو وہاں بھی تم پہنچ گئے۔ وہ پارک میں پہنچا تو تم وہاں بھی موجود تھے اسی لیے اس نے سمجھا ہو گا کہ تم اس کا پیچھا کر رہے ہو جبکہ اس کا تعاقب میں کر رہا تھا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''گویا مغالطے میں اتنا کچھ ہو گیا؟'' میں بھی ہنس کر بولا۔

''اور کیا کہا جا سکتا ہے، ویسے یہ کلکتہ ہے، یہاں قدم قدم پر ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ جب تک یہاں رہو، پوری طرح ہوشیار رہو ورنہ انجانے میں ہی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔'' پھر اس نے رشیدہ کا جائزہ لے کر کہا۔ ''ایسا لگتا ہے، ان کی شکل میری کسی جاننے والی سے ملتی جلتی ہے، دیکھا دیکھا سا چہرہ ہے۔''

''ہو سکتا ہے، ایسا اکثر ہوتا ہے کہ کسی انجان آدمی کو دیکھ کر لگتا ہے کہ کہیں دیکھا ہے۔''

''خیر، یہ فون نمبر رکھ لو، یہاں رہتے ہوئے کبھی میری ضرورت پڑے تو فون کر لینا۔ اگر میں موجود نہ بھی ہوا تو پیغام مجھے مل جائے گا۔'' کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی ہم بھی باہر آ گئے، باہر آ کر ٹیکسی پکڑی اور علی پور پہنچ گئے۔

☆======☆======☆

علی پور کے اس بنگلے میں داخل ہونے تک میں سوچ میں گم رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں جہاں بھی جاتا ہوں، میرے جلو میں ہنگامے پہنچ جاتے ہیں۔ ایسا لگنے لگا ہے کہ میری زندگی کا محور ہنگامہ آرائی ہے۔ اچھا خاصا گلگت میں زندگی گزار رہا تھا کہ فوج میں جانے کی سنک سوار ہوئی۔ فوج میں آیا تو میدانِ جنگ میں ڈیپوٹ کر دیا گیا۔

ایک فوجی کی زندگی کا سب سے بڑا خواب میدانِ جنگ ہوتا ہے مگر مجھے تو جنگ سے اس طرح دور رکھا گیا تھا کہ ایک بھی گولی چلا نہیں پایا تھا اور جب جنگ کا اختتام ہوا تو دشمن ملک کا مہمان تھا، ایسا مہمان جو خود اپنے لیے وبالِ جان بنا ہوا تھا۔ پہلے ہی دن سے زندگی فلمی کہانی بن گئی تھی۔ بغیر شادی کے ایک بیوی کا شوہر اور ایک پلی پلائی بیٹی کا باپ بن گیا تھا۔ اس کے بعد تو زندگی کا ہر لمحہ ہنگامہ پرور ثابت ہونے لگا۔ ابھی بھی جو کچھ ہوا، وہ بھی بھلانے کے قابل نہیں۔

میں سوچ کے گرداب میں غوطہ زن تھا کہ ریکھا کی آواز نے چونکا دیا۔ ''آ گئے؟''

وہ تپی بیٹھی تھی۔ جتنی دیر میں گھر سے باہر رہا تھا، یقیناً وہ پیچ و تاب کھاتی رہی ہو گی۔

''منہ میں کیا گھنگھنیاں ڈال رکھی ہیں؟ بولتے کیوں نہیں ہو؟'' اس نے تقریباً چیخ کر کہا۔

میں نے اس کی ذہنی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ رشیدہ پر نہ پل پڑے۔ رشیدہ ایک بڑے سانحے کا شکار ہے، اتنی مشکلوں سے تو اس کی ذہنی رو کو بدلا ہے۔ کہیں وہ بھی لڑنے پر آمادہ نہ ہو جائے؟ دونوں لڑنے بیٹھ جائیں گی تو میرے لیے مزید مشکلات پیدا ہو جائیں گی، یہی سوچ کر میں نے ریکھا کو منانا چاہا۔ ''کیا بات ہے، اتنی عمدہ ساڑی، یہ جُوڑے میں جوہا پھول، یہ ہاتھوں میں بھر بھر چوڑیاں، یہ چہرے پر غازے کی تہہ، کیا شہر بھر میں

بجلی گرانے کا ارادہ ہے؟''

عورت کو چت کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار تعریفِ حسن ہے، ریکھا بھی فوراً جال میں آ گئی۔ اس نے غصہ بھول کر کہا۔ ''میں اس انتظار میں تھی کہ تم آؤ گے تو میں بھی کچھ دیر کے لیے تمہارے ساتھ سیر کو جاؤں گی۔''

''ایسا کیا، یہی بات میں بھی سوچ رہا تھا۔''

''اسی لیے اتنی دیر میں آئے؟'' اس نے منہ پھلا کر کہا۔

ایسا لگتا تھا جیسے وہ سچ مچ میری بیوی ہو، ایسی بیوی جو شوہر کو انگلیوں پر نچاتی ہو مگر میں جانتے بوجھتے کاسہ لیسی کرنے لگا۔

''تو کیا ہوا، آؤ چلو، کچھ دیر ہر فکر سے آزاد ہو کر باہر سے ہو آتے ہیں۔''

میری بات سن کر اس نے تیکھے انداز میں مجھے گھورا جیسے بہ زبانِ خموشی کہہ رہی ہو، مجھے بے وقوف بنا رہے ہو مگر وہ تو یہی چاہتی تھی، اسی لیے بولی۔ ''پھر دیر کس بات کی؟''

''دیر میں نہیں، تم کر رہی ہو۔'' کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھا۔ بڑھتے ہوئے میری نظر اس کمرے کی طرف اٹھ گئی جس میں رشیدہ کو ٹھہرایا تھا۔ وہ کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے اس طرح سے منہ بنا رکھا تھا جیسے کڑوی گولی منہ میں ہو۔ ان دونوں کی رسہ کشی نے مجھے گھن چکر بنا دیا تھا۔ میں نے جلدی سے نظریں موڑیں اور باہر نکل آیا۔ بنگلے کے پورچ میں پہنچا تھا کہ ریکھا بھی نکل آئی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''وہ تمہاری دلاری نظر نہیں آ رہی، کیا اٹواٹی کھٹواٹی لیے پڑی ہے؟''

''میرے خیال سے وہ اندر ہی ہو گی۔ گولی مارو اسے، چلو، اندھیرا ہو جائے گا۔'' میں نے ایسے انداز میں کہا جیسے اس کے علاوہ میں کسی اور کی طرف دیکھنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔

''مزہ تو اندھیرے میں ہی ہے......'' کہتے ہوئے وہ مجھ سے جُڑ سی گئی۔ اس نے تیز پرفیوم لگا رکھا تھا۔ پرفیوم اچھی چیز ہے، لگانا چاہیے مگر پوری بوتل الٹ لینا بھی مناسب نہیں، مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ میں نے درمیان میں فاصلہ رکھنے کے لیے بازو چھڑانا چاہا مگر وہ چمٹ سی گئی تھی۔ اس کی ہر حرکت پر مجھے لگتا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ بہ حالتِ مجبوری میں خود کو گھسیٹتا ہوا گیٹ سے باہر نکلا۔ شاید میرے چہرے پر ایسا کچھ تھا کہ باہر پہرے کے لیے بیٹھے گلفام کے آدمی مسکراتے نظر آئے۔

سڑک پر آتے ہی میں نے ٹیکسی کے لیے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔

"ایڈن گارڈن چلنا ہے، وہ لورز اسپاٹ ہے، پیار کرنے والے وہیں جاتے ہیں۔" ریکھا نے مجھ پر پورا وزن ڈال کر کہا۔ میرے دل میں گونج سی پیدا ہوئی، میاں جی، آج خیر نہیں، ایڈن گارڈن کیسی جگہ ہے، اس کا اندازہ ہے۔ وہاں یہ کچھ کر نہ بیٹھے، میں اسی خیال میں تھا کہ سامنے سے ٹیکسی آتی نظر آئی۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ دیا۔ نزدیک آ کر رک گئی۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔ "ایڈن گارڈن چلو گے؟"

ٹیکسی والا فوراً راضی ہو گیا، یوں بھی یہاں کی یہ بات مجھے بہت زیادہ پسند آئی تھی کہ ٹیکسی میٹر سے چلتی اور میٹر زیادہ تیز بھی نہیں چلتا تھا پھر جہاں کے لیے کہیں، ڈرائیور فوراً راضی ہو جاتا تھا۔

ہم ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ ٹیکسی چل پڑی مگر میرے ذہن کی گرد کم نہ ہوئی۔ میں کھڑکی سے لگا باہر کا نظارہ کرتے ہوئے بھی سوچ میں غرق رہا۔ باہر زندگی پوری طرح جوان تھی۔ دکانوں پر بھیڑ تھی۔ فٹ پاتھ بھرے ہوئے تھے اور لوگوں کا ریلہ سا چل رہا تھا۔ عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ مجھے یہاں کی ہر سڑک ایسی ہی بھری پُری نظر آئی مگر یہ گہما گہمی زیادہ دور تک پھیلی نظر نہ آئی۔ بازار سے باہر نکلتے ہی بنگلوں کی قطار نظر آئی۔ یہاں لوگ کم کم تھے پھر کچھ آگے جانے کے بعد تو بالکل ویرانہ سا نظر آنے لگا۔ پوش علاقے کی ایک یہ بھی خرابی ہے کہ سڑک پر لوگ نظر نہیں آتے۔

"بس ادھر موڑ کر کھڑی کر دو۔" ریکھا نے کہا۔ "ہم پیدل چلنا چاہتے ہیں۔"

ٹیکسی والے نے حکم مان لیا اور ٹیکسی کھڑی کر دی۔ میں نے کرایہ ادا کیا پھر اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے میرے بازو میں اپنا بازو پھنسا رکھا تھا، یہ اس لیے کہا کہ اس نے میرے بازو میں اپنا بازو ڈال کر جکڑ رکھا تھا، اسی حالت میں ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ یہاں اسٹریٹ لائٹ بھی نسبتاً کم تھی۔ ایسا ماحول محبت کرنے والوں کے لیے آئیڈیل ہوتا ہے اسی لیے وہ مسلسل اپنے بدن کی گرمی کا احساس مجھے کرا رہی تھی۔

ابھی ہم کچھ ہی دور گئے تھے کہ میری نظر سڑک کے ایک موڑ پر ایک عجیب منظر پر پڑی۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ دراصل میں ریکھا کو خوش رکھنے کے لیے دل لگی کی لایعنی گفتگو کر رہا تھا۔ سڑک پر ایک طرح سے سناٹا طاری تھا۔ کبھی کبھی ہی کوئی

گاڑی گزر جاتی تھی۔ اسٹریٹ لائٹ روشن تھی۔ اسی لائٹ میں وہ منظر نظر آیا تھا۔ پہلے میں نے اسے واہمہ سمجھا تھا مگر وہ بصارت کی عدولی نہیں تھی، واقعی وہاں چار آدمی کھڑے تھے۔ ایسے جیسے میرے ہی انتظار میں ہوں۔ ان میں سے دو کو میں پہچان گیا تھا۔ ایک تو وہی تھا جسے عادل کے گھر میں مَیں نے بے ہوش کیا تھا۔ دوسرا وہ تھا جو وکٹر کی قید میں مجھے کھانا دے جایا کرتا تھا۔ دو انجان تھے۔

یہ چار بندے میرے لیے کچھ نہ تھے مگر اس وقت میرے ساتھ ریکھا تھی اور علاقہ بھی انجان تھا۔ جس کسی نے کہا ہے کہ مرد عورت کی وجہ سے بزدل ہو جاتا ہے ٹھیک ہی کہا ہے۔ اس وقت میں بھی خود کو بہت کمزور محسوس کر رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر میری سانس اوپر کی اوپر، نیچے کی نیچے رہ گئی تھی۔ دائیں جانب بس اسٹاپ تھا، اسٹاپ کی بنچ کے نزدیک وہ سب کھڑے تھے۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر ان میں سے ایک خنجر لہراتا ہماری طرف دوڑا۔ خنجر کی جھلک ریکھا نے بھی دیکھ لی تھی کیونکہ اس کی پکڑ میرے بازو پر سخت ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ "ریکھا...... دوڑو......"

اور وہ دوڑنے لگی تھی۔ اس کی وجہ سے میں تیز دوڑ نہیں پا رہا تھا پھر بھی بھاگ رہا تھا۔ میں دانستہ کسی پریشانی میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ ورنہ ان کو روکنا کیا مشکل تھا؟

ہم بھاگتے ہوئے ایک عمارت میں داخل ہو گئے۔ انسان ہی انسان کا سہارا ہوتا ہے۔ ان سے بچنے کے لیے عمارت کے مکینوں کا سہارا مل سکتا تھا مگر یہ خیال بھی خام ثابت ہوا۔ کھلے ہوئے بڑے گیٹ سے اندر آتے ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ عمارت گودام کے طور پر استعمال ہوتی ہو گی کیونکہ تمام دروازے بند نظر آئے، سب کے سب مقفل تھے۔ ہم سیڑھیوں کے نیچے جا کر دبک گئے۔ ہمیں چھپتے ہوئے ایک نوجوان نے دیکھ لیا تھا۔ شاید وہ وہاں کا چوکیدار تھا۔

"کون ہے بے؟" کہتا ہوا ہماری طرف لپکا تھا۔ اس کی وجہ سے ہمیں پناہ گاہ چھوڑنا پڑی۔ ہم باہر نکل آئے۔ اس نے ایک نظر ریکھا پر ڈالی، ریکھا کا چہرہ خوف سے سپید پڑ گیا تھا۔ وہ کچھ کہتا کہ میری نظر اس کے عقب میں پڑی اور میں نے زور سے کہا۔ "بچنا......"

میری آواز پر وہ جھٹکے سے بیٹھ گیا۔ اس کا بیٹھنا اس کی زندگی کی ضمانت بن گیا۔ عقب میں کھڑے شخص نے بجالی چلا دی تھی۔ نیپالیوں کا مخصوص وزنی خنجر اس کے سر کے اوپر سے ہوتا

ہوا پانی کے پائپ پر پڑا اور پائپ میں سوراخ کر گیا۔ سوراخ ہوتے ہی تیز شور کے ساتھ پانی کی دھار خنجر والے کے چہرے پر پڑی اور وہ گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا۔

''آ...... آ...... بچاؤ......'' ریکھا حلق پھاڑ کر چیخی اور سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ اسی دوران دوسرا بھی اندر آ گیا۔ وہ تیزی سے ریکھا کے پیچھے لپکا۔ ریکھا خوف کے عالم میں اتنی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جیسے ہوا میں اڑ رہی ہو۔

نوجوان اس چاقو والے سے گتھم گتھا تھا۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی تھی پھر اس کی طرف لپکا تھا جو ریکھا کو پکڑنے کی کوشش میں تھا۔ چھٹی، ساتویں سیڑھی پر میں نے اسے جا لیا تھا اور ہاتھ بڑھا کر پوری قوت سے اسے نیچے کھینچ لیا تھا۔ وہ لڑھکتا ہوا نیچے گرا تھا اور اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے ایک زوردار لات ماردی۔ وہ لڑھک کر دور جا گرا۔ آگے بڑھنے کا راستہ مسدود پا کر ریکھا دوبارہ نیچے آ رہی تھی۔ تیسری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے ہمت دکھائی اور سیدھا اس شخص پر کود گئی۔ اس کا پیر غنڈے کے چہرے پر پڑا تھا۔ سینڈل کی ہیل سے اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ ریکھا بھی گری تھی۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا تھا اور باہر بھاگنے کو کہا تھا پھر نوجوان کی مدد کے لیے آگے بڑھا تھا مگر وہ میری مدد کا محتاج نہیں رہا تھا۔ خنجر والے نے اس کی شہ رگ کاٹ دی تھی اور اب وہ تڑپ رہا تھا۔ ریکھا باہر نکل چکی تھی اسی لیے میں نے بھی باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔

باہر نکل کر دیکھا، ریکھا کافی آگے جا چکی تھی۔ وہ جی جان لگا کر دوڑ رہی تھی۔ میں نے چیخ کر کہا۔ ''اور تیز دوڑو......''

خود بھی طوفانی رفتار سے دوڑنے لگا تھا۔ کچھ دوری پر دو تین لوگ کھڑے نظر آئے۔ میری ہمت سوا ہو گئی کہ اب وہ قاتل میرا پیچھا چھوڑ دے گا۔ میں ریکھا کے پیچھے مزید تیز دوڑنے لگا مگر اسے اتفاق کہیے یا قسمت کی ستم ظریفی، وہ بھاگتے بھاگتے لڑکھڑا کر گری۔ اس کے گرتے ہی دو تین آدمی اندھیرے سے نکل کر اس کی طرف لپکے۔ مجھ میں اور اس میں ساٹھ ستر میٹر کا فاصلہ تھا۔ اتنا ہی فاصلہ مجھ میں اور اس تعاقب کرنے والوں کے درمیان میں تھا۔ میری نظر ریکھا پر تھی جو شاید بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔ جہاں وہ گری تھی، وہاں ہلکے پاور کا بلب روشن تھا۔ بلب کی روشنی میں، میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ سینٹ جونز ایمبولینس سروس کا بوتھ ہے۔ اسے اٹھانے والوں نے بغیر ایک لمحہ ضائع کیے، اسے ایمبولینس میں ڈالا تھا اور ایمبولینس شور مچاتی

ہوئی دوڑ گئی تھی۔

ریکھا کو کہاں لے جایا جا رہا ہے، یہ پوچھنے کا موقع نہیں تھا۔ خود میری جان خطرے میں تھی اس لیے میں آگے کی طرف دوڑتا چلا گیا تھا۔ اتنا احساس ضرور ہو گیا تھا کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔ اب صرف مجھے قاتل سے بچنا تھا۔ دوڑتے دوڑتے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ قاتل ہنوز تعاقب میں تھا۔ تبھی میرے دل میں ایک اندیشے نے سر ابھارا کہ کہیں ایمبولینس والے بھی وکٹر کے ساتھی نہ ہوں۔ اس خیال نے دہلا دیا تھا مگر میں رکا نہیں، دوڑتا ہی رہا۔

بھاگتے بھاگتے میں ایک چورنگی پر پہنچ گیا تھا۔ وہاں زندگی جاگ رہی تھی۔ کئی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ایک ہوٹل بھی نظر آیا۔ ہوٹل میں بہت سارے لوگ تھے۔ میں نے ہوٹل کے سامنے رک کر دیکھا، پیچھے آنے والا اسی سڑک پر رک گیا تھا۔

شاید وہ بھیڑ میں آنے سے کترا گیا تھا۔

میں کیا کروں؟

کیا اسے گھیروں؟

اس خیال کو عملی جامہ پہناتا کہ پیچھے سے آنے والی ٹیکسی کا ہارن سنائی دیا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا اور پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا پھر ڈرائیور سے کہا۔ ''نزدیک میں جو اسپتال ہے، وہاں لے چلو۔''

ڈرائیور نے شاید مجھے مریض سمجھا اور ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''دل میں تکلیف ہے کیا؟''

''نہیں......'' میں نے مختصراً کہا۔

''پیٹ میں؟''

''نہیں......''

''زخمی ہیں؟''

''نہیں......''

''پھر کیا مرض ہے؟''

''مرض نہیں......'' میں کچھ اور کہتا کہ اس نے بریک دبا دیا۔ سامنے اسپتال کا بورڈ نظر آیا۔ میں نے نیچے اتر کر کرایہ دیا پھر دوڑتا ہوا اسپتال میں داخل ہو گیا۔

اسپتال میں آنے والے اکثر لوگ گھبرائے ہوئے ہوتے ہیں، شاید اسی لیے کسی نے میری تیز رفتاری پر توجہ نہ دی۔ میں سیدھا ریسپشن پر پہنچا۔

''یس، مے آئی ہیلپ یو؟'' ریسپشن پر بیٹھی لڑکی نے شستہ انگریزی میں کہا۔

''کیا ابھی سینٹ جونز ایمبولینس کے ذریعے کوئی مریضہ آئی ہے؟''

''جی نہیں ...... یہ سرکاری نہیں، پرائیویٹ اسپتال ہے۔ آپ نے کیا مریض کو یہاں بھیجا تھا؟''

''جی نہیں، وہ لوگ خود لے گئے ہیں۔''

''تب تو سرکاری اسپتال لے گئے ہوں گے۔''

''سرکاری اسپتال کدھر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سڑک پر نکل کر ڈھائی تین فرلانگ آگے جائیے گا، الٹے ہاتھ پر سڑک مڑے گی، اس پر چلتے چلے جائیے گا۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک اور سڑک اس سڑک کو کراس کرتی ہوئی ملے گی۔ آپ پھر بائیں جانب مڑ جائیے گا۔ اسی سڑک پر گورنمنٹ اسپتال ہے۔''

''تھینکس ......!'' کہہ کر میں واپس ہوا اور بتائی ہوئی سمت میں چلنے لگا۔ آگے بڑھتے ہوئے میں اِدھر اُدھر بھی دیکھتا جا رہا تھا کہ کہیں وہ قاتل اب بھی گھات میں نہ ہو مگر ایسا کوئی مشکوک بندہ نظر نہیں آیا تھا۔

میں تیز تیز قدموں سے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ہدایت کے مطابق سڑک بھی بدلتا جا رہا تھا۔ کافی آگے جانے کے بعد گورنمنٹ اسپتال کا بورڈ نظر آ گیا۔ میں اس اسپتال میں داخل ہوا ہی تھا کہ ہر طرف گھنٹیاں بجنے لگیں۔

گھنٹیاں بجنے کی وجہ مجھے بعد میں پتا چلی، کچھ وہاں کے لوگوں نے بتائی اور کچھ ریکھا نے۔ کہانی کا تسلسل برقرار رکھنے کے لیے وہ باتیں پہلے بتا دوں۔

وہ پیشہ ور قاتل تھا۔ کنائی بشواس نام تھا۔ اتفاقاً ہم اسے نظر آ گئے تھے اور اس نے ہمیں ختم کرنے کا سوچا مگر میں اس کے ہاتھ نہ آیا۔ ریکھا کو اس نے سینٹ جونز کی ایمبولینس میں سوار کراتے دیکھ لیا تھا اس لیے وہ سیدھا اسپتال پہنچا۔ اسپتال میں سوائے اسٹاف کے کوئی بھی بلاوجہ اِدھر اُدھر نہیں گھوم سکتا تھا اس لیے وہ سیدھا ایک ڈاکٹر کے ریسٹ روم میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر اسوتوش اسی روم میں تھے۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی ان کی شہ رگ پر

چھری پھیر دی تھی پھر ان کی لاش کو باتھ روم میں ڈال کر اس نے ان کا سفید کوٹ پہن لیا تھا۔ آنکھوں پر ان کا چشمہ بھی چڑھا لیا تھا پھر اسٹیتھو اسکوپ ہاتھ میں لے کر کمرے سے باہر آ گیا تھا۔ کوٹ اور چشمے کی وجہ سے اس کی شخصیت میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ اس نے کاؤنٹر سے معلوم کر لیا تھا کہ ابھی ایمبولینس سے جو لڑکی آئی ہے، اسے چوتھی منزل کے ایک کمرے میں رکھا گیا ہے۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھا۔ اتفاق سے اس وقت وہاں کوئی ڈاکٹر یا نرس آ جا نہیں رہا تھا ورنہ اس کے لیے مصیبت کھڑی ہو جاتی۔

اس نے لفٹ کا بٹن دبایا مگر لفٹ اوپر تھی اس لیے اسے انتظار کرنا پڑا۔

آدھے منٹ بعد لفٹ نیچے آئی اور دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر چلا گیا پھر اس نے چوتھی منزل کا بٹن دبایا۔ لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا اور وہ ایک جھٹکے سے اوپر اٹھی مگر فوراً ہی رک گئی۔ اس نے پینل بورڈ کی طرف دیکھا۔ 2 کا ہندسہ روشن تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے دوسری منزل پر کسی نے روکا تھا۔

دروازہ کھلا تو غنڈے کے بقول اس کے اعصاب میں کھنچاؤ پیدا ہونے لگا۔ اگر آنے والا مزاحمت کرتا تو اسے بھی ٹھکانے لگانا ضروری تھا مگر داخل ہونے والی ایک نرس تھی، خوب موٹی تازی نرس۔ اس کے آتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔

وہ نرس باتونی معلوم ہوتی تھی، وہ بڑبڑا رہی تھی۔ ''جان مصیبت میں آ گئی ہے، جسے دیکھو، معائنہ کرانے چلا آ رہا ہے۔ سفارش نے گویا گھر دیکھ لیا ہے۔ جو آتا ہے، کسی نہ کسی منتری (وزیر) کا آدمی ہوتا ہے۔''

نرس کی بڑبڑاہٹ اسے ناگوار لگ رہی تھی۔ اس کے دل میں آیا کہ وہ نرس کی زبان کاٹ کر پھینک دے۔ جیب میں رکھے دودھاری خنجر کے دستے پر اس کی پکڑ مضبوط ہو گئی تھی مگر دو منزل بعد لفٹ رکی تو وہ نرس اتر گئی اور کنائی نے اطمینان کی سانس لی مگر اترنے سے احتراز کیا۔ وہ نرس کو کسی شک وشبہ کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ چھٹی منزل پر لفٹ رکی تو وہ باہر آ گیا۔ اس نے اسی منزل کا بٹن دبایا تھا۔ وہ لفٹ سے باہر آ گیا۔

وہ نرسنگ فلور تھا۔ وہاں بہت سی چھوٹی چھوٹی ٹرالیاں رکھی تھیں۔ سامنے ہی نرسوں کا کمرا تھا۔ وہاں تک جانا خطرے سے خالی نہ تھا اس لیے اس نے قطار میں سے ایک ٹرالی نکالی اور دوبارہ لفٹ میں سوار ہو گیا۔

وہ چند منٹ بعد چوتھے فلور پر تھا۔ بائیں جانب چار کمرے دکھائی دیئے۔ اسے جس کی تلاش تھی، وہ انہی میں سے کسی ایک میں تھی۔ وہ ابھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ کدھر جائے، تبھی کمرا نمبر ایک کا دروازہ کھلا اور ہیڈ نرس باہر آئی۔ وہ یقیناً وہاں مریضوں کا معائنہ کر رہی تھی اور اس کے وہاں موجود ہونے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ نرس کی نظریں اس سے چار ہوئیں تو اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔

”ایمرجنسی۔“ اس نے نرس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نمبر چار نے بلایا ہے۔“ اور وہ چار نمبر کمرے کی طرف بڑھ گیا پھر چار کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اتفاق سے وہ کمرہ خالی تھا اور وہاں اس وقت کوئی مریض نہیں تھا۔ اس نے دروازے میں درز پیدا کی اور اس سے نرس کو دیکھنے لگا۔ وہ سیڑھیوں کی طرف جا رہی تھی۔ وہ لپک کر تیسرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کمرے میں ایک بوڑھی عورت بستر پر دراز تھی۔ وہ کوئی اور ہے یہ دیکھ کر وہ واپس مڑا پھر دو نمبر کمرے میں داخل ہوا۔ بستر خالی تھا۔ ابھی وہ کھڑا کمرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ باتھ روم کا دروازہ کھلا اور ریکھا باہر آئی۔ ریکھا نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے چیخ ماری اور واپس باتھ روم میں داخل ہو گئی۔ اس نے دروازہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ وہ قاتل اس تک پہنچ گیا اور دروازے کو دھکیلنے لگا۔ دونوں طرف سے زور لگایا جا رہا تھا۔ اندر سے ریکھا قوت لگا رہی تھی اور باہر سے قاتل، پھر اس قاتل نے خنجر نکالا اور دروازے پر مارنے لگا۔ ریکھا مسلسل چیخ رہی تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ خنجر بار بار پلائی وڈ کے دروازے میں سوراخ بنا رہا ہے۔ پھر قاتل نے بھاری بوٹ سے ٹھوکر مارنا شروع کر دیا۔ اس کی ٹھوکر سے باتھ روم گونج رہا تھا۔

بے پناہ خوف کی وجہ سے ریکھا دوسرے دروازے کو دیکھ نہیں پائی تھی۔ یہ دو کمروں کے درمیان میں بنا باتھ روم تھا لیکن جیسے ہی اس کا دھیان دوسرے دروازے کی طرف گیا، وہ ادھر لپکی اور اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس دروازے کے باہر کوئی بھاری چیز رکھی تھی اس لیے دروازہ کھل گیا۔ وہ دروازے سے اڑے ہوئے اسٹریچر کے نیچے سے ہو کر نکل گئی اور پھر گلیارے میں نکل گئی۔ وہ بہت تیز دوڑ رہی تھی۔ چکنے فرش پر طوفانی رفتار اس کا پیر رپٹ گیا اور وہ پھسلتی چلی گئی مگر موت کے خوف نے اسے پھر سے کھڑا کر دیا اور وہ دوبارہ دوڑنے لگی، تبھی اس کی نظر الارم پر پڑی اور اس نے سینڈل اتار کر ہاتھ میں لیا پھر زور زور سے شیشے پر مارنے لگی۔ شیشہ ٹوٹتے ہی اس نے بٹن دبا دیا۔ پورا اسپتال الارم سے گونجنے لگا۔ کون سا خطرہ

ہے، یہ جاننے کے لیے تمام کمرے کھل گئے۔ لوگ گلیارے میں نکل آئے۔

میں اسی وقت میں اسپتال میں داخل ہوا تھا اور افراتفری کی وجہ جاننے کے لیے گلیارے میں آ گیا تھا۔ ریکھا کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ تیر کی طرح میری طرف لپکی اور میری گردن میں بانہیں ڈال کر جھول گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اسے اٹھا کر میں ڈیوٹی روم کی طرف بھاگا تھا کہ شور سنائی دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ قاتل کو چھ سات وارڈ بوائے گھیر کر ڈنڈوں سے پیٹ رہے تھے، تبھی ایک شخص دوڑتا ہوا میرے برابر سے گزرا اور ڈیوٹی روم میں داخل ہو گیا۔ جب میں اس کمرے میں داخل ہوا تو وہ ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا ”پیشنٹ کو ایک شخص نے چاقو مارا ہے۔ چاقو والے کو پیشنٹ کے ساتھی مار رہے ہیں۔“ ڈاکٹر اپنی جگہ سے اٹھا تھا کہ میں نے کہا۔ ”سر، پہلے اسے دیکھ لیں۔“

ڈاکٹر نے معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو روم نمبر پرائیویٹ ونگ کی مریضہ ہے، اسے ہوا کیا ہے؟“

”کسی نے اسے خوفزدہ کر دیا ہے۔“

ڈاکٹر نے ضروری انجکشن لگا کر کہا۔ ”انہیں کمرے میں پہنچا دیں۔“ مگر جیسے ہی وہ ہوش میں آئی، میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”بس نکل چلو۔“

پھر ہم دونوں سب کی نظریں بچا کر بغیر ڈسچارج لیے باہر نکل آئے قسمت اچھی تھی خالی ٹیکسی بھی مل گئی۔

”اسے کہتے ہیں قسمت کی خوبی، خوامخواہ کی دوڑ لگ گئی۔“

”یہ سب تمہاری قسمت کا قصور ہے۔“ ریکھا نے تپے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ایسا لگتا ہے حادثات تمہارے تعاقب میں چلتے ہیں۔“

”اسی لیے تو کہتا ہوں، میرا پیچھا چھوڑ دو اور واپس چلی جاؤ۔“ میں نے چٹکی لی۔ ”وکٹر کی طرح پتا نہیں اور کتنے دشمن میری تاک میں ہوں۔“

”اب کیا جانا، اپنا مرنا جینا تو اب تمہارے ساتھ ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں مسلمان ہوں؟“

”پھر بکواس کی تم میرے جی جا (بہنوئی) ہو، محمڈن کہاں سے ہو گئے۔“

"ہوسکتا ہے، میں نے دھرم بدل لیا ہو۔"

"ایسی باتیں کر کے تم میرے جسم میں آگ لگا دیتے ہو، بھگوان کے لیے، اب اس بار کومت چھیڑو۔" کہہ کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

ٹیکسی پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ فاصلہ طے ہوتا رہا اور ہم علی پور پہنچ گئے۔

بنگلے میں پہنچ کر میں سیدھا اپنے روم میں داخل ہوا اور چٹخنی بند کر کے لیٹ گیا۔ ریکھا سے بچنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ مجھے یقین تھا۔ وہ خود بھی بہت تھکی ہوئی ہے اس لیے بستر پر گرتے ہی سو جائے گی مگر تیس فیصد یہ بھی چانس تھا کہ وہ سونے کے لیے میرے کمرے میں گھس آئے مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ بستر پر گرتے ہی میں خود بھی بے خبر ہو گیا۔

اگلی صبح جب آنکھ کھلی تو فون کی گھنٹی کو بجتے ہوئے پایا کسلمندی سے کروٹ بدلتے ہوئے میں نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری جانب گلفام تھا۔ اس نے بغیر سلام دعا کے کہا۔ "تم جتنی جلد ہو سکے، کلکتہ سے نکل جاؤ۔"

"خیریت؟" میں نے پوچھا۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے۔ سی بی آئی والے تمہارے بارے میں تفصیلات معلوم کرتے پھر رہے ہیں۔ میں نے اقبال کو ٹکٹ لانے بھیج دیا ہے۔ تم سیدھا ہاوڑا اسٹیشن پہنچو۔"

"مگر مجھے جانا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بمبئی، بھنڈی بازار میں میرا یار سلمان ہے، وہ تمہیں منزل تک پہنچانے کا انتظام کر دے گا۔ وقت کم ہے۔" کہہ کر اس نے لائن منقطع کر دی۔

میں ایک نئی الجھن میں پھنس گیا تھا۔ سی بی آئی والے پیچھے لگے ہیں تو اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑیں گے۔ ان سے بچے رہنا ہی عقل مندی ہے مگر اس سے بھی اہم مسئلہ تھا لڑکیوں سے چھٹکارہ۔ ان دونوں کا کیا کروں؟ تبھی دماغ نے مشورہ دیا۔

ان دونوں کو لے جا کر سنیما ہال میں بٹھا دوں گا اور درمیان میں کسی بہانے سے باہر آ جاؤں گا۔ جب تک فلم ختم ہوگی وہ لوگ وہیں بیٹھیں رہیں گی۔ اتنی دیر میں، میں کہیں سے کہیں پہنچ جاؤں گا۔ سیدھا ہاوڑا اسٹیشن پہنچوں گا۔ اقبال کو گلفام نے ہاوڑا بھیج ہی دیا ہے، ہم اسٹیشن پر ٹرین پر سوار ہو جائیں گے۔ جاتے جاتے گلفام کو کہہ جائیں گے کہ ان دونوں کو کہیں سیٹ کر دے۔ کسی سے شادی کرا دے۔ ریکھا اگر مسلمان سے چاہے تو مسلمان سے

ورنہ کسی ہندو کو اسے سونپ دے اس لیے 9 سے بارہ والے شو میں چلنے کے لیے کہا وہ تیار ہونے لگی مگر تمام پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی۔

رشیدہ تیار ہو گئی تھی۔ اسے تیار ہونے کے لیے ریکھا سے کپڑے دلوا دیئے تھے۔ ریکھا نے ناک بھنوں چڑھا کر ساڑی بلاؤز دیئے تھے۔ اسے میک اپ کا شوق نہیں تھا اس لیے ذرا کی ذرا دیر میں تیار ہو گئی تھی جبکہ ریکھا ابھی بھی سنگھار میز کے سامنے بیٹھی تھی۔ ابھی میک اپ جاری تھا کہ باہر سے دھماکے کی آواز آئی۔ یہ گولی چلنے کی آواز تھی۔ اسی وقت باہر والے کمرے میں متعین گلفام کے ایک آدمی نے اندر آ کر کہا:

"بھائی! وکٹر کے آدمی اندر گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ لڑکیوں کے ساتھ پچھلی طرف سے نکل جائیں۔ ہمارے پاس نفری کم ہے پھر بھی انہیں الجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

میں نے فرار کی بجائے مقابلے کا کہا تو وہ بولا۔ "نہیں جناب، بھائی کو پہلے ہی اندازہ تھا کہ ایسا کچھ ضرور ہوگا اسی لیے ہم دونوں کو یہاں ٹھہرایا تھا۔ ان کا حکم ہے کہ آپ کو پہلے فرار کرایا جائے کیونکہ آپ کے لیے ٹرین میں سیٹ ریزرو کرادی گئی ہے۔ آپ سیدھا ہاوڑا پہنچیں۔"

اس کے زور دینے پر ہم عقبی دروازے سے لان میں نکلے۔ میرے ساتھ ریکھا اور رشیدہ بھی تھیں۔ ریکھا مطمئن جب کہ رشیدہ گھبرائی ہوئی تھی۔ اسی وقت پھر فائر ہوا تھا۔ یہ فائر کمرے کی کھڑکی سے کیا گیا تھا۔ جواب میں بھی گولیاں چلی تھیں۔ دونوں طرف سے ہینڈ میڈ پستول سے گولیاں چلائی جا رہی تھیں جس سے ایک وقت میں ایک ہی فائر ہوتا ہے۔ مجھے ٹھٹکتے دیکھ ریکھا نے ٹہوکا دیا۔ "کھڑے کیوں ہو گئے، آگے بڑھو۔"

میں نے عقبی دروازہ کھولنے والے سے کہا۔ "تم جا کر مین گیٹ کو سنبھالو، ہم خود نکل جائیں گے۔"

وہ واپس دوڑ گیا۔ ہم عقبی گلی میں نکلے اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھے۔ یہ ایک لمبی گلی تھی۔ گندی گلی جس میں لوگ کچرا پھینکتے ہیں، اس گلی سے ایک عمودی گلی مل رہی تھی۔ ہم اس گلی میں داخل ہو گئے۔ وہ گلی نسبتاً چھوٹی تھی، جلد ہی مرکزی سڑک پر آ گئے۔ اس سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ میں نے ایک خالی ٹیکسی کو اشارہ دیا۔ وہ فوراً نزدیک آ کر رک گئی۔ میں نے پچھلا دروازہ کھول کر ان دونوں کو بٹھایا پھر ڈرائیور کے برابر میں خود بیٹھ گیا۔

"ہاوڑا اسٹیشن۔" میں نے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ایکسی لیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ میں جس مہم کو اتنا اہم سمجھ رہا تھا، وہ اتنی آسانی سے سر ہو جائے گی، اس کی امید نہیں تھی۔ میں ایک بار پھر ایک بڑے خطرے سے نکل آیا تھا۔ یہ بھی میری خوش قسمتی کی دلیل تھی۔ اب ان دونوں کا کیا کروں، یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ایک بار پھر نئے شہر، اجنبی شہر کو منتخب کیا تھا۔ اس شہر میں کتنے دن ٹھہرنا ہے اس کا بھی نہیں تھا جو فیصلہ کرنا تھا جلد کرنا تھا کیونکہ ٹیکسی ہاوڑا برج پر پہنچ چکی تھی۔ پل پار کرتے ہی اسٹیشن آ جاتا۔

دونوں لڑکیاں بھی خاموش تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ دونوں بھی سوچ و فکر کے گرداب میں ہیں۔ میں ان کو مخاطب کرتا کہ ٹیکسی رک گئی۔ میں نے نیچے اتر کر کرایہ ادا کیا اور گیٹ کی طرف بڑھا۔ خاصی گہما گہمی والا ماحول تھا۔ اتنی بھیڑ تھی کہ میلے کا گمان ہو رہا تھا۔ ایسی ہی بھیڑ کو کھوے سے کھوا چھلنا کہتے ہیں۔

میں ان دونوں کو لے کر گیٹ کی طرف بڑھا، تبھی ریکھا نے پوچھا۔ "کیا ہم کسی دوسرے شہر جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"یہاں کیا برائی ہے۔"

"یہاں تمہارے رشتے دار سب میری جان کے پیچھے جو پڑے ہیں اس بارے میں بھی سوچا ہے۔"

"تم اتنے بہادر ہو، اکیلے سب کو ان کی اوقات بتا دیتے ہو۔ پھر ڈرنا کیا۔ جو بھی آئے گا تم اسے مار کر خلاس کر دینا۔"

"خاموشی سے چلو۔" میں نے ڈانٹ کر اسے چپ کر دیا۔

آگے بڑھتے ہوئے میں اِدھر اُدھر کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا، تبھی میری نظر انڈر پاس کے گیٹ پر کھڑے اقبال پر پڑی وہ بھی متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی ہماری نظر ٹکرائیں، وہ مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا اور میرا ہاتھ تھام کر پلیٹ فارم کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

ہم چاروں ویٹنگ روم تک پہنچے۔ اس نے وہاں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی اچھا ہوا کہ آپ روانگی پر آمادہ ہو گئے جس طرح آپ ہر پھڈے میں ٹانگ

اڑا رہے تھے، مجھے لگ رہا تھا کہ آپ ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جائیں گے۔"

میں نے جواب دینے کی بجائے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

"اب مجھے امید ہو چلی ہے کہ اپنی سرزمین پر بخیریت پہنچ جاؤں گا ورنہ تو میں ناامید ہو چلا تھا کہ نہ اتنے پیسے ہوں گے اور نہ میں کبھی پاکستان پہنچ پاؤں گا۔"

ہم دونوں بہت نیچی آواز میں باتیں کر رہے تھے اور دونوں لڑکیاں سر جھکائے بیٹھی تھیں، بالکل خاموش۔ ابھی باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ میں بری طرح چونک گیا۔ ویٹنگ روم کے کھلے ہوئے دروازے سے ڈیسائی داخل ہوا۔ وہی سی آئی ڈی افسر جس سے اس دن ملاقات ہوئی تھی جب میں رشیدہ کے ساتھ سیر کے لیے نکلا تھا۔

یہ کہاں سے مرنے آ گیا، میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور اب سیدھا میرے پاس آ رہا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملایا اس نے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "واپس لکھنؤ جا رہے ہیں؟ مگر کالکا میل کا ٹائم تو گزر چکا ہے۔ اب تک وہ گاڑی بردوان بھی پاس کر چکی ہوگی۔"

"نہیں، میں آسنسول جا رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"یکا یک یہ پروگرام خیریت تو ہے۔"

"بس پروگرام بن گیا۔ بیگم خوفزدہ ہو گئی ہیں۔" میں نے رشیدہ کی طرف اشارہ کیا۔

"دوسری عورت کون ہے؟ کیا وہ بھی آپ کے ساتھ ہیں؟"

"جی ہاں، وہ میرے دوست کی بیگم ہیں۔" میں نے اقبال کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ محمڈن ہیں؟"

"جی ہاں!"

"مگر ان کی بیوی نے تو ہندوؤں کے انداز میں ساڑی باندھی ہے؟"

"بس سنیما کا اثر ہے۔ کون سا پہناوا کس کا ہے، یہ فرق سنیما والوں نے بالکل مٹا دیا ہے۔"

"ہاں جی، سچ کہتے ہیں۔" کہہ کر وہ برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اقبال سے کہا۔

"چائے لے آتے تو مزہ آ جاتا۔"

اقبال کھڑا ہو گیا۔ ابھی وہ دروازے تک پہنچا تھا کہ میں نے کہا۔ "سنو!" پھر جیب سے

روپے نکالتے ہوئے میں بھی دروازے پر جا پہنچا اور روپے گنتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ "یہ سی آئی ڈی کا بندہ ہے۔ مجھے شک ہے کہ یہ میرا پیچھا کر رہا ہے۔ یہ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم ہے ادھر کم لوگ آتے ہیں۔ میں اسے یہیں بے ہوش کر کے باتھ روم میں بند کر دیتا ہوں۔" پھر اسے روپے تھما کر اپنی سیٹ پر لوٹ آیا۔

ڈیسائی بڑے غور سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "خیریت! اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"نہیں، کچھ نہیں، کچھ سوچ رہا تھا۔" پھر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور باتھ روم کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ میرے لیے نادر موقع تھا، میں بھی کھڑا ہو گیا۔ پھر، میں نے سرگوشی میں ریکھا سے کہا۔ "صورت حال خطرناک ہے، تم دروازے پر پہنچ جاؤ۔ مگر آڑ میں رہنا۔ کسی کو اندر آنے نہیں دینا۔ جو بھی اندر آنا چاہے، اس سے کہنا یہ ریزرو ہے۔"

ریکھا دروازے کی طرف بڑھی اور میں باتھ روم کی طرف۔ ڈیسائی دروازہ بند کرنا چاہتا تھا کہ میں نے پھرتی سے داہنا پیر بڑھا دیا۔ دونوں پلڑے کے درمیان پیر آ جانے سے دروازہ خاک بند ہوتا۔ شاید اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا کیونکہ اس نے دروازہ چھوڑ کر اپنی کمر میں ہاتھ ڈالا تھا کہ میں نے ہاتھ پکڑ کر جھٹکا مارا۔ وہ کھنچ کر مجھ سے ٹکرایا۔ میں نے بائیں ہاتھ کا پنچ اس کے چہرے پر مارا اور تیزی سے اس کے گلے میں بازو ڈال کر کہا میرا پیچھا کیوں کر رہے تھے۔"

"یہ میری ڈیوٹی ہے۔" کہہ کر اس نے پھر کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے دوبارہ خالی ہاتھ سے پنچ مارا۔

"میں اسی طرح مار مار کر تمہاری جان نکال دوں گا۔ سچ سچ بتاؤ، تم میرا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟ یہ تعاقب تمہاری طرف سے تھا یا محکمہ جاتی تھا؟"

وہ کچھ بولنے کی بجائے غصیلی نظروں سے مجھے گھورے جا رہا تھا، تب میں نے مزید دو پنچ رسید کیے۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ چہرے پر کئی نیلے نشان ابھر آئے تھے۔

"اگر اب زبان نہ کھولی تو گلا دبا دوں گا؟" میں نے پہلے ہی اسے گردن میں بازو کا حلقہ بنا کر بے بس کر رکھا تھا۔ ذرا سا دباؤ بڑھایا۔ اس کی سانس رکنے لگی تو وہ آزاد ہونے کے لیے ہاتھ پیر چلانے لگا۔ میں اس کے عقب میں تھا اس لیے وہ کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔ میں نے پھنکارتی ہوئی آواز میں کہا۔ "فٹافٹ بتاؤ ورنہ میں گلا دبا رہا ہوں۔"

اس بار دباؤ بڑھایا تو وہ چلایا۔ "بتا رہا ہوں، ہاتھ ڈھیلا کرو۔"

میں نے تنگ حلقے کو ڈھیلا کر دیا۔ وہ بولا۔ "یہ اتفاق ہے کہ میں اس جعلی نوٹ چلانے والے گروہ کی نگرانی کر رہا تھا اور تم درمیان میں آ گئے۔ تمہارا کیس ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں آ چکا ہے۔ رپورٹ میں تمہاری تصاویر بھی ہیں۔ ایک دن یوں ہی تمہاری فائل دیکھ لی تھی اس لیے تمہیں دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا مگر جب رشیدہ کو دیکھا تو سب کچھ یاد آ گیا لیکن تم نے ایک طرح سے میری لڑائی لڑی تھی اور جس بہادری سے لڑی تھی، وہ قابلِ تعریف تھی اس لیے میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا اور فرار ہونے کا موقع دے دیا کہ جس کے پاس تمہارا کیس ہے، وہ خود سمجھے۔ تمہارا کیس سولیش بھومک کے پاس ہے۔"

"وہ کس رخ پر تفتیش کر رہا ہے؟"

"ہمارے محکمے کو شک ہے کہ تم تخریب کاری کے لیے یہاں آئے ہو۔"

"میرے بارے میں کتنی پیش رفت ہوئی ہے؟"

"کوئی خاص نہیں، تمہارا صحیح نام تک پتا نہیں چل پایا ہے۔ بھومک کے اشارے پر وکٹر تمہارا دشمن بنا ہے۔ یہ تو اتفاق تھا کہ میں ایک ضروری کام سے اسٹیشن آیا تھا کہ تم نظر آ گئے۔ یہاں نظر آنے کا مقصد ہے کہ تم فرار ہو رہے ہو۔ اپنی سروس سے ایماندار ہوں اس لیے میں نے سوچا کہ بھومک کو آگاہ کر دوں۔ یہی سوچ کر وائرلیس کرنے یہاں آیا تھا۔"

مجھے جو پوچھنا تھا پوچھ لیا، اس لیے گلے پر دباؤ بڑھا دیا۔ اسے بیہوش کرنے کے بعد بھی میں مطمئن نہیں تھا۔ کیونکہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بات اتنی اوپر جا چکی ہے۔ یہ شخص بہت گھنا ہے، بہت کچھ بتا کر بہت کچھ چھپا گیا ہوگا۔ اس سے ابھی بہت کچھ اگلوانا ہوگا۔ ہم اس ملک کے قانون کی دلدل میں کتنا دھنس چکے ہیں اس کا اندازہ لگانا بہت ضروری ہے اور اس کا ادراک تبھی ہو سکتا ہے جب ہم اسے نچوڑیں گے۔ اس سے اگلوائیں گے اور اس سے اگلوانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے کسی محفوظ مقام پر لے جا کر اس سے تفتیش کریں۔ پوچھ تاچھ کریں۔

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اسے اسٹیشن سے باہر کیسے نکالا جائے۔ ہاوڑا اسٹیشن بھارت کے ان گنے چنے اسٹیشنوں میں سے ایک ہے جہاں ہمہ وقت اژدھام لگا رہتا ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ اگر رکابی کھینچ کر پھینکی جائے تو دوسروں پر سے پھسلتی ہوئی آخر تک چلی جائے گی۔

اس بھیڑ میں سے ہم اسے کیسے باہر لے جائیں یہ ایک ناممکن سی بات لگ رہی تھی۔ میرا ذہن مسلسل دوڑ رہا تھا مگر کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ تبھی اقبال نے کہا۔ ”سر کیا سوچ رہے ہیں۔ کوئی بھی آ سکتا ہے۔ ہمیں جلد سے جلد ویٹنگ روم کو چھوڑنا ہے۔“

”تمہارا خیال درست ہے۔ ہمیں جلد جلد ویٹنگ روم چھوڑ دینا ہے۔ مگر ہم اکیلے نہیں جائیں گے، اسے بھی ساتھ لے جائیں گے۔“

”کہاں؟ بمبئی؟“ اقبال کے لہجے میں حیرت تھی۔

”نہیں واپس علی پور...... گلفام کی کوٹھی پر۔“

”مگر ہم تو بمبئی جا رہے ہیں۔ سیٹ بھی ریزرو ہو چکی ہے۔“

”تم ریلوے کی سیٹ کے بارے میں سوچ رہے ہو اور میں یہاں کے محکمہ خفیہ کے بارے میں غور کر رہا ہوں جس نے ہمارے لیے کوٹھری ریزرو کر رکھی ہوگی، انتہائی بدبودار کوٹھری۔ جہاں ہم سے انٹروگیشن کیا جائے گا، پہلے اس ریزرویشن کو کینسل کرانا ہوگا تب ہی ہم چین سے اپنے وطن جا سکیں گے ورنہ بمبئی کیا، کہیں بھی ہم چین سے بیٹھ نہیں سکیں گے کیوں کہ محکمہ خفیہ حرکت میں آ چکی ہے۔“

”آپ کو...... آپ کو کیسے پتا؟ اور اگر وہ حرکت میں آ بھی چکی ہے تو بھی وہ ہمیں یہاں، کلکتہ میں ہی ڈھونڈتی رہے گی اور ہم آرام سے بمبئی پہنچ چکے ہوں گے۔“

”یہ کس زمانے کی بات کر رہے ہو۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ جیسے ہی یہ ہوش میں آئے گا اپنے افسران کو اطلاع دے گا اور اس کے افسران دو گھنٹے میں کون کون سی گاڑی یہاں سے نکلی اس پر غور کریں گے اور ان سب گاڑیوں میں ہمیں تلاش کرنے کے لیے راستے میں آنے والے شہروں میں اپنے محکمہ کو الرٹ کر دیں گے۔ ہماری تصویر جاری کر دی جائے گی۔ پچاسوں کی تعداد میں محکمہ کے اہل کار گاڑیوں کی چیکنگ شروع کر دیں گے اور ہم سفر کرتے ہوئے ہی چھاپ لیے جائیں گے۔ اس لیے پہلے اس سے پتا کرنا ہوگا کہ ہمارے بارے میں اس کا محکمہ کیا کیا جان چکا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسے کہیں لے جا کر پوچھ تاچھ کریں۔“

”مگر ہم اسے یہاں سے نکال کر لے نہیں جا سکتے۔ یہ ناممکن سی بات ہے۔“

”ناممکن کو ممکن بنانا ہی عقل مندی ہے۔ سوچو کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نظر آ جائے گا۔“

”آپ ہی غور کریں شاید کوئی راستہ نظر آ جائے۔“ وہ بولا۔

میں نے ایک نظر ڈیسائی کے بے ہوش پڑے جسم پر ڈالی اور پھر اقبال سے کہا ”ریکھا کو بلا کر لاؤ۔“

اقبال باتھ روم سے باہر نکل گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ریکھا بھی تھی۔ وہ حیرت بھرے انداز میں ڈیسائی کے جسم کو دیکھ رہی تھی کہ میں نے کہا۔ ”یہ شخص ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوتا اس لیے میں نے اسے بے ہوش کیا ہے۔ اب اسے یہاں سے باہر نکالنا ہے اور اس کے لیے تمہیں اداکاری کرنا پڑے گی۔“

”کیسی اداکاری؟“ ریکھا نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر گویا سوالیہ نشان ابھر آیا تھا۔

”یہاں سے اسے بیمار بتا کر نکالنا ہے اور اس کے لیے تمہیں رونے کی اداکاری کرنا پڑے گی۔ کر لو گی؟“

”کیوں نہیں!“

”تمہیں روتے ہوئے بَین کرنا ہے کہ تمہارے شوہر پر دل کا دورہ پڑا ہے۔“

”بس میں سمجھ گئی۔“ ریکھا نے سر ہلا کر کہا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ”میں ایسی اداکاری کروں گی کہ اس کی بیوی بھی نہیں کر سکتی۔ ایسا رولا ڈالوں گی کہ سب اسے بھول کر مجھے چپ کرانے میں لگ جائیں گے۔“

”اقبال تم باہر جاؤ۔ پلیٹ فارم کے باہر میں نے سینٹ جونز کی ایمبولینس کھڑی دیکھی تھی۔ ان کو جا کر خبر کرو۔ وہ اسٹریچر لے کر آ جائیں گے۔“ اقبال باہر نکل گیا۔

میں نے گردن باہر نکال کر رشیدہ کو اشارہ کیا کہ وہ بھی آ جائے۔ میرے کہنے پر وہ اندر آ گئی۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ وہ ریکھا کی بہن کا رول ادا کرے اور یہ اس کا شوہر ہے جس پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دونوں کو سمجھانے کے بعد میں نے ریکھا کو اشارہ کر دیا۔ پھر جو ریکھا نے رولا ڈالا، ایسے بَین کرنا شروع کیا کہ ویٹنگ روم کے دروازے پر بھیڑ جمع ہو گئی۔ عورت اگر مشکل میں ہو تو سینکڑوں مددگار نکل آتے ہیں۔ کئی ہمدردوں نے اسے مشورے دینے شروع کر دیا۔ ہر ایک نے کسی نہ کسی اسپتال کا نام بتانا شروع کر دیا۔ اتنے میں سینٹ جونز کے رضاکار اسٹریچر لے کر آ گئے۔ اسٹریچر پر ڈیسائی کو لٹا کر ہم سب باہر آئے۔ ریکھا کا بَین بند ہو کر نہیں دے رہا تھا۔ اس کی چیخ پکار نے بڑی مدد کی اور کسی نے کوئی سوال نہیں کیا اور ہم بہ آسانی باہر نکل آئے۔

باہر آکر اسے اسٹریچر سمیت ایمبولینس پر سوار کرایا۔ میں نے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ سنبھال لی اور باقی سب پیچھے بیٹھے۔ ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی دوڑنے لگی۔ اس کا رخ کلکتہ ہی کی طرف تھا کیوں کہ اس نے ہاؤڑا پل کراس کیا تھا۔ مجھے موقع کی تلاش تھی۔ بھری پُری سڑک پر کچھ کر نہیں سکتا تھا اور اگر ایمبولینس اسپتال پہنچ جاتی تو سارا کھیل بگڑ جاتا۔ جیل مقدر ٹھہرتی۔ مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ اسپتال کتنی دور ہے۔ یہاں کا بس ایک ہی اسپتال دیکھا تھا اور وہ بھی کچھ دیر کے لیے۔ مجھے تو اسپتالوں کے نام تک معلوم نہیں تھے۔ بس میں خالی خالی آنکھوں سے باہر دیکھ رہا تھا کہ ایک علاقہ ویسا نظر آگیا جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”رکو...... ذرا رکنا۔“

ڈرائیور نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اضطراری طور پر اس نے بریک پر دباؤ بڑھا دیا۔ جیسے ہی ایمبولینس رکی میں نے ڈرائیور کی گدی پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح سیٹ پر گرتا چلا گیا۔ میں نے اُسے گود میں اٹھا کر پیچھے پہنچایا۔ اندر سے اقبال نے سہارا دیا اور اسے اسٹریچر کے برابر میں لٹا دیا۔

اقبال آگے آگیا تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی اور اندازے سے گلفام کی کوٹھی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے راستوں کا پتا نہ تھا۔ پھر بھی میں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ تبھی میری نظر ایک بورڈ پر پڑی۔ کیفے ڈیفوڈل۔ اس بورڈ کو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ مجھے یاد آگیا کہ اسی کے سیدھ میں جانے سے میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں اس بنگلے پر پہنچ گیا جہاں گلفام نے مجھے ٹھہرایا تھا۔

ہارن دیتے ہی چوکیدار نے ذیلی کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا تو میں نے کھڑکی سے اپنا سر باہر نکال دیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے گیٹ کھول دیا۔

میں ایمبولینس کو اندر تک لیتا چلا گیا۔ پورچ میں روک کر میں نے اقبال کو آواز دی۔ وہ فوراً اتر کر آگیا۔ اس کے ساتھ مل کر میں نے ڈیسائی کو اتارا اور اندر والے کمرے میں پہنچا دیا۔ چوکیدار پریشانی کے عالم میں بولا۔ ”صاحب جی! آپ تو باحفاظت اسٹیشن کے لیے نکل گئے تھے پھر واپس کیوں آگئے؟“

”بتاؤں گا۔“ کہہ کر میں ایمبولینس کی طرف بڑھ گیا پھر ایمبولینس کو واپس باہر لے آیا اور اسے کافی دور لے جا کر سڑک کنارے کھڑا کر دیا۔

ڈرائیور اندر ہی بے ہوش پڑا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ہوش میں آتے ہی وہ ایمبولینس لے کر چلا جائے گا۔ میں نے سو سو کے دو نوٹ بھی اس کی مٹھی میں پکڑا دیے تاکہ وہ زیادہ پریشان نہ ہو، ایمبولینس کا غلط استعمال ہوا ہے یہ بات اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کی نوکری پر بھی بات آسکتی ہے اس لیے وہ کوشش کرے گا کہ رپورٹ بک میں لکھے گا کہ اس نے مریض کو اسپتال پہنچا دیا۔ ایمبولینس کا کرایہ جمع کرائے گا تو اس کی بات میں وزن آجائے گا اسی لیے دو سو روپے اس کی مٹھی میں رکھ دیے تھے کہ وہ پیسے جمع کرا سکے۔ اس طرح اس سے زیادہ پوچھ تاچھ بھی نہیں ہوتی۔

میں واپس آیا تب بھی ڈیسائی بے ہوش تھا۔ میں نے اقبال کو اشارہ کیا کہ وہ پانی لا کر اس کے چہرے پر مارے۔ وہ پانی لینے جا رہا تھا کہ میں نے پوچھا۔ ”ریکھا اور رشیدہ کہاں ہیں؟“

”وہ دونوں الگ الگ کمروں میں لیٹی ہیں۔“

”ان سے کہہ دو کہ کتنا ہی چیخ پکار مچے وہ باہر نہ آئیں۔“

”جی اچھا۔“ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پانی کا جگ تھا۔ میرے اشارے پر اس نے پانی کے چھینٹے ڈیسائی کے منہ پر مارے۔ دو چار بار کی کوشش کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ”کہو مسٹر ڈیسائی کیا حال ہے؟“

”تم بہت پچھتاؤ گے۔ میرا ڈپارٹمنٹ تمہیں چھوڑے گا نہیں۔“ اس نے پھنکارتی آواز میں کہا۔

”میں تمہیں چھوڑوں گا تب ناں ان کو پتا چلے گا کہ تمہیں میں نے اغوا کیا ہے۔“

”میں حلوا نہیں ہوں۔ یاد رکھو میں سی بی آئی کا افسر ہوں۔ تم پاکستانیوں کی بُو بہت دور سے سونگھ لیتا ہوں۔ ابھی تک تو صرف تم پر نظر رکھے ہوئے تھا مگر اب جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا کر دم لوں گا۔“

”اچھا...... نئی خبر سنائی۔“ میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا اور اس کے بالوں کو مٹھی میں پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ ”ابھی پتا چل جاتا ہے کہ کس میں کتنا ہے دم۔ مجھے تو آزما لیا، اب میں تمہیں آزماتا ہوں میں بھی تو دیکھوں کہ تم بھارتیوں کے اندر کتنا دم ہے۔“

”نئی نئی مار بھول گئے۔ تمہارا ملک تم سے چھین لیا۔ اب اور کیا چاہیے۔“

”تم بنیوں کی تو یہ پرانی عادت ہے۔ پیٹھ پر چھری مارنا تمہارا شوق ہے۔ ٹیپو سلطان ہو یا

نواب سراج الدولہ۔ بہادر شاہ ظفر ہو یا نظام دکن سب کے خلاف تم لوگوں نے سازش کی اور سامنے بھی مسلمان کو کھڑا کر دیا کہ بدنامی ہو تو اس کی ہو، یہاں بھی یہی کیا کہ مکتی باہنی کا نام دے کر اپنی فوجوں کو ہماری سرزمین پر گھسا دیا۔"

"مکتی باہنی تمہارے ہی مسلمان بھائی بند تھے۔"

"صرف نام کو...... اس کے پیچھے تم لوگوں کی ہوس ملک گیری تھی۔ تم لوگوں نے انڈیمان۔ نکوبار۔ حیدر آباد دکن۔ گوا۔ ڈمن۔ ڈیو کتنے ہی علاقوں کے لوگوں سے ان کا وطن چھین لیا۔ اس کے لیے تم لوگوں نے کس کس قسم کی سازشیں کیں یہ بھی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ہمیں ان باتوں سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ جو پوچھ رہا ہوں اس کا سیدھے سیدھے جواب دیتے جاؤ ورنہ وہ حشر کروں گا کہ تمہاری آنے والی نسلیں بھی میرے نام سے کانپتی رہیں گی۔"

"تم کیا سمجھتے ہو میں تمہاری گیدڑ بھبکی میں آ جاؤں گا۔ میں مر تو سکتا ہوں مگر ڈیپارٹمنٹ کا کوئی راز نہیں بتا سکتا۔"

"مت بتاؤ، مجھے بھی وقت برباد کرنے کا شوق نہیں ہے۔" کہہ کر میں نے اقبال کو اشارہ کیا۔ "دوست ذرا مالی والی قینچی تو لے کر آنا، وہی والی جس سے وہ پتے تراشتا ہے۔"

حکم کی دیر تھی وہ باہر نکل گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بڑی سی قینچی تھی۔

گارڈن نائف لے کر میں نے اسے کھولا بند کیا۔ تیز جھنکار سے کمرا گونج اٹھا۔ پھر میں نے ہاتھ کچھ آگے بڑھایا اور اس کے ناک کے پاس لے جا کر دوبارہ بجایا۔ وہ کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ اسے پیچھے ہٹتے دیکھ میں نے کہا۔ "واہ بھارت کے ویر سپوت، ایک بھبکی میں پیچھے ہٹ گئے۔ ابھی تو اس سے تمہاری ناک کاٹنا ہے۔ پھر کان کاٹوں گا پھر آنکھیں نکالوں گا۔ ایک ایک عضو اس وقت تک کاٹوں گا جب تک تم سچ اُگل نہیں دو گے۔"

میرے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ اس کے چہرے پر لمحہ بھر کو خوف کا سایہ سا لہرا گیا مگر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور دبنگ لہجے میں بولا۔ "پھر بھی مجھ سے کچھ اگلوا نہیں سکو گے۔"

"یہی تو دیکھنا ہے کہ تم کتنا تشدد سہہ سکتے ہو۔ میرے سامنے مردے بھی بولنے لگتے ہیں۔ بس دیکھتے جاؤ کہ میں کیسے تم سے ایک ایک بات اگلواتا ہوں۔" کہہ کر میں نے اقبال کی

طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈنڈا لیے کھڑا تھا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ میں عام سا تشدد آزماؤں گا مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ اس پر وہ تمام حربے آزماؤں گا جس کے بارے میں سن رکھا تھا کہ انڈین ایجنٹ آزماتے ہیں۔

میں نے اقبال کو مخاطب کیا۔ "ریکھا اور رشیدہ سے کہہ دو اس کمرے میں کچھ بھی ہو وہ لوگ ادھر نہ آئیں ورنہ خوامخواہ بے ہوش ہو جائیں گی۔" دراصل میں ڈیسائی کو نفسیاتی طور پر مفلوج کر دینا چاہتا تھا تاکہ جب سوال جواب کا وقت آئے تو وہ ٹوٹ چکا ہو۔

"سنو! تم میاں لوگ ہم جیسے لوگوں کو ڈرا نہیں سکتے۔" ڈیسائی میری چال کو شاید سمجھ گیا تھا۔

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا اور قینچی کو اس کے کان کے پاس لے جا کر چلا دیا۔ وہ چاہ کر بھی اپنی چیخ روک نہ سکا حالانکہ میں نے صرف اس کے کان کی لو پر قینچی چلائی تھی یہ اور بات ہے کہ اس کا آدھا کان کٹ گیا۔ خون اچھل اچھل کر اس کے کپڑوں پر گرنے لگا۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اس لیے وہ مچل کر رہ گیا۔ میں نے دوسرے کان کی طرف قینچی بڑھائی اور کہا۔ "اب بھی وقت ہے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔ یہ بات تمہارے دفتر تک نہیں پہنچے گی۔ صرف میں اپنے بچاؤ کے لیے پوچھ رہا ہوں۔ اپنی جان ہلاکت میں مت ڈالو، فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔"

"تم میری جان بھی نکال لو گے پھر بھی میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" وہ اپنی ہٹ پر قائم تھا۔

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔" کہتے ہوئے میں نے قینچی کی نوک اس کے چہرے پر رکھ کر دبا دی۔ ایک لمبا نشان بنتا چلا گیا۔ خون کی ایک اور دھار کپڑے کو رنگین بنانے لگی۔ وہ دانت بھینچ کر درد کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے ایک اور کوشش کی۔ اس دوسرے کان کی لو پر قینچی چلا دی۔ خون بڑی تیزی سے اس کے جسم کو چھوڑ رہا تھا۔ اب تب میں وہ بے ہوش ہو کر گرتا جو مجھے منظور نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اقبال سے کہا کہ وہ پٹی کر دے۔

اقبال نے بورولین لگا کر پٹی باندھ دی۔ اتنی دیر تک میں خاموش بیٹھا اس کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ خونخوار نظروں سے مجھے مسلسل گھورتا رہا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بڑی چمکدار آنکھیں ہیں مگر کچھ دیر کی مہمان ہیں۔ میں پانی پلا پلا کر مارنے کا قائل ہوں۔ زخم

لگاؤں گا پھر مرہم اور پھر زخم۔ اب جو زخم لگے گا اس کا علاج دیسی طریقہ سے کروں گا۔ تم نے سنا ہوگا، پہلے کے زمانے میں لوگ زخم کا علاج مرچوں سے کرتے تھے۔" پھر میں نے اقبال سے کہا کہ وہ باورچی خانہ سے پسی ہوئی مرچ لے آئے۔

اقبال خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے کہا۔" کیوں خود کو ہلاکت میں ڈال رہے ہو۔ وقت کم ہے۔ جتنی جلد زبان کھول دو اتنا ہی اچھا ہے۔"

"میں مر جاؤں گا مگر جھکوں گا نہیں۔" وہ اب تک ہٹ دھرمی پر آمادہ تھا۔

"جیسی تمہاری مرضی......" کہہ کر میں نے اس کی کھوپڑی پر بھاری قینچی کی نوک سے ضرب لگائی۔ اچھا خاصا زخم آیا مگر وہ چیخا نہیں۔ بہت برداشت کرنے والا بندہ تھا۔ میں نے اقبال کو آتا دیکھ اس سے کہا۔" اقبال اسے لٹا دو۔ میں اسے پیروں کی طرف سے چھوٹا کرنا چاہتا ہوں۔"

اقبال نے بغیر ایک لفظ ادا کیے اسے کھینچ کر زمین پر لٹا دیا۔ میں قینچی لے کر اس کے پیروں کی طرف آیا اور قینچی کو کچکچاتے ہوئے اس کی چھوٹی انگلی پر قینچی چلا دی۔ وہ انگلی الگ تو نہیں ہوئی مگر آدھی سے زیادہ کٹ کر لٹک گئی۔ تکلیف سے وہ تڑپ اٹھا۔ میں نے اس پر بس نہیں کیا۔ دوسرے پیر کی انگلی پر بھی قینچی چلا دی۔ دو انگلیاں کٹ چکی تھیں۔ اذیت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ مگر وہ چپکا پڑا تھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ بہت سخت جان ہے۔ اس سے ایسے نمٹنا آسان نہیں ہے۔ میں نے اقبال سے کہا کہ جاؤ کٹی ہوئی مرچیں لے آؤ۔ پھر میں نے سیفٹی ریزر سے بلیڈ نکالا اور کہا۔" اب تو تمہارے فرشتے بھی چیخیں ماریں گے۔" کہہ کر میں نے بلیڈ سے اس کی پیشانی پر لکیر بنائی۔ خون رستا ہوا اس کی آنکھوں میں آ گیا۔ میں نے اسی کے برابر میں ایک اور لکیر بنائی اتنی دیر میں اقبال مرچیں لے آیا تھا۔

"میں آج ساری رات اذیت دیتا رہوں گا۔ دیکھتا ہوں تم کیسے نہیں بتاتے۔"

مرچیں دیکھ کر وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ میں اسے جان سے نہیں ماروں گا مگر اذیت کی انتہا کر دوں گا۔ اس کے اندر شاید ٹوٹ پھوٹ شروع ہو چکی تھی۔ میں جیسے ہی مرچ پاؤڈر لے کر آگے بڑھا وہ جلدی سے بولا۔" پوچھو کیا پوچھنا ہے۔"

"اتنا بتاؤ میرے بارے میں تمہارے محکمے کو کیا رپورٹ دی گئی ہے۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ اس بات کا پتا لگایا جا رہا ہے کہ تم صرف فارن ایکٹ کے مجرم ہو

یا آئی ایس آئی کے ایجنٹ ہو۔"

"اس کے علاوہ؟"

"اور کچھ نہیں۔"

"دو بندے کیمپ سے فرار ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں کیا کہنا ہے؟"

"ان میں سے ایک بندہ مارا گیا اور دوسرا فرار ہو گیا آخری اطلاع آنے تک وہ نیپال بارڈر پر دیکھا گیا۔ نیپال کے راجا بریندرا نے اعلان کر رکھا ہے کہ جو پاکستانی ہمارے یہاں آ جائے گا اسے پناہ مل جائے گی۔ اس لیے ہم لوگوں نے زیادہ تفتیش کی نہیں۔"

"گویا وہ حفاظت سے نیپال پہنچ گیا ہے۔"

"جی ہاں۔"

"دوسرا بندہ کیسے مارا گیا۔ اس سلسلے میں کوئی خبر اخبار میں تو نہیں آئی؟"

"اس کا نام گل خان تھا۔ اسے ہم نے نہیں جی آر پی پولیس نے پکڑا تھا۔ سیالدہ اسٹیشن سے اپر انڈیا ایکسپریس میں سوار ہوتے ہی اسے گھیر لیا تھا۔"

ڈیسائی نے اس کی شہادت کا (میں اسے شہید ہی کہوں گا) جو منظر بیان کیا اسے سن کر میری رگوں میں انگارے بھر گئے۔ میرے دل و دماغ میں ایک آگ سی بھر اٹھی تھی۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیہ کا شکار ہزاروں افراد تھے۔ بے شمار افراد مارے گئے تھے۔ وطن کے نام پر شہید ہونے والوں میں ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگ تھے، فوجی بھی تھے اور سویلین بھی، عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ اردو بولنے والے بھی اور بنگلہ بولنے والے بھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے پوری پوری بستی لاشوں میں تبدیل ہوئی دیکھی تھی۔ گلی سڑی لاشوں سے بھری بستی جنہیں کفن دینے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اردو بولنے والوں کے بچوں کو پیٹ پیٹ کر ختم کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا اور عورتوں کی اجتماعی آبروریزی کی خبریں بھی سنی تھیں۔ صرف پاکستان سے محبت کے جرم میں ان پر مظالم ڈھائے گئے تھے۔ وہ سب اپنی جگہ، گل خان پر جو ظلم ہوا تھا وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ دل دکھ سے بھر اٹھا تھا۔ وہ میرا کوئی نہیں تھا۔ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ مگر اس سے ایک مضبوط رشتہ تھا۔ وہ میرا ہم وطن تھا۔ میرا دینی بھائی تھا۔ اسے ان لوگوں نے کس بے دردی سے شہید کیا۔ ڈیسائی نے جو کچھ بتایا اس کے مطابق میرے ذہن میں ایک فلم سی چلنے لگی تھی۔ جیسے وہ سب کچھ میری نظروں کے سامنے ہو رہا ہے۔

میں دیکھ رہا تھا۔ گل خان اور حکمت نیازی ایک ٹرین میں سفر کر رہے ہیں اور پھر وہ سب کچھ ہو گیا۔ اتنے بھیانک انداز میں کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے جسم میں جوالہ مکھی سا ابلنے لگا۔ میری مٹھیاں بھنچ گئیں اور اس جوش میں وہ سب ہو گیا جو میں کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ آگے بڑھے تھے اور اس نابکار ڈیسائی کی گردن تک پہنچ گئے تھے۔ پھر شکنجہ سا کستا چلا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے کب کی ابل کر باہر آ گئی تھیں پھر بھی میرے ہاتھ اسے چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ اس کے گلے کو دباتے ہی جا رہے تھے۔

میرا یہ روپ شاید میرے ساتھیوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ سب کے چہرے تاریک ہو رہے تھے۔ اقبال کی طرح رشیدہ اور ریکھا کے چہرے کی رنگت بھی اڑ گئی تھی۔ وہ دونوں اقبال کے آواز دینے پر آئی تھیں اور اب سکتے کے عالم میں کھڑی تھیں۔ تبھی اقبال نے پہل کی اور اس نے میری قمیص پکڑ کر جھٹکا دیا۔ اس جھٹکے سے میں ہوش میں آ گیا۔ جھرجھری لے کر اس کے گلے کو چھوڑ دیا۔ ڈیسائی کا جسم میرے قدموں میں کٹے ہوئے شہتیر کی طرح آ گرا۔

اس کا جسم میرے قدموں میں پڑا تھا۔ قتل کر دینا آسان ہے مگر لاش کو ٹھکانے لگانا آسان نہیں۔ اب سوال یہ سامنے آ گیا تھا کہ اس لاش کا کیا کیا جائے۔ اقبال نے کئی بار گلفام کو فون کیا۔ ہر بار ایک ہی جواب ملا کہ وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں ابھی لوٹے نہیں ہیں۔ یہاں اس بنگلے پر صرف چوکیدار تھا۔ وہ بے چارہ کیا کر سکتا تھا۔ اس لیے لاش کو وہیں چھوڑ کر ہم ڈرائننگ روم میں آ گئے۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" اقبال نے سوال کیا۔

"گل خان کے ساتھی کو ڈھونڈیں گے۔ وہ اکیلا ہے۔ پھر کسی بکھیڑے میں نہ پڑ جائے۔" میں نے سانس کی رفتار کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، دراصل اب تک تنفس کی رفتار بے ترتیب تھی۔

"آپ کو شاید یاد نہیں، ڈیسائی نے کیا کہا تھا کہ وہ نیپال پہنچ چکا ہے اس لیے اس کے پیچھے جانے کی بجائے ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" اقبال کو بس وطن پہنچنے کی جلدی تھی۔

"ڈیسائی نے گل خان کی شہادت کا جو منظر سنایا ہے اسے سن کر میرے دل میں وہ آگ بھڑک اٹھی ہے جو تبھی بجھے گی جب میں اس کا بدلہ لوں گا۔"

"خون کا بدلہ خون تو آپ نے پورا کر ہی دیا۔ ڈیسائی کو واصل جہنم کر کے اب اور کیا دس بیس کو ماریں گے؟"

"گل خان کا بدلہ سو پچاس میں بھی پورا نہیں ہو گا۔" یہ کہتے وقت بھی میری نظروں میں ڈیسائی کا بیان کردہ منظر گردش کر رہا تھا۔ ڈیسائی نے بتایا تھا کہ گل خان کو سیالدہ میں ہی پہچان لیا گیا تھا مگر اسے بردوان میں گھیرا گیا۔ جی آر پی کے ساتھ سی بی آئی کا ایک بندہ بھی تھا۔ اسی نے اسے پہچانا تھا۔ نیازی نے بھانپ لیا کہ انہیں گھیرا جا رہا ہے اس لیے وہ چلتی ٹرین میں ایک کمپارٹمنٹ سے دوسرے میں چلا گیا۔ گل خان اس سے پیچھے تھا۔ وہ دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ سپاہیوں نے اسے دبوچ لیا اور وہیں گیٹ پر کھڑے ہو کر سوال جواب ہونے لگا۔ وہ اس سے قبول کرانا چاہتے تھے کہ وہ پاکستانی ہے اور وہ انکاری تھا۔ اس کا لب ولہجہ چغلی کھا رہا تھا مگر وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اسے ٹرین سے لٹکا دو یہ خود قبول لے گا اور انہوں نے اسے رسی سے باندھ کر نیچے لٹکا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اسے اوپر کھینچ لیں گے مگر ٹرین کی اسپیڈ نے گل خان کو نیچے کھینچ لیا۔ وہ رگڑ کھاتا ہوا کئی میل تک گھسٹ گیا اور اسی میں وہ جان ہار گیا۔ اس کی لاش کو انہوں نے جنگل میں ہی بے والی وارث چھوڑ دیا۔ پتا نہیں کفن بھی اسے ملا یا نہیں۔ اسی بے رحمی پر میں بے قابو ہو گیا تھا۔ اس کا بدلہ تو ڈیسائی سے لے لیا تھا۔ مگر دل اب بھی مطمئن نہیں ہوا تھا جب کہ اقبال ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس حالت میں مَیں کیا کروں اس پر غور کر رہا تھا کہ اس نے کہا:

"مگر سر میں اس کے فیور میں نہیں ہوں میرا مشورہ یہ ہے کہ فوراً نکل لیا جائے۔"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔" پہلی بار ریکھا نے گفتگو میں حصہ لیا۔

"ٹھیک ہے جب سب کا یہ فیصلہ ہے تو میں چلنے پر تیار ہوں۔" میں نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

"میرا ایک ہزار سات سو روپے کا نقصان کر کے اب تک تم لوگ یہیں ہو۔" گلفام نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ یقیناً وہ ناراض نہیں تھا۔ یوں بھی اس کے لیے پانچ دس ہزار کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ وہ کلکتہ جیسے بڑے شہر کا ایک بڑا ڈان تھا۔ "ویسے اچھا ہی ہوا کہ تم لوگ ابھی نہیں گئے۔ ایک بڑی خوش خبری ہے۔"

"کون سی خوشخبری؟" اقبال نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر تجسس کا سایہ لہرا رہا تھا۔

"میں نے بالآخر شیرو کو بے داغ رہا کروالیا۔" اس نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔ وہ اپنی اس کامیابی پر بہت خوش نظر آرہا تھا۔

"آپ نے تو کہا تھا کہ اس پر سی ایم آئی کا کارکن ہونے کا الزام ہے اور یہ الزام بہت بڑا ہے کیوں کہ سیمی کے ارکان کشمیر کی آزادی کے لیے جدوجہد کررہے ہیں جو انڈین گورنمنٹ کی نظروں میں وطن سے غداری ہے۔ ٹاڈا کے تحت اسے گرفتار کیا گیا ہے؟" میں نے کہا۔

"عدالت میں مجسٹریٹ کے ٹیبل پر ایک مورتی رکھی ہوتی ہے۔ انصاف کا ترازو تھامے ہوئے عورت جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے۔ سیاہ پٹی۔ گویا قانون کی دیوی کو دکھائی نہیں دیتا۔ اسے دیکھنے کے لیے نظریں چاہیے۔ وہ نور ہے گواہ۔ قانون گواہوں کی نظروں سے انصاف تلاشتا ہے۔ میں نے ایک چھوڑ سات گواہ پیش کردیے جنہوں نے حلف اٹھا کر کہا کہ شیرو بیس سال سے کلکتہ میں ہے اور وہ اسلام کو صرف مذہب مانتا ہے، کٹر پنتھی نہیں ہے۔ مجسٹریٹ بھی اپنا تھا اس نے ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے سارا الزام پولیس پر ڈال دیا کہ وہ شریف شہریوں کو تنگ کرتی ہے۔" گلفام نے پُر جوش انداز میں بتایا۔

"اب وہ کہاں ہے؟"

"اپنے گھر پر ہوگا مگر یہ بتادوں کہ تم لوگ ابھی بھی پولیس کی تفتیش میں ہو۔ اس لیے بمبئی چلے جاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔ وہاں میرا یار ہے جو تمہیں بہ آسانی پاکستان بھجوادے گا۔"

"اندر ایک لاش پڑی ہے اسے کہاں دفن کیا جائے؟ ہم اسی پر غور کررہے تھے۔" میں نے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"لاش ہے؟ کس کی لاش؟" گلفام کے چہرے پر بھی سوال ابھر آیا تھا۔

"ایک سی بی آئی کا بندہ تھا۔"

"گولی ماری ہے؟" گلفام نے سوال کیا۔

"نہیں گلا دبا کر مارا ہے۔ اب پریشان ہیں کہ اس کی لاش کو کہاں چھپائیں۔"

"جیو میرے راجا۔ یہ تو بہت بڑا کام کیا ہے۔ شاید تمہارے علم میں یہ بات نہ ہو کہ پوری دنیا میں بھارت واحد ملک ہے جہاں انسانی ڈھانچے قانونی طور پر بکتے ہیں۔ بھارت میں کلکتہ واحد شہر ہے جہاں یہ کاروبار ہوتا ہے۔ میں ابھی اس کاروبار سے منسلک بندے کو بلاتا ہوں۔ وہ خود آکر لے جائے گا۔"

"مگر وہ لاش ایک افسر کی ہے کہیں کوئی بکھیڑا نہ کھڑا ہوجائے۔" دل کا خدشہ میں زبان پر لے آیا۔

"آدھے گھنٹے سے بھی کم عرصہ میں اس کا گوشت گل جائے گا۔ ہڈیاں تک پالش ہوکر شو کیس میں منتقل ہوجائیں گی۔ میاں یہ کلکتہ ہے یہاں میرے رہتے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" کہہ کر وہ اس کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں ڈیسائی لاش کی صورت میں پڑا تھا۔

☆=======☆=======☆

اب ہمیں پھر سے بمبئی جانے کی تیاری کرنا تھی۔ تاکہ ہم جلد سے جلد اپنی سرزمین پر پہنچ جائیں۔ گلفام نے دوبارہ ہمارے لیے ٹکٹ منگوایا۔ سیٹ ریزرو کرائی اور ہم شام کی گاڑی سے جانے کے لیے دوبارہ ہاوڑا جا پہنچے۔ اس بار گلفام کے مشورہ پر میں نے جناح کیپ لگائی تھی جب کہ اقبال نے رامپوری ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہوسکتا ہے پھر کوئی انٹیلی جینس والا ہمارے پیچھے لگ جائے۔

گلفام کے کئی بندے اسٹیشن تک آئے تھے تاکہ ہمیں سوار کرادیں۔ مگر ان کو حکم تھا کہ وہ صرف دور سے ہم پر نظر رکھیں گے۔

ہم سب پلیٹ فارم نمبر سات پر بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ ہماری باتوں کا محور وطنِ عزیز تھا۔ ریکھا اور رشیدہ دونوں برقعہ میں تھیں۔ ریکھا بار بار سرگوشی میں کہتی۔ "کب اس قید سے رہا کروگے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

بات صحیح تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اسے برقعہ پہننا ہوگا۔ اسی لیے اسے اکتاہٹ ہورہی تھی۔ میں اسے سمجھا ہی رہا تھا کہ گاڑی کا وقت ہوگیا۔ گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے سب کو ساتھ آنے کا اشارہ دیا۔ اقبال نے جاکر بوگی ڈھونڈلی تھی۔

ٹرین کا یہ کمپارٹمنٹ ایک چڑیا گھر تھا۔ بھانت بھانت کے لوگ، بھانت بھانت کی بولیاں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر صوبے سے ایک ایک نمونہ اکٹھا کیا گیا ہے اور انہیں اتحاد کی علامت کے طور پر اس ڈبے میں بھر دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ اظہر من الشمس ہے کہ ہر ایک کے دل میں دوسرے کے لیے نفرت بھری ہے۔ آسام والے بنگالی کو پسند نہیں کرتے۔ بنگالی، ہندی بولنے والوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ ہندی بولنے والے ساؤتھ انڈین سے نفرت کرتے ہیں

اور ساوتھ انڈین تو کھلم کھلا کہتے ہیں "Kick Hindi, love English." مگر اس وقت، یہاں سب کمزور تھے۔ گھر سے دور تھے۔ اپنوں سے الگ تھے اس لیے اپنے آپ میں محصور تھے اور ایک دوسرے کے لیے زبردستی کی مسکراہٹ سجائے تھے۔ برابر والے سے اخلاقاً پوچھ رہے تھے۔ کوئی ضرورت؟

سفر میں ضروریات کی ایک طویل فہرست ہوتی ہے، اس کا حل شکریہ ہے اور لوگ شکریہ کہہ کر منہ موڑ لیتے تھے۔ یہ کوپا سلیپر کا تھا۔ دن کے وقت جنرل مگر رات ہوتے ہی ایک سیٹ ایک آدمی کے نام ہو جاتی۔ ایک پورشن میں چھ سیٹیں تھیں۔ تین ایک طرف کی تین اور دوسری طرف کی ایک۔ ابھی دن باقی تھا اس لیے نیچے کی سیٹ پر سب بیٹھے تھے۔ ریکھا کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی۔ اس کے برابر میں رشیدہ پھر اقبال اور اقبال کے برابر میں، میں بیٹھا تھا۔ ریکھا بالکل خاموش تھی۔ وہ کھڑکی سے پیچھے بھاگتے مناظر پر نظریں ٹکائے تھی جبکہ رشیدہ اور اقبال دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے وقت گزاری کے لیے ایک فلمی پرچہ خرید لیا تھا اور اس کی ورق گردانی کیے جا رہا تھا۔ انگلش کا یہ پرچہ خوب چلتا ہوگا، تبھی تو ایسا اعلیٰ کاغذ، اتنی عمدہ چھپائی کا حامل تھا۔ میرے خیال میں اس میں ایک بہت بڑی برائی تھی۔ عورتوں نے دعوتِ نظارہ کا خوب خوب اہتمام کیا تھا۔ ایسی تصویریں بکثرت تھیں جنہیں دیکھ کر لاحول پڑھا جائے، لوگ ایک ایک صفحہ پر چھ چھ بار لاحول پڑھتے ہوں گے پھر ٹھہر کر دوبارہ سہ بارہ لاحول پڑھنے کے لیے پرچہ کھول لیتے ہوں گے کیونکہ انہی تصویروں کی بدولت یہ پرچہ بکتا ہوگا۔

کچھ دیر تک ورق الٹنے کے بعد میں نے پرچہ بند کر دیا کیونکہ خبروں میں بھی خوب چاشنی تھی۔ زیادہ تر بیڈ روم کی خبریں تھیں۔ میں نے پرچہ بند کر کے گھٹنوں پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر کے سیٹ کی پشت سے سر ٹیک دیا۔ تبھی میرے برابر میں بیٹھے نوجوان نے کہا۔ "ایکسکیوز می سر! کیا میں یہ پتریکا دیکھ لوں۔"

میں نے پہلے رسالے پر نظر ڈالی پھر اس کا جائزہ لیا اور مسکرا کر بولا۔ "کیوں نہیں! ضرور دیکھیں۔"

اس نے میگزین اٹھا لیا اور فلم بوبی کے فوٹو سیشن کو بغور دیکھنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ڈمپل کپاڈیہ کے سراپے کو آنکھوں سے چوس رہا ہو۔ ہر تصویر کو اس طرح سے دیکھ رہا تھا جیسے حافظے میں حفظ کرنا چاہتا ہو۔ میں کن انکھیوں سے اس کے چہرے پر پھیلتی پھسلتی چمک دیکھ رہا

تھا۔ ایسے وقت میں مجھے ایک دوست یاد آ گیا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ "ریل میں سفر کرتے ہوئے کتاب کا مطالعہ فضول ہے۔ اس کی بجائے پڑھنے والے کا چہرہ دیکھنا چاہیے، خاص کر ناول بین کا۔ جب دکھ درد بھرا باب آئے گا تو اس کا سیدھا اثر چہرے پر پڑھ لیں۔ عجیب عجیب انداز میں چہرہ سکڑے گا، آنکھیں کبھی چھوٹی ہوں گی کبھی بڑی اور جب مزاح یا خوشی بھرا منظر آئے گا تو چہرہ لال ہو جائے گا۔" بالکل وہی کچھ اس نوجوان کے چہرے پر نظر آ رہا تھا۔ میں نے نظریں ہٹا کر ریکھا کو دیکھا۔

وہ شاید کسی گہری سوچ میں ڈوبی تھی۔ کھڑکی سے در آنے والی ہوا میں اس کے بال اڑ رہے تھے مگر انہیں سنبھالنے کا اسے ہوش نہ تھا۔ میں نے اسے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔ یوں بھی وہ ان دنوں کچھ الجھی الجھی سی نظر آ رہی تھی۔ شاید رشیدہ کی وجہ سے الجھ رہی تھی۔ سمجھ رہی ہوں گی کہ میں رشیدہ کو اس پر ترجیح دے رہا ہوں۔ بات کچھ حد تک صحیح بھی تھی۔ وہ دونوں ہی میری وجہ سے اپنے اپنے رشتے داروں سے محروم ہوئی ہیں۔ دونوں کے سہارے میری وجہ سے بکھرے ہیں۔ اب انہیں سنبھالنا میری ذمے داری ہے۔ میں ان کا کیا کروں یہ بھی میری سمجھ سے باہر تھا۔ گاڑی بھاگتی رہی اور رات گزر گئی۔ صبح کے آثار نمودار ہو گئے۔

صبح ہوتے ہی کمپارٹمنٹ پھر سے چڑیا گھر بن گیا۔ وہی دھکم پیل شروع ہو گئی۔ لوکل پنجروں کی یلغار ہو گئی۔

☆=======☆=======☆

دو رات اور ایک دن کا سفر طے کر کے ہم بمبئی وی ٹی پر اترے۔ نیا شہر، نئے لوگ گویا پھر سے ایک چیلنج میرے سامنے تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی ٹیکسیوں کی قطار نظر آئی۔ میں نے لائن میں کھڑی پہلی ٹیکسی والے سے کہا۔ "بھنڈی بازار۔"

"یس سر......!" اس نے جھٹ کہا اور دروازہ کھول دیا۔

ریکھا، رشیدہ اور اقبال بیٹھ گئے جب کہ میں نے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پسند کی۔ ٹیکسی چل پڑی۔ مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئی جسے دیکھ ہی کر لگتا تھا کہ یہ علاقہ مسلمانوں کا ہے۔ ہوٹل اور دکانوں کے بورڈ بھی اردو میں نظر آئے۔ چائے خانوں پر تیز آواز میں گراموفون بج رہا تھا۔ ڈرائیور نے پوچھا۔ "لو جی، بھنڈی بازار آ گیا۔ اب بولو جی، کدھر جانا ہے؟"

''مغل مسجد کے پاس۔''

''یہ لو جی......!'' اس نے بائیں طرف ٹیکسی موڑ دی۔ کچھ آگے جانے کے بعد ایک نہایت عالیشان بلند مینار والی مسجد نظر آئی۔ اسی مسجد کے سامنے ٹیکسی رک گئی۔ ہم نے نیچے اتر کر اطراف کا جائزہ لیا۔ ٹیکسی والا کرایہ لے کر جا چکا تھا۔ میں نے اقبال سے کہا۔ ''کسی سے پوچھو، سلمان بھائی کہاں ملیں گے؟''

ابھی میری زبان سے یہ نام نکلا ہی تھا کہ برابر سے گزرنے والے نوجوان نے رک کر میرا جائزہ لیا پھر پوچھا۔ ''کس سے ملنا ہے؟''

''جی! بھائی سلمان سے!''

''کس لیے؟''

''کچھ کام ہے۔''

''کہاں سے آئے ہو؟''

''باہر سے آیا ہوں۔''

''کس نے بھیجا ہے؟''

''ان کے ایک دوست نے مگر آپ اتنی جرح کیوں کر رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ بھائی سے ملنا اتنا آسان نہیں ہے۔''

''آسان ہے یا نہیں، یہ بعد کی بات ہے، فی الحال آپ مجھے ان کی رہائش گاہ تک پہنچا دیں۔''

''آؤ۔'' کہہ کر اس نے ہمیں ساتھ لیا اور پتلی پتلی گلیوں سے ہوتا ہوا کافی دور لے آیا پھر ایک پرانی طرز کی عمارت کے دروازے پر پہنچ کر بولا۔ ''بھائی یہاں رہتے ہیں۔ دروازے پر دستک دیں، اندر سے جو آئے، اسے اپنا مقصد بتا دیں۔''

میں نے آگے بڑھ کر دستک دی پھر مڑ کر دیکھا۔ وہ نوجوان واپس جا رہا تھا۔ اس گلی میں کئی دکانیں تھیں۔ دکانوں کے باہر لوگ کھڑے بھی تھے اور بیٹھے بھی مگر سب کی نظریں ہم پر مرکوز تھیں۔ میں نے ادھر سے نگاہیں ہٹا کر دوبارہ دستک دی۔ دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک قدآور شخص تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی کرختگی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''جی فرمائیے۔''

''میں کلکتہ سے آ رہا ہوں۔ مجھے گلفام بھائی نے بھیجا ہے۔ سلمان بھائی کے نام خط بھی ہے۔''

''عورتیں آپ کے ساتھ ہیں؟''

''جی ہاں!''

''یہاں عورتوں کو آنے کی اجازت نہیں ہے، کسی ہوٹل میں انہیں ٹھہرا دیتے۔''

''میں بالکل نیا ہوں، اسٹیشن سے سیدھا آ رہا ہوں۔''

''او اچھا۔'' کہہ کر وہ باہر نکلا پھر سامنے والی دکان کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''او شبراتی ادھر آئیو!''

ایک کالا بھجنگ لڑکا آ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔

''انہیں بھابی کے پاس پہنچا دو۔ کہنا، یہ بھائی کے مہمان ہیں۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔

''خط آپ کے پاس ہے؟''

''جی ہاں۔''

''آیئے۔'' اس نے دروازے سے ہٹ کر مجھے راستہ دیا لیکن جیسے ہی میں اندر داخل ہوا، اس نے نہایت سرعت اور مشاقی سے میری تلاشی لے لی۔ شاید اسے خطرہ ہو کہ میرے پاس کوئی ہتھیار ہو گا۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

''یہ یہاں کا قاعدہ ہے۔'' وہ یہ کہہ کر مجھے ساتھ لے کر آگے بڑھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ گھر کسی قلعہ سے کم نہیں ہے۔ جگہ جگہ مسلح لڑکے بیٹھے تھے۔ میں ان کے سامنے سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا پھر ایک دروازے پر پہنچ کر اس نے مخصوص انداز میں دستک دی حالانکہ وہ دروازہ مکمل طور پر شیشے کا تھا۔ ونڈو گلاس، اندر سے باہر صاف دکھائی دیتا ہو گا پھر بھی دستک کی ضرورت؟ ضرور اندر والے کو میرے دوست ہونے کا اشارہ دیا ہو گا۔

دروازہ کھلتے ہی اس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ دیا میں اندر داخل ہوا تو سامنے بیٹھے شخص نے کہا۔ ''سیدھے چلے جائیں، داہنی طرف والے کمرے میں جا کر بیٹھ جائیں۔''

اب میں اکیلا تھا۔ مجھے یہاں تک پہنچانے والا شخص وہیں رہ گیا تھا۔ میں اکیلا ہی آگے بڑھتا رہا۔ اس مخصوص کمرے کے سامنے پہنچتے ہی اس کا دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والے نے صوفے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''یہاں بیٹھ کر انتظار کریں۔ بھائی کو خبر دے دی گئی

ہے۔ وہ آپ کو خود بلائیں گے۔"

میں نے صوفے پر خود کو گرا دیا۔ سفر کی تھکن نے پہلے ہی جسم کو چُور چُور کر رکھا تھا مگر ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ اسی شخص نے آ کر کہا۔ "جائیں، بھائی آپ کے منتظر ہیں۔"

اس نے دوسری طرف کے دروازے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں ادھر بڑھ گیا۔ دروازہ کھول کر سامنے دیکھا تو ایک شخص صوفہ کم بیڈ پر نیم دراز تھا۔ دو چھوٹے بچے اس کے پیروں کی مالش کر رہے تھے۔ "کیا یہی ہے سلمان؟" اسے دیکھ کر میرے ذہن میں جملہ گونجا کیونکہ وہ ایک دبلا پتلا مخنی سا آدمی تھا۔ ایسا آدمی اور اتنا بڑا اغنڈہ عقل تسلیم کرنے سے انکاری مگر میں کیا کہہ سکتا تھا۔ اس کی حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "آؤ شیر جواں، گلفام کا فون آ گیا تھا۔ اس نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ بولو کب جانا چاہتے ہو؟"

"جتنی جلدی ممکن ہو، مجھے پہنچا دیں۔"

"آج رات یہاں ٹھہر جاؤ، کل ایک لانچ دبئی کے لیے جا رہی ہے، اس پر میں سوار کرا دوں گا۔ وہ لانچ راستے میں ایک پاکستانی لانچ سے کچھ سامان لے گی، تمہیں اس لانچ پر منتقل کر دیا جائے گا۔ اس طرح بڑی آسانی سے بغیر خطرہ مول لیے تم پاکستان پہنچ جاؤ گے۔"

"شکریہ، بہت بہت شکریہ!" میں نے جلدی سے کہا۔

"تمہارے ٹھہرنے کا انتظام کر دیا ہے۔ آرام سے رات گزار لو۔" پھر اس نے ریسیور اٹھا کر کسی سے کہا۔ "ان صاحب کو بھابی کے ہاں پہنچا دو۔"

میں واپس ہو گیا۔ عمارت سے ہی ایک نوجوان میرے ساتھ تھا۔ میں اس کی معیت میں چلتا رہا۔ کچھ گلیوں کو پار کر کے وہ ایک خستہ حال بلڈنگ میں پہنچا۔ اندر پہنچتے ہی میری نظر ایک موٹی عورت پر پڑی۔ مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"تم ہی کلکتہ سے آئے ہو؟"

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، اس کمرے میں چلے جاؤ۔ تمہارے ساتھی سو رہے ہیں۔ تم بھی تھکے ہوئے ہو گے، آرام کرو۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف مانگ لینا۔ یہ بھابی کا گھر ہے یہاں آ کر لوگ اپنی ہر ضرورت پوری کر جاتے ہیں۔"

میں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے میں

سب کے سب بے سدھ پڑے تھے۔ ایک بیڈ خالی تھا۔ شاید میرے لیے، میں بھی دراز ہو گیا۔

کھانے کے لیے اٹھایا گیا تو میں نے آخری بار ریکھا سے پوچھا۔ "ریکھا، ہم سب پاکستان جا رہے ہیں۔ ابھی بھی وقت ہے اگر تم یہاں رہنا چاہو تو بول دو۔ میں یہیں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

"یہاں اب میرا کون ہے، کس کے سہارے پر رہوں گی۔ اب جو کچھ ہے، تمہی ہو۔"

رشیدہ کا جواب یہی تھا، سو اسی صبح ہم لانچ پر سوار ہو گئے۔

☆=======☆=======☆

لانچ دیکھنے میں فشنگ ٹرالر تھا۔ اس پر مچھلی پکڑنے کے تمام سامان موجود تھے۔ ایک نظر میں وہ سب فشر مین لگتے تھے۔ مچھلی پکڑنے والے لگر وہ سب اسمگلر تھے۔ بڑے غنڈوں سے اتنا خطرہ نہیں ہوتا جتنا چھوٹے غنڈوں سے ہوتا ہے۔ وہ ایک لمحے میں بے قابو ہو جاتے ہیں۔ میرے ساتھ دو لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے کئی ایک کی آنکھوں میں مَیں نے ہوس کی چنگاری دیکھی تھی۔ ان میں ایک دادا بھائی بھونسلے نامی مراٹھی نوجوان بھی تھا۔ جس کے چہرے سے ہی عیاری ٹپکتی نظر آتی تھی۔ وہ ریکھا کو ایسی ندیدی نظروں سے گھور رہا تھا کہ میرے ہاتھوں میں خارش ہونے لگی تھی۔ کئی بار دل میں آیا کہ اس کی آنکھیں ہی نکال لوں۔ مگر میں خاموش رہ گیا کہ جب وہ کچھ کرے گا تو میں نمٹ لوں گا۔ مگر میں نے اقبال کو سمجھا دیا تھا کہ ایک لمحے کے لیے بھی غافل مت ہونا۔ جب تک ہم ٹرالر سے نیچے نہیں اتر جاتے ہمیں ہمہ وقت ہوشیار رہنا ہو گا۔

اس ٹرالر کا کیپٹن آصف خان، سلمان کا خاص بندہ تھا۔ وہ رام پور کا نسلی پٹھان تھا مگر کھڑی بولی بولتا تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ آپ لوگ بے فکر رہیں، بھائی نے مجھ پر بھروسہ کیا ہے تبھی آپ کو میرے ساتھ بھیجا ہے ورنہ وہ کسی بھی ٹرالر پر سوار کرا دیتے۔ اس کی یقین دہانی کے باوجود میرا دل مطمئن نہیں تھا مسلسل کچھ اور بول رہا تھا۔ گو کہ میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

بمبئی سے ہم صبح سویرے چلے تھے۔ اب دوپہر ہونے کو آ گئی تھی۔ ابھی تک ہم ہندوستانی سمندری حدود میں تھے۔ بھارتی جھنڈے والی بوٹیں اِدھر سے اُدھر چکرا رہی تھیں۔ یہ سب سمندری گارڈ تھے جو اپنی حدود کی حفاظت کے لیے راؤنڈ لگا رہے تھے۔ آصف خان نے

بتایا تھا کہ ان سب کا منہ ہر ماہ پابندی سے بند کیا جاتا ہے اس لیے یہ سب ہم جیسے لوگوں کو کبھی نہیں روک سکتے ہیں۔

یہ فشنگ ٹرالر تھا۔ ایسے ٹرالر پر عورتیں نہیں ہوتیں اسی لیے ریکھا کو منع کر دیا تھا کہ وہ نیچے ہی رہے، اوپر عرشے پر نہ آئے مگر وہ ضد کیے جا رہی تھی کہ وہ سمندر دیکھے گی۔ رشیدہ کیبن میں آرام سے بیٹھی تھی۔ اس لیے اس کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔ میں، اقبال کے ساتھ عرشے پر کرسی ڈالے بیٹھا تھا کہ میری نظر بھونسلے پر پڑی وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ وہاں ریکھا اور رشیدہ تھیں اس لیے میں ہوشیار ہو گیا۔ نظریں اس کا احاطہ کرنے لگیں۔ جیسے ہی وہ نیچے اترا میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"کیا آرام کرنے جا رہے ہیں۔" اقبال نے پوچھا۔

"ابھی آیا" کہہ کر میں بھی سیڑھیوں سے دبے قدموں نیچے اتر گیا۔ نچلا حصہ بطور گودام استعمال ہوتا تھا۔ صرف ایک کیبن تھا جس میں اوزار وغیرہ رکھے جاتے تھے۔ اسی کیبن کو صاف کر کے لڑکیوں کو دے دیا گیا تھا۔ میں نے سیڑھیاں اترتے اترتے جھانکا۔ بھونسلے کیبن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ ایک خطرناک بات تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بات پیدا ہو مگر قسمت اسی طرف لے جا رہی تھی۔ میں پنجوں کے بل چلتا ہوا اسی طرف بڑھنے لگا۔ میرے کان ادھر ہی لگے ہوئے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اب تب میں وہاں سے چیخ بلند ہو گی۔ ریکھا پر بھروسہ نہیں تھا۔ وہ پھسل سکتی تھی مگر رشیدہ تو اس کے لیے بھوکی بلی بن جاتی۔ زبردست مزاحمت کرتی۔ میں پوری طرح سے تیار ہو گیا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے تھے۔ مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔ آہستہ آہستہ میں کیبن کے پاس پہنچ گیا۔ اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ بھونسلے کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر اس کی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں کیبن کے اور قریب پہنچ گیا۔ اندر سے ایک ایسا لفظ سنائی دیا کہ میں حیرت سے کھڑا رہ گیا۔ مجھ پر گھڑوں پانی گر گیا۔ اپنے آپ سے شرم آنے لگی اور میں خاموشی سے لوٹ آیا۔

اقبال اب تک اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ وہ سمندر کی لہروں پر نظریں جمائے کچھ سوچ رہا تھا۔ آہٹ پر اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "آپ تو آرام کرنے گئے تھے پھر لوٹ کیوں آئے؟"

"یار میں نے بھونسلے کو غلط سمجھا تھا۔" کہہ کر میں نے کرسی کو کچھ اور قریب کیا پھر کہا۔

"اسے نیچے جاتے دیکھ میں بھی چلا گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ کوئی بدمعاشی کرے گا مگر وہ رشیدہ سے التجا کر رہا تھا کہ اسے وہ ایک بار بھائی کہہ کر مخاطب کرے کیوں کہ اس کی صورت اس کی مرحومہ بہن جیسی ہے۔"

"ان ملعونوں کا کوئی بھروسہ نہیں یہ بھائی کہہ کر ہی پیٹھ میں چھری مارتے ہیں۔" اقبال بولا۔ "پھر بھی ہمیں ہوشیار رہنا ہوگا۔"

"ہوشیار ہم کب نہیں رہتے۔ مصیبت تو خود ہمیں اپنے حصار میں لیتی ہے۔ ہم سوچتے کچھ ہیں، ہو کچھ جاتا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ ریکھا کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ریکھا بھونسلے کے ساتھ سیڑھیوں سے اوپر آ رہی تھی۔ آصف خان نے سختی سے منع کیا تھا کہ لڑکیوں کو عرشے پر نہ آنے دوں ورنہ خطرہ خود چل کر آ جائے گا۔ کوسٹ گارڈ والے دوربینوں سے جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ کسی کی نظر پڑ گئی تو خوامخواہ کی پریشانی گلے آ پڑے گی پھر بھی وہ اوپر آ گئی تھی۔ میں اسے ڈانٹنے والا تھا کہ بھونسلے نے کہا۔ "چنتا کی کوئی بات نہیں ہے۔ سب چلتا ہے۔ ان کا من کر رہا تھا سمندر دیکھنے کو میں انہیں لے آیا۔"

بھونسلے خطروں کو مجھ سے زیادہ بھانپ سکتا تھا۔ جب اسے اعتراض نہیں تو میں کیا بول سکتا تھا اس لیے خاموش رہ گیا۔ ریکھا جا کر کنارے کی رسی پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بپھرتی، اچھلتی موجوں کو دیکھ رہی تھی تبھی میری نظر سامنے اٹھی اور میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ دور سے ایک بوٹ تیزی سے ہمارے ٹرالر کی طرف بڑھتی نظر آئی۔ میں نے بھونسلے سے کہا۔ "وہ بوٹ ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔ خان کو اطلاع دے دو۔"

"ریکھا جی آپ نیچے جائیں۔ میں دیکھتا ہوں یہ کیوں آ رہے ہیں۔" بھونسلے نے ریکھا کو مخاطب کیا۔ اسے بھی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ ریکھا خاموشی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ خان بھی عرشے پر آ گیا تھا۔ وہ اس بوٹ کو دیکھ رہا تھا کہ اس بوٹ سے کسی نے میگا فون پر کہا۔ "اپنی پہچان بتاؤ۔"

"یہ فشنگ ٹرالر ہے سر۔" خان نے جواب دیا۔ "ہم گہرے پانی کی طرف جا رہے ہیں۔ رات میں شکار کے لیے جال ڈالیں گے۔"

"ہمیں شک ہے۔ تلاشی لینا چاہتے ہیں۔" ادھر سے کہا گیا۔

"آجائیں۔" خان نے انہیں اشارہ دیا۔ دونوں بوٹ کو ملا دیا گیا۔ اس بوٹ سے ایک آفیسر اتر کر اس بوٹ میں آ گیا۔ اس کی وردی بتا رہی تھی کہ وہ کوسٹ گارڈ کا افسر ہے۔ اس کے بعد تین چار مزید لوگ آ گئے۔ وہ سب ہتھیاروں سے لیس تھے۔ خان مطمئن تھا اس لیے میں بھی خاموش رہا۔ سپاہی ٹرالر پر پھیل گئے۔ ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ پھر وہ کیبن کی طرف بڑھے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اندر ریکھا اور رشیدہ تھیں۔ فشنگ ٹرالر پر لڑکیوں کا کیا کام، وہ انہیں فوراً گرفتار کر لیتے۔ جو کچھ کرنا تھا مجھے ہی کرنا تھا اس لیے کہ خان بالکل چغد بنا ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ان کے ہر قدم کے ساتھ میرا دل دھڑک رہا تھا کہ ساحل پر آ کر کشتی نہ ڈوب جائے اس لیے کہ یہ گرفتار کرتے تو سیدھا بھارتی جیل میں دھکیل دیتے اور بھارتی جیل کا مطلب تھا کہ اگلے پچھلے تمام کیس کھل جائیں۔ انہیں روکنا ضروری تھا۔ مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا یہ میں نے سوچ لیا اور کیا کرنا چاہیے اس پر غور کرنا شروع کر دیا۔ ابھی میں کچھ کرتا کہ ایک سپاہی نے اوپر سے آواز لگائی۔ "سر ادھر آئیں۔"

آفیسر آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا پھر اس نے وہیں سے پوچھا۔ "کیا ہوا۔"

"اوپر تو آئیں۔ ہیڈ کوارٹر سے میسج ہے۔"

وہ فوراً مڑ گیا۔ اوپر پہنچ کر اس نے وائرلیس سیٹ لے لیا پھر بولا۔ "یس سر!"

"تم لوگ واپس اپنی بوٹ میں آ جاؤ۔ اس ٹرالر کو کلیئر دے دیا گیا ہے۔" دوسری جانب سے کہا گیا۔

"یس سر!" کہہ کر وہ واپس اپنی بوٹ پر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی خان نے بھونسلے کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "شاباش تم نے بروقت کام کیا ہے۔ میرا اشارہ تم نے سمجھا یا نہیں میں یہی سوچ رہا تھا۔"

"بھائی آپ نہ بھی کہتے تو میں دنیش صاحب سے رابطہ کرتا ہی کیوں کہ ہم مٹھی بھر پیسے ہر ماہ کس بات کے دیتے ہیں۔" اس نے کہہ کر قہقہہ لگایا۔ میں نے بھی اطمینان کی سانس لی۔

واپس عرشے پر آ کر میں نے بھونسلے سے کہا۔ "یار تم نے تو مروا دیا تھا۔ یقیناً وہ لوگ ریکھا کو دیکھ کر ہی ادھر متوجہ ہوئے ہوں گے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ لوگ فشنگ ٹرالر پر عورت کو دیکھ کر ہی ادھر آئے ہوں

گے۔ ان کا خیال ہوگا کہ ہم انسانی اسمگلنگ بھی کرنے لگے ہیں اور پیسے کم پہنچا رہے ہیں۔"

"اس لیے اب ریکھا کو اوپر لے کر مت آنا۔" میں نے کہا۔

"ویسے بھی ہم پاکستانی حدود سے اب زیادہ دور نہیں ہیں۔ پاکستانی لانچ آتی ہی ہو گی۔" کہہ کر اس نے مغربی سمت میں ہتھیلی کا چھجہ بنا کر دیکھا پھر زور سے بولا۔ "وہ دیکھیں پاکستانی ٹرالر آ رہا ہے۔"

میں نے ادھر دیکھا۔ دور بہت دور ایک سیاہ دھبا سا نظر آ رہا تھا۔ جو آہستہ آہستہ قریب آتا جا رہا تھا۔ خان بھی برابر میں آ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بھی تائید کی کہ اسی ٹرالر کا ہمیں انتظار تھا۔ میں نے اقبال سے کہا کہ وہ ان دونوں کو تیار رہنے کا کہہ دے۔ ہم اسی ٹرالر پر منتقل ہونے والے ہیں۔

کچھ دیر بعد وہ ٹرالر ہمارے ٹرالر کے برابر میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے ایک آدمی ہمارے ٹرالر پر آیا۔ اس نے خان کو سلام کر کے کہا۔ "بھائی کا پیغام مل گیا تھا۔ کسے لے کر جانا ہے؟"

"ان کو اور ان کے ساتھیوں کو۔" اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے مسکرا دیا پھر بولا۔ "میرا نام ہاشو ماچھی ہے۔ آپ کو کراچی تک پہنچانا اب میری ذمہ داری ہے۔"

ہم سب اس کے ٹرالر پر چلے گئے۔ خان وہاں تک ساتھ آیا تھا۔ اس نے الوداع کہہ کر مجھے سینے سے لگایا اور کہا۔ "اب کبھی بمبئی آنا ہو تو مجھ سے ضرور ملیے گا۔"

"ضرور۔" میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے جواب دیا۔

ہاشو نے واپسی کا سفر اختیار کر لیا۔ دھیرے دھیرے خان کا ٹریلر دور ہوتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"اب ہم پاکستانی سمندری حدود میں آ چکے ہیں۔ آپ سب کو بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔ کیوں کہ کوسٹ گارڈ والے مجھ پر بہت زیادہ نظر رکھ رہے ہیں۔" ہاشو نے کہا۔ "آپ اب شلوار قمیص پہن لیں۔ اقبال صاحب کو بھی پہنا دیں۔ عورتوں کو بھی ساڑی کی بجائے شلوار قمیص پہنا دیں۔ بھائی نے مجھے بتا دیا تھا۔ اس لیے میں کپڑے لیتا آیا ہوں۔ پہن کر دیکھ لیں اندازے سے لیا ہے۔ چھوٹا بڑا نہ ہو رہا ہو۔"

میں نے ریڈی میڈ کپڑے پہن لیے۔ مجھے کچھ تنگ آئے مگر اقبال پر بالکل فٹ ثابت ہوئے۔ رشیدہ اور ریکھا نے بھی لباس تبدیل کر لیا تھا۔ ہم سب پاکستانی ساحل پر اترنے کو تیار بیٹھے تھے۔ میں نے ہاشو سے پوچھا۔ ''ہم کہاں اتریں گے؟''

''ابراہیم حیدری کے ساحل پر، وہاں سے کراچی پہنچانا بھی میرا کام ہے۔''

میں نے ابراہیم حیدری کا صرف نام سنا تھا۔ کہاں ہے یہ مجھے بھی صحیح پتا نہ تھا اس لیے کہ میں گلگت سے باہر صرف ٹریننگ کے لیے نکلا تھا۔ کیڈٹ کالج کے علاوہ مجھے دنیا کا کچھ پتا نہ تھا۔ پاکستان اتنا بڑا ہے۔ ہر علاقہ کس کا دیکھا ہوا ہوگا؟ پھر بھی جب میں ساحل پر اترا تو مجھے وہ علاقہ اجنبی محسوس نہیں ہوا۔ وطن کی خوشبو نے ہی بتا دیا کہ میں پاکستان پہنچ چکا ہوں۔

ابراہیم حیدری سے کراچی آنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ہاشو نے سوزوکی کا انتظام کر دیا تھا۔ بغیر ہڈ اور بغیر سیٹ کی سوزوکی۔ ریکھا، رشیدہ اور اقبال پیچھے بیٹھ گئے تھے جب کہ میں ڈرائیور کے ساتھ تھا۔ ہاشو اپنے ایک دوست کے ساتھ بائیک پر ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ڈرائیور خاصہ باتونی تھا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم باہر سے آرہے ہیں۔ وہ راستے بھر پوچھتا آیا کہ ہم کہاں سے آرہے ہیں مگر میں نے صحیح جواب نہیں دیا۔ خاموش بیٹھا باہر کا نظارہ کرتا رہا۔ کئی گھنٹے کے بعد ہم کراچی پہنچے۔ ہاشو ہمیں لے کر ناظم آباد کے علاقے میں آیا۔ وہاں اس کا کوئی جاننے والا تھا۔ اس کے توسط سے اس نے چند گھنٹے میں ایک مکان لے لیا۔ جس کا کرایہ بھی واجبی تھا۔ اس کی یہ عقل مندی مجھے بھی پسند آئی اس لیے کہ ہوٹل میں ٹھہرنا خاصہ مہنگا پڑتا۔ میرے پاس اب جو روپے رہ گئے تھے انہیں سوچ سمجھ کر خرچ کرنا تھا۔

گھر اور گھرداری کے ضروری اسباب دلا کر وہ واپس چلا گیا۔ اب ہم اکیلے ہو چکے تھے۔ اپنے وطن میں ضرور تھے مگر یہ شہر میرے لیے اجنبی تھا۔ اسی رات اقبال نے پوچھا:

''آگے کا پروگرام کیا ہے؟''

''میرے ذہن میں کوئی واضح خاکہ نہیں ہے۔ اتنے دنوں بعد وطن کی مٹی کی خوشبو مشامِ جاں بن رہی ہے ابھی لطف لینا بھی ضروری ہے۔ تم بھی انجوائے کرو۔ آزادی کا لطف اٹھاؤ کہ اب آئی بی یا بھارتی انٹیلی جنس کا خطرہ نہیں ہے۔ تھوڑا بہت آرام کر لوں پھر مجھے GHQ جا کر رپورٹ بھی تو کرنی ہے۔''

''یہ بات تو ہے ہی مگر ایک بات زندگی کی ہماہمی نے بھلا دی ہے جو سب سے ضروری

ہے۔''

''کون سی بات؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ کا پتا نہیں مگر میں نے بھلا دیا ہے کہ میری ایک بیوی بھی ہے۔ دو بچے بھی ہیں۔ وہ آج نہیں تو کل واپس پاکستان ضرور آئیں گے۔ یقیناً ہماری حکومت انہیں لانے کی کوشش کر رہی ہوگی۔'' اقبال نے پہلی بار اپنے دل کا درد ظاہر کیا۔ اس کی بات نے میرے اندر بھی درد جگا دیا۔ مجھے آئینہ دکھا دیا تو مجھے بھی یاد آ گیا کہ میرے انتظار میں بھی میری امی بیٹھی ہوں گی۔ ہر روز میری سلامتی کے لیے خدا کے حضور سربسجود ہو کر دعا کر رہی ہوں گی۔ تبھی تو میں اتنے خطروں سے بچ کر اپنی مٹی پر صحیح سلامت آ گیا۔ اب مجھے جلد سے جلد گلگت پہنچ جانا چاہیے۔ پھر وہاں کوئی اور بھی تو محوِ انتظار ہوگا۔ میری نئی نویلی دلہن جو میرے فراق میں تڑپ رہی ہوگی۔ شادی کے بعد گنتی کے تو دن اس کے ساتھ گزارے تھے۔ وہ بے چاری انہی یادوں کے سہارے وقت کاٹ رہی ہوگی۔

☆=======☆=======☆

ہاشو نے جو گھر لے کر دیا تھا وہ بہت ہر طرح سے محفوظ تھا۔ آس پاس والے بھی بہت جلد گھل مل گئے تھے۔ سب کو پتا لگ گیا تھا کہ ہم لوگ مشرقی پاکستان سے آرہے ہیں اس لیے ہر کوئی ہم سے ہمدردی کے ساتھ پیش آرہا تھا۔ مشرقی پاکستان میں جو قتل و غارت گری ہوئی تھی اس پر ہر ہم وطن دکھی تھا۔ اس لیے وہاں سے آنے والوں کو خوب عزت دی جا رہی تھی۔ اس وقت تک شناختی کارڈ کا مسئلہ بھی نہیں تھا اس لیے ریکھا اور رشیدہ کے لیے بھی کوئی ڈر نہیں تھا۔ ریکھا کا نام رشیدہ نے رحمتی بیگم کر دیا تھا۔ وہ بھی اپنے اس نئے نام کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے خود ہی خواہش ظاہر کی تھی کہ اسے اسلام کے بارے میں بتایا جائے۔ رشیدہ اسے اسلام کا ایک ایک رکن سمجھاتی جا رہی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اسی شہر میں رہنا ہے۔ کیونکہ یہ بڑا شہر ہے پھر اقبال کو بھی یہ شہر پسند آ رہا تھا۔ عالمی جنگی قوانین کے مطابق فوجی جب ہتھیار ڈال دیتا ہے تو اسے فوج سے سبک دوش کر دیا جاتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے بھی فوج سے نکال دیا جائے گا۔ ایسی حالت میں مجھے کوئی نہ کوئی کام تلاش کرنا ہی تھا۔ یہاں نوکری آسانی سے مل سکتی ہے۔ اس لیے بھی یہ شہر موافق تھا۔ مگر مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ پڑوس والے گھر میں جو شخص رہتا ہے وہ FIA میں ملازم ہے۔ اگر پہلے سے علم ہوتا تو میں کب کا مکان تبدیل کر چکا ہوتا۔

خیر میں نے سب کو اس مکان میں ٹھہرا کر گلگت جانے کی تیاری کر لی۔ سوچ لیا تھا کہ پہلے گھر جاؤں گا پھر واپسی میں جی ایچ کیو میں جا کر رپورٹ کروں گا۔ راشن وغیرہ خرید کر دے دیا۔ اوپر سے ریکھا کو دو ہزار، رشیدہ کو ایک ہزار اور اقبال کو پانچ ہزار روپے خرچ کے لیے دے دیئے۔ سستا زمانہ تھا۔ ہر چیز ارزاں تھی۔ لوگوں میں میانہ روی تھی۔ تعیش کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ آج لوگ کہتے ہیں کہ اس آمدنی میں پورا نہیں پڑتا۔ اخراجات بڑھ گئے ہیں۔ دراصل یہ اخراجات خود ہم نے بڑھائے ہیں۔ پہلے الیکٹرک کا بل پچاس روپیہ آتا تھا۔ آج پانچ ہزار آتا ہے کیونکہ پہلے صرف بلب اور پنکھے چلتے تھے۔ آج فریزر، ڈی وی ڈی پلیئر، ٹی وی، اے سی، موبائل سب کا لوڈ بجلی پر ہے۔ ان دنوں جن گھروں میں ٹی وی تھا وہ بھی دو تین گھنٹوں کے لیے اسے آن کرتے تھے۔ اب سارا دن چلتا رہتا ہے تو بجلی کا بل کیوں نہیں بڑھے گا۔ کیبل اور موبائل کارڈ کا اضافی خرچ بڑھا تو اخراجات میں اضافہ کیوں نہیں ہو گا؟

خیر اتنی رقم جو میں نے انہیں دی تھی وہ سال بھر کے لیے کافی تھی۔ انہیں دینے کے بعد جو رقم میرے پاس بچ گئی تھی وہ میں نے حفاظت سے رکھ لی۔ یہ وہ رقم تھی جو میں نے ہمانشو سے ہتھیائی تھی۔ پھر اچھی خاصی رقم گلفام نے بھی دی تھی۔ یہاں پہنچتے ہی میں نے انڈین کرنسی پاکستانی روپے میں تبدیل کر لی تھی۔ وہی اب کام آ رہی تھی۔

ان سب کو خدا حافظ کہہ کر میں نے رختِ سفر باندھا۔ اصولاً سب سے پہلے مجھے GHQ میں رپورٹ کرنی تھی مگر میں نے یہ سوچا کہ وہاں دیر ہو سکتی ہے۔ دفتری کارروائی میں کتنی دیر لگ جائے کیا پتا۔ باورا من بار بار اکسا رہا تھا کہ میں جتنی جلد ممکن ہو گلگت پہنچ جاؤں۔

جب سے میرے قدموں نے وطن کی مٹی کو چوما تھا۔ پاک وطن کی مٹی کی خوشبو قوتِ شامہ تک پہنچی تھی۔ دل بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ ہر دھڑکن کی ایک ہی صدا تھی۔ بس ایک نام تھا جو مجھے کھینچے لیے جا رہا تھا۔ اس وقت بھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ وقتِ رخصت اس نے کتنے دکھ بھرے انداز میں سینے سے لگ کر کہا تھا۔ ''میں اکیلے کیسے رہوں گی۔''

اس کا وہ جملہ اب بھی کانوں میں گونج رہا تھا۔ ذہن میں جاگ رہا تھا اور روح میں تازگی بھر رہا تھا۔ اس ایک جملے کی کشش تھی کہ میں ریکھا اور رشیدہ کے سحر کا اسیر نہ بن سکا۔ میں بھی ابن آدم ہوں۔ بھوک پیاس مجھے بھی ستاتی ہے۔ بالخصوص تیسری بھوک۔ اس بھوک کا ستایا ہوا تو مجرمِ خدا بننا بھی ہنسی خوشی گوارا کر لیتا ہے مگر میں نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ ہر ہر گام پر منہ

زور جذبوں کو تھپکیاں دی تھیں، شیطانیت کے عفریت کو شکست دی تھی۔ اس فتح کا جشن بھی دل کھول کر منانا تھا۔ اس جشن کا دورانیہ کتنا طویل ہو گا اس کا اندازہ ابھی سے لگانا مشکل تھا۔ اس لیے اقبال سے صرف اتنا کہا تھا۔ ''اگلے ماہ کی دس تک واپسی ہو گی۔ اتنے دنوں تک ان دونوں کو قابو میں کیے رکھنا تمہاری ذمے داری ہو گی۔''

میرا اپنا خیال تھا کہ یہ ایک ماہ ناکافی ہو گا۔ اماں اتنی جلدی آنے نہیں دیں گی۔ میری بیوی صالحہ تو کسی طور بھی واپسی کی اجازت نہیں دے گی۔ مگر میں پھر بھی سب کو راضی کر لوں گا۔ یہی سب سوچتا ہوا میں پنڈی پہنچ گیا۔

☆=======☆=======☆

پنڈی رات میں پہنچا تھا۔ گلگت کے لیے بس صبح ملتی اس لیے ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ مگر ساری رات دل بے چین رہا کیونکہ میں جلد سے جلد پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے کلکتہ میں سنا تھا کہ ہندوؤں کے اوتار بھگوان رام نے چودہ سال کا بن باس کاٹا تھا۔ جنگل جنگل پھرا تھا۔ میں بھی بن واس سے لوٹ رہا تھا۔ دشمن ملک کے شہروں شہروں پھرا تھا، اب جا کے اس کا پھل ملا تھا۔ اپنی دھرتی، اپنے وطن لوٹ آیا تھا، جس کے ہر ذرے سے مجھے پیار تھا۔ اب میں دل کی دنیا بھی آباد کر لینا چاہتا تھا۔ اپنے پیاروں سے مل کر دل کی للک مٹا لینا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ دل کی للک لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اپنی جان، اپنے پیار، اپنی دنیا صالحہ سے ملنے کو میں بے چین ہوا تھا۔ اس بے چاری نے بھی بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ میرے انتظار میں کتنی ہی راتیں رو رو کر گزاری ہوں گی۔ شادی کے صرف پندرہ سولہ دن اس کے ساتھ گزارے تھے اور اسے جدائی کی آگ میں جلتا چھوڑ کر میں وطن کی حفاظت کے لیے سمندر پار چلا گیا تھا۔ ایک دو نہیں پورے ڈھائی سال بعد اب میں لوٹ رہا تھا۔

اتنے دنوں کا حساب وہ ضرور مانگے گی۔ شکوہ کرے گی شکایت کرے گی کہ مجھے کیوں فراق کے دلدل میں دھکیل گئے تھے۔ کس کے آسرے چھوڑ گئے تھے۔ تمہاری کمی تمہاری امی سے پوری ہو سکتی تھی؟ دیکھو میں نے تمہاری امی کی کتنی خدمت کی صرف اس لیے کہ وہ تمہاری امی ہیں۔ اس کا مجھے انعام چاہیے مگر تم کیا دو گے۔ میں خود تمہیں دوں گی انعام۔ بہت جلد۔ بس تم کچھ دن میرے پاس رہ جاؤ۔ چھ مہینہ یا سال بھر دیکھنا تمہاری نشانی میری گود میں ہو گی اور میں فخریہ کہوں گی۔ اب تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس میرا لاڈلا ہے ناں۔

جیسے ہی وہ مجھے دیکھے گی تو کتنا خوش ہوگی۔ کس شدت سے، کس چاہت سے، کس والہانہ پن سے وہ مجھ سے خود کو جوڑ لے گی، وصال کے لمحوں میں فراق کا درد بیان کرے گی۔ کیا کیا کہے گی؟ میرے دماغ میں وہ تمام الفاظ گونجنے لگے اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچنے لگی۔ میں سیٹ سے ٹیک لگائے خیالوں کی دنیا میں غوطہ زن ہو گیا، خود ہی سوال اور جواب سوچنے لگا۔ وقت گزرتا رہا سفر طے ہوتا رہا۔ میں اپنی منزل سے قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔

وقت جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ کٹتے نہیں کٹ رہا تھا۔ بس دوڑ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر استادہ پیڑوں کی قطار پیچھے کی طرف بھاگتی رہی۔ نئے نئے اسٹاپ آتے رہے جاتے رہے۔ مگر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے بس اپنی جگہ سے کھسک ہی نہیں رہی، آگے نہیں بڑھ رہی۔ شاید یہ انتظار کی شدت کا نتیجہ تھا۔

مجھے اندازہ تھا شام تک یہ بس گلگت پہنچے گی مگر دل کو کیسے سمجھاتا جو کسی بچے کی طرح مچلے جا رہا تھا۔ ہر پل ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا کہ پل کے پل میں یہ بس وہاں پہنچ جائے اور میں انہی گلیوں میں پھر سے مٹر گشتی کروں جہاں میرا بچپن گزرا ہے۔ جن گلیوں سے گزر کر میں اسکول جاتا تھا۔ جن سڑکوں سے ہو کر میری بارات گزری تھی۔ جس گھر میں صالحہ دلہن بن کر آئی تھی اور میرے جسم وجاں کی ملکہ بن گئی تھی۔ اس کا خیال آتے ہی وہ نازک سی من موہنی مورت دھم سے خیالوں کے کینوس پر آ گئی۔ اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگی۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ جیسے اسے آنکھوں میں قید کر لینا چاہتا ہوں۔

آنکھیں بند کرنے سے نیند آتی ہے مگر میری آنکھوں میں تو سپنوں کا بسیرا تھا۔ خوابوں کا ڈیرا تھا۔ اس لیے نیند کیسے اپنی جگہ بناتی۔ میں خیالوں میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ راستہ کٹتا رہا۔

پورے ڈھائی سال بعد لوٹا تھا۔ گزرے وقت نے میرے خدوخال میں بہت سی تبدیلیاں لا دیں تھی۔ جسم فربہ ہو گیا تھا۔ شیو نہ کرنے کی وجہ سے ڈاڑھی آ گئی تھی۔ ایک نظر دیکھنے والا مجھے کسی مدرسہ کا مہتمم سمجھتا کیونکہ کندھے پر چارخانے والا رومال بھی تھا جو میں نے پسینا صاف کرنے اور دھوپ سے بچنے کے لیے راولپنڈی میں لیا تھا۔ کل ملا کر میری شخصیت بدل کر رہ گئی تھی۔ ایک نظر میں میرے پرانے دوست احباب بھی پہچان نہ پاتے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ سیدھا گھر میں داخل ہو جاؤں گا۔ کسی اجنبی کو یوں گھر میں گھستے دیکھ صالحہ چیخ

پڑے گی پھر جب میں اسے مخاطب کروں گا تو وہ خوشی سے اچھل پڑے گی۔ انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ بس رک گئی اور میرے خیالوں کی ڈور ٹوٹ گئی۔ ہم تقریباً گلگت پہنچ گئے تھے۔ بس اگلا اسٹاپ گلگت کا تھا۔ اب مجھے مزید اکتاہٹ ہونے لگی۔ اس لیے کہ منزل کے قریب پہنچ کر گھوڑے کی رفتار بھی تیز ہو جاتی ہے۔

بس نے چلنا شروع کیا تو میں نے شکر کی سانس لی اور سر کو سیٹ سے ٹکا دیا۔ باہر کے مناظر آنکھوں سے چومنے لگا۔ ان مناظر کے لیے میں کتنا تڑپا تھا۔ کتنا یاد کیا تھا۔ ایسے دل فریب مناظر اور کہاں ہیں، سارا حسن تو ہمارے یہاں ہے۔ ان مناظر کو تحسینی نظروں سے دیکھتا ہوا میں نیم دراز ہو گیا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد بس نے گلگت کی حسین سرزمین کو چوما۔ بس رکی۔ مسافر اترنے لگے۔ میں بھی اپنے سامان کے ساتھ نیچے اترا اور اس طرف بڑھا جہاں سے مجھے نگر کے لیے سواری مل سکتی تھی۔ مگر وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں سوٹ کیس لیے حیران نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک نوجوان نے آ کر پوچھا۔ ”آپ نے کہاں جانا ہے؟“

کوئی اجنبی یوں سوال کرے تو دل میں شبہ پیدا ہونا ضروری ہے۔ میں نے مشتبہ نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”نگر۔“

”یہ تو اور بھی بہتر ہے۔ میں بھی نگر جا رہا ہوں۔ آج سواری کا ملنا مشکل ہے کیونکہ آج نوروز ہے۔ سب خوشیاں منانے میں لگے ہیں۔ راول پنڈی کی بس دیکھ کر آ گیا تھا کہ کوئی جاننے والا آیا ہو تو اسے بھی ساتھ لے لوں۔ پہچان کا کوئی بندا نظر نہیں آیا۔ میرے پاس بائیک ہے۔ اگر چاہیں تو ساتھ چل سکتے ہیں۔“ نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ اس کے بولنے کا انداز بڑا پیارا تھا۔ چہرے پر معصومیت تھی۔ یوں بھی ہمارا علاقہ ابھی تک شہر کے گند سے محفوظ ہے۔ اس لیے میں نے زیادہ جرح نہیں کی۔ اس نے خود ہی کہا۔ ”یقیناً آپ کہیں دور سے آ رہے ہوں گے۔ تھکن غالب ہوگی۔ پہلے ایک کپ چائے پی لی جائے۔“

ایک عرصہ سے میں نے قہوہ پیا نہیں تھا اس لیے فوراً راضی ہو گیا۔ وہ مجھے لے کر سامنے والے قہوہ خانے میں پہنچا۔ یقیناً عام دنوں میں یہ قہوہ خانہ بھرا رہتا ہوگا مگر اس وقت بالکل خالی پڑا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نوجوان نے شینا زبان میں قہوہ کے لیے کہا۔ اتنے دنوں بعد اپنی میٹھی بولی سنی تو لطف دوبالا ہو گیا۔ ابھی میں زبان کی شیرنی کو اپنے پور پور میں اتار ہی رہا تھا کہ اس نے پوچھا۔ ”کہاں سے آ رہے ہیں؟“

”کراچی سے۔“ میں نے اردو کی بجائے شینے میں جواب دیا۔ پھر پوچھا۔ ”آپ کس سلسلے میں نگر جا رہے ہیں؟“

”میں وہیں رہتا ہوں۔ یہاں میری دکان ہے۔ ہر روز شام میں بائیک سے لوٹ جاتا ہوں۔ آج تعطیل کی وجہ سے جلدی لوٹ رہا تھا کہ بس نظر آ گئی۔ میں نے سوچا اگر کوئی جاننے والا ہوا تو اسے بھی ساتھ لے لوں کہ آپ پر نظر پڑ گئی اور آپ سے پوچھ بیٹھا۔“

نگر کوئی بہت بڑا قصبہ تو ہے نہیں۔ وہاں کے تقریباً سب کو جانتا تھا۔ مگر مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ یہ نوجوان کس گھرانے کا ہے۔ اس لیے میں نے پوچھا۔ ”آپ کے والد کا کیا نام ہے؟“

”دراصل میں نگر کا نہیں ہوں۔ میں تو اسطور کا رہنے والا ہوں۔ ایک سال قبل وہاں منتقل ہوا ہوں۔“

”آپ نگر کے نہیں ہیں۔ کاروبار بھی آپ کا شہر میں ہے تو پھر اتنی دور گھر کیوں لیا۔ یہیں گھر لے لیتے۔“ میں نے سپ لیتے ہوئے کہا۔

”دراصل میری بیوی نگر چھوڑنے پر تیار نہیں اسی لیے وہاں رہ رہا ہوں۔“

”گویا نگر میں آپ کی سسرال ہے۔ بیگم کس گھرانے کی ہے؟“

”بیگم بھی اسطور کی ہے۔“ اس کے جواب پر میں نے قہقہہ لگا کر کہا:

”واہ آپ بھی اسطور کے وہ بھی اسطور کی اور میری بیگم بھی اسطور کی۔ آپ نے بھی رہائش نگر میں رکھی ہے میں بھی نگر کا رہنے والا ہوں اس طرح تو آپ سے رشتے داری ہو گئی۔“

اس نے بھی ہنس کر کہا۔ ”گویا میں آپ کا سسرالی آپ میرے سسرالی۔“

”اسی لیے تو کہتے ہیں دنیا بہت چھوٹی ہے۔“

”بالکل دنیا بہت چھوٹی ہے۔“ وہ بھی ہنس دیا۔

”مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جب آپ دونوں اسطور کے ہیں تو پھر آپ کی بیگم کو نگر سے اتنا پیار کیوں ہے؟“

”دراصل میری بیگم کی یہ دوسری شادی ہے۔ پہلی شادی نگر کے ایک جوان سے ہوئی تھی۔“

”اچھا کس گھرانے میں۔ شوہر کا انتقال کیسے ہو گیا؟“

”انتقال نہیں ہوا۔ وہ شہید ہو گیا۔ بچپن سے میں دو پیشے کو بہت اہمیت دیتا آیا ہوں۔

ایک اسکول ماسٹر کا، جو زندگی سنوارتا ہے۔ دوسرا فوجی کا جو اپنی زندگی دے کر ہماری زندگی بچاتا ہے۔ اتفاق کی بات ہے اس لڑکی کو میں بچپن سے پسند کرتا تھا میں رشتہ بھیجتا کہ وہ پرائی ہو گئی۔ مگر شادی کے ایک ڈیڑھ ہفتے بعد ہی اس کے شوہر کو لام پر بھیج دیا گیا۔ اسے مشرقی محاذِ جنگ پر بھیجا گیا تھا۔ وہیں وہ شہید ہو گیا۔“ وہ بول رہا تھا اور میں حیرت کے سمندر میں غوطہ لگائے جا رہا تھا۔ ساعت جواب دے گئی تھی۔

”ارے.....“ بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ میرے ساتھ گلگت کا کوئی نہیں تھا۔ شاید وہ شہید کسی دوسری بٹالین کا ہو گا مگر اس کی کہانی مجھ سے بہت مل رہی تھی اسی لیے میں چونک گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ شہید ہو گیا۔ مشرقی محاذ پر جانے والے بہت سے لوگ P.O.W بن گئے تھے۔ ہندوستان کی قید سے رہا ہو کر بہت لوگ آ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ بھی ان میں ہو۔“

”نہیں جی ایچ کیو سے پتا کیا گیا ہے۔ وہاں والوں نے بھی تصدیق کر دی ہے کہ وہ غائب ہو گیا۔ بہت سے فوجی شہدا کی لاش نہیں ملی۔ وہ بھی انہی میں ہے۔ جی ایچ کیو سے سرٹیفکیٹ بھی مل گیا ہے۔ شہید کا بیوی اور ماں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ یہ خبر جب ماں کو ملی تو وہ بستر سے لگ گئی۔ بیٹے کے غم میں روتے روتے دنیا سے چلی گئی۔“

میرا دل غم سے بھر اٹھا کہ میری بھی تو ایک ماں ہے جو میرے انتظار میں آنکھیں فرشِ راہ کیے بیٹھی ہو گی۔ میرے لیے کتنا تڑپتی ہو گی۔ اب مجھے یہاں بیٹھنا بھی دشوار لگنے لگا تھا۔ جی کر رہا تھا کہ پنکھ لگ جائیں اور میں اُڑ کر نگر پہنچ جاؤں۔ مگر ابھی پیالی میں قہوہ باقی تھا۔ وہ بولے جا رہا تھا۔ ”انسان کے اندر شیطان کا بسیرا ہے۔ شیطان سب سے پہلے عورت کو بہکاتا ہے۔ یا پھر عورت کے لیے بہکاتا ہے۔ شہید کی خبر آتے ہی کئی لوگوں نے اس کو ترکے کا مال سمجھ لیا اور غلط راہ کی طرف دھکیلنے کی کوشش کرنے لگے۔“

اس بات نے میرے اندر غصے کی چنگاری پھونکی اور میں نے پوچھا۔ ”اس لڑکی کی شادی نگر کے کس گھرانے میں ہوئی تھی؟“

”آپ نگر کے ہیں تو حسن شاہ کو جانتے ہوں گے۔“ اس نے کہا تو میرا دل دھڑک اٹھا۔ میں نے جلدی سے کہا:

”جی ہاں ان کے گھرانے کو کون نہیں جانتا۔ الحاق پاکستان میں ان کا نام بھی آتا ہے۔“

''حسن شاہ کا ایک ہی تو بیٹا تھا منتظر علی شاہ۔ اسی سے اس کی شادی ہوئی تھی۔''

اس کا جواب سن کر میری آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ میں نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

''اس لڑکی کا نام صالحہ تو نہیں ہے؟''

''جی ہاں! یقیناً آپ اسے دیکھ چکے ہوں گے۔ اللہ نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ ایسی حسین لڑکی رُل جائے یہ میں کیسے برداشت کرتا، پھر وہ میری محبت بھی تھی اور شہید کی بیوہ ہونے کا اعزاز بھی اسے حاصل ہے اور شہید کی بیوہ سے شادی کرنا کارِ ثواب بھی ہے۔ اس لیے میں نے پیغام بھیج دیا جسے لڑکی کی ساس نے ہوا کا رخ دیکھ کر قبول کر لیا، جیسے وہ اسی انتظار میں تھی۔ ادھر شادی ہوئی ادھر اس نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔''

وہ نوجوان اور پتا نہیں کیا کیا کہتا رہا مگر مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں کسی پتھر کی مورت کی طرح ایستادہ بیٹھا تھا۔ بڑی مشکل سے صرف اتنا کہا۔ ''صالحہ تم سے شادی کر کے خوش تو ہے؟''

''ابتدا میں نہیں تھی مگر وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے۔ پہلے اپنے شوہر کو یاد کر کے ہمہ وقت روتی تھی مگر اب بہت خوش ہے کیونکہ میں نے اسے دنیا کی ہر خوشی دینے کا عہد جو کر رکھا ہے۔ اب تو وہ پہلے شوہر کو یاد بھی نہیں کرتی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کچھ ہی دنوں میں وہ میرے بچے کی ماں بھی بن جائے گی۔ صرف چار ماہ باقی ہے۔''

میں خود کو موت کے کنویں میں گردش کرتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی بائیک پر ہوں جو خوب شور مچاتی ہوئی گھوم رہی ہے۔ میرا سر بھی چکرانے لگا تھا۔ میں نے ٹوٹے لہجے میں ''آہ!'' کہا۔

اس نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ کوئی تکلیف؟''

میں نے جواب دیا۔ ''ایک بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔''

''کیا؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میں کل کراچی سے پنڈی پہنچا تھا۔ رات گزارنے کے لیے ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ آتے وقت جلد بازی میں اپنا ایک بیگ وہیں بھول گیا۔''

''اس بیگ میں کوئی قیمتی چیز بھی تھی؟''

''جی ہاں زندگی بھر کی کمائی اسی میں تھی۔ تقریباً ڈھائی لاکھ روپے ہیں اس میں۔''

''تب تو دیر نہ کریں۔ ابھی یہ آخری بس واپس جائے گی آپ اس سے چلے جائیں۔ اللہ نے چاہا تو ہوٹل والے بیگ ضرور دے دیں گے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔''

''آپ اپنے گھر والوں کا پتا بتا دیں میں انہیں خبر دے دوں گا۔''

''نہیں، وہ لوگ پریشان ہو جائیں گے۔ یوں بھی میں کل تو آ ہی جاؤں گا۔'' کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔ اب وہاں رکنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ بیوی کسی اور کی ہو گئی تھی۔ اپنی الگ دنیا بسا کر خوش ہے تو میں اس کی دنیا کیوں اجاڑوں۔ پھر اسے ایک بہت بڑا اعزاز بھی تو ملا ہوا ہے کہ وہ ایک شہید کی بیوہ ہے۔ میں اس سے یہ اعزاز کیوں چھینوں۔ اسی خیال سے میں اسی بس سے لوٹ آیا۔

☆======☆======☆

مجھے تیسرے ہی دن لوٹ آیا دیکھ سب حیران رہ گئے۔ ریکھا نے تو خوشی کا اظہار کیا مگر رشیدہ اور اقبال پریشان ہو گئے۔

''سر کوئی خاص بات؟ اتنی جلدی تو واپسی کی بات نہیں تھی۔'' اقبال نے کہا۔

''بس گھر جانے کا دل نہیں کیا اور یہ سوچ کر آ گیا کہ پہلے یہاں اپنے قدم جما لوں تب گھر والوں کو اطلاع دوں۔'' میں نے دروغ گوئی کا سہارا لیا۔ دراصل میں حقیقت بتا کر ان لوگوں کو بھی دکھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''یہاں آ تو گئے ہیں مگر کریں گے کیا۔ کوئی بہت اچھی نوکری ملنے سے رہی۔'' اقبال نے دل کی بات کہہ دی۔

''ہم حضور پاک کی سنت ادا کریں گے۔ تجارت کریں گے۔''

''مگر تجارت کے لیے رقم کہاں سے آئے گی؟''

''اللہ مسبب الاسباب ہے۔ وہ کوئی راستہ ضرور پیدا کر دے گا۔ مگر اس سے پہلے تم یہ تو پتا کرو کہ اسیرانِ جنگ جو لوٹے ہیں ان میں تمہاری بیوی بچے ہیں یا نہیں۔''

''مجھے اکیلے جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔ اتنے دنوں بعد جب میں اپنی بیوی کو دیکھوں گا تو مجھ سے صبر نہیں ہو سکے گا۔ پھر ملٹری والوں کو بھی تو مطمئن کرانا ہے۔ آپ ساتھ چلیں تا کہ وہاں ملٹری والوں کو تسلی کرائی جا سکے۔''

"چلو!" میں اپنا غم بھول کر اس کے ساتھ ہولیا۔ میرے علم میں یہ بات آج ہی آئی تھی کہ مشہور شاعر رئیس امروہوی نے مشرقی پاکستان سے آنے والوں کے لیے ایک کمیٹی بنا رکھی ہے جو وہاں سے آنے والوں کی بھرپور مدد کر رہی ہے۔ یہ بات مجھے ٹرین میں ایک صاحب نے بتائی تھی۔ انہوں نے پتا بھی بتا دیا تھا۔ میں اسی پتے پر جا پہنچا۔ وہاں بیٹھے صاحب نے سب کچھ سن کر کہا۔ "بھائی میاں آپ ملٹری آفس جا کر پتا کریں۔ یہاں تو ہم ان لوگوں کے لیے بیٹھے ہیں جو سویلین ہیں۔"

وہاں سے ہم کنٹونمنٹ پہنچے۔ انکوائری آفس سے پتا کیا تو معلوم ہوا کہ کرنل اشرف آ چکے ہیں۔ میں ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اقبال کو ان سے ملنے کے لیے بھیج دیا اور خود ایک طرف ایک گھنے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ کافی دیر ہوگئی اور وہ نہیں لوٹا تو مجھے فکر ہونے لگی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ آتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ساتھ دو چھوٹے بچے بھی تھے۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔

"کیا ہوا۔ تمہاری بیوی؟" میں نے سوال کیا۔

"اللہ کی امانت تھی اس نے لے لی" اس نے غم میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون...... مگر کیسے؟ اسے کیا ہوا تھا؟"

"ان ظالموں نے، انڈین فوجوں نے بین الاقوامی قوانین کا بھی احترام نہیں کیا۔ میری بیوی کا علاج نہیں کیا اور وہ معمولی بخار میں اللہ کے پاس چلی گئی۔ آہ بھارتی درندوں نے مجھے ایک اور داغ دے دیا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں نے اسے رونے دیا کہ اندر کا غم باہر آ جائے۔ بس آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ کو تھپکتا رہا۔

جب اس کی آنکھوں سے آنسو سوکھ گئے تو میں نے اس کے لیے ٹیکسی لی اور واپس گھر آ گیا۔ اس کے ساتھ بچے دیکھ کر اور بیوی کو ساتھ نہ دیکھ رشیدہ نے سمجھ لیا کہ کوئی حادثہ ہوا ہے۔ وہ پانی کی بوتل اٹھائے آ گئی مگر ریکھا بضد رہی کہ اسے بتایا جائے کہ ہوا کیا ہے۔ تب میں نے مختصر الفاظ میں اس پر گزری سنا دی۔ اس کی کہانی سن کر ریکھا نے آگے بڑھ کر ان بچوں کو سینے سے لگا لیا اور خود بھی رونے لگی۔

اسے روتے دیکھ میں حیران رہ گیا کہ ہر وقت ہنسنے ہنسانے والی آج رونے کیوں لگی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا ہوا تم کیوں رونے لگی؟"

"مجھے اپنی دیدی اور اس کے بچے یاد آ گئے۔ سنڈیکیٹ والوں نے جنہیں مار دیا۔ اگر وہ زندہ رہتے اور دیدی نہ رہتی تو میں ان بچوں کی پرورش کرتی۔ ان بچوں کی بھی دیکھ بھال میں کروں گی۔" اس نے دونوں بچوں کو سینے سے لگا لیا تھا۔

"چلو بھائی ایک کام تو ریکھا نے اچھا کیا۔" میں نے ماحول کو ہلکا کرنے کے لیے شوخ انداز میں کہا۔

"سنیں میرا نام ریکھا نہیں ہے۔ ریکھا ہندوستان کی تھی وہیں رہ گئی۔ میں رحمتی ہوں، مجھے اسی نام سے مخاطب کیا کریں۔" ریکھا نے غصیلے لہجے میں کہا اور بچوں کو لے کر کمرے میں چلی گئی۔

اب کیا کیا جائے۔ میں یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ اقبال کا ذہن بٹانے کے لیے اسے بھی میں نے گفتگو میں شریک کر لیا تھا۔

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ہاشو آ گیا۔ اس نے کہا۔ "بھائی کا فون آیا تھا۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ شام میں تیار رہیے گا۔ میں آپ کو لینے آؤں گا۔ موسیٰ لین میں میرا ایک خاص بندہ ہے اس کے گھر فون بھی ہے وہیں بھائی کا فون آئے گا۔"

"کتنے بجے؟"

"شام چار بجے۔"

"گھڑی پر نظر ڈالو ساڑھے تین تو ہو گئے ہیں۔ اس لیے چل دینا ہی بہتر ہے۔" میں نے اقبال کو ساتھ لیا اور ہاشو کے ساتھ موسیٰ لین پہنچ گیا۔ وہیں بمبئی سے بھائی کا فون آیا۔ اس نے کہا۔ "شیر جوان میں تمہارے بارے میں بہت فکر مند تھا۔ کہیں راستے میں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوئی ہو۔"

"نہیں جناب! آپ کے آدمی نے بہت خیال رکھا تھا۔ بڑے آرام سے پہنچا دیا۔"

"یہی بات میں نے گلفام کو بتایا مگر وہ اپنی رٹ پر قائم ہے کہ آپ خود بھی اس سے پوچھ لیں۔ میں نے اسے کہا بھی کہ اگر میرا بندہ خیال نہیں رکھے گا تو جانتا ہے گولی اس کی پیشانی میں روشندان بنا دے گی۔" پھر اس نے قہقہہ لگایا۔

"نہیں بھائی یہاں پہنچنے تک محسوس ہی نہیں ہوا کہ میں اتنے بڑے خطرے سے نکل آیا ہوں۔"

''وہاں اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

''ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے۔''

''میری طرف سے ایک آفر ہے۔ دبئی میں میرا کاروبار ہے۔ بالکل قانونی اور بہت کم لوگوں کو پتا ہے کہ میں اس کا مالک ہوں۔ اگر چاہو تو دبئی جا کر اسے سنبھال لو کیونکہ مجھے ایک بہت ایماندار اور بہادر آدمی کی ضرورت ہے جو اس راز کو راز رکھ سکے اور میرے بچوں کو جو لندن میں رہتے ہیں ان کو ہر ماہ پیسے بھیجتا رہے۔''

''آپ وہاں سے نہیں بھیجتے ہیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں کیونکہ میں ان کی پرورش حرام کے پیسوں سے نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تو اتفاقی طور پر میں اس لائن میں آ گیا اور بیوی کے مرنے کے بعد انہیں وہاں بھیج دیا۔ انہیں بھی نہیں معلوم کہ میں کیا کرتا ہوں۔''

''یہ تو میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔'' میں نے بغیر توقف کیے جواب دے دیا کیونکہ اب پاکستان میں رہنا بے کار تھا۔

میرا جواب سنتے ہی بھائی نے کہا۔ ''ہاشو سب انتظام کر دے گا۔ آپ تیاری کر لو۔''

میرا جواب اقبال نے بھی سن لیا تھا اس نے بھی کہہ دیا کہ وہ بھی دبئی چلے گا۔

☆======☆======☆

ہاشو نے ایک ہفتے میں ہمارا، ریکھا کا، رشیدہ اور اقبال کا، اس کے بچوں کا پاسپورٹ تیار کرالیا۔ اب دبئی میں برابر برابر فلیٹ میں اقبال اور میں رہتا ہوں۔ مزیدار بات یہ ہے کہ ریکھا جو میری دیوانی تھی، وہ مجھ سے پردہ کرنے لگی ہے۔ صوم وصلوٰۃ کی پکی بن چکی ہے اور اقبال کی منکوحہ ہے جبکہ رشیدہ میرے عقد میں آ گئی ہے۔ ہم سب بہت خوش ہیں لیکن جب کبھی وہ ایامِ مصیبت یاد آتے ہیں تو دل کانپ جاتا ہے۔

☆======ختم شد======☆